







شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ





نگارشات

مرتب

حافظ شاہد رفیق

فاضل مدینہ یونیورسٹی



نگارشات جلد ہفتم

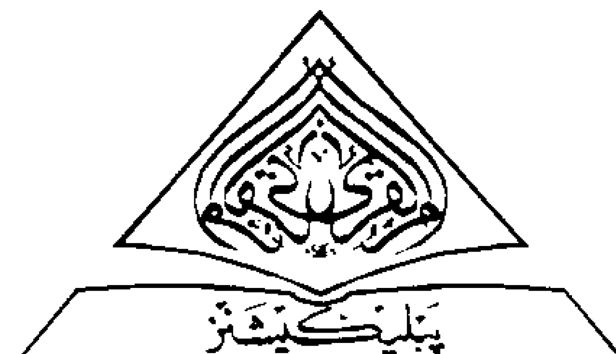
خطبات

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ

مرتب: حافظ شاہد رفیق
فاضل مدینہ یونیورسٹی

اشاعت ———— جنوری 2024ء

ناشر



جامع مسجد سلمان فارسی، لودھی ٹاؤن۔ سیالکوٹ روڈ، گوجرانوالہ 0321-6466422

فہرست مضامین

خطبات سورۃ بني إسرائيل

خطبات سورۃ الأنبياء

خطبات سورۃ الحج

خطبات سورۃ المؤمنون

خطبات سورۃ النور

خطبات سورۃ الفرقان

خطبات سورۃ لقمان

خطبہ سورۃ حمٓ السجدۃ

خطبہ سورۃ الفتح

خطبات سورۃ الصف

خطبات سورۃ الجمعۃ



بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ (وفات: 20 فروری 1968ء) کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ آپ بیک وقت ایک مفسر، محدث، فقیہ، مورخ، ادیب اور محقق عالمِ دین تھے، اور ان اوصاف کے ساتھ اور زہد وللّٰہیت کے بھی بلند رتبے پر فائز تھے۔ اپنی اَن تھک محنت اور خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر انھوں نے تعلیمی، تدریسی، تصنیفی، تبلیغی، سیاسی اور دعوتی میدانوں میں ایسے کارنامہ ہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں جو دوسروں کے لیے سبق آموز اور مشعلِ راہ ہیں۔

مولانا سلفی مرحوم کی پیدایش 1895ء میں تحصیل وزیر آباد کے ایک گاؤں ''ڈھونیکے'' میں ہوئی۔ آپ کے والد مولانا محمد ابراہیم صاحب حضرت حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی (وفات: 1334ھ) کے شاگرد اور ایک عمدہ کاتب تھے۔ مولانا وحید الزماں (وفات: 1338ھ) کی تفسیر اور مولانا محمد عبدالرحمان محدث مبارکپوری (وفات: 1353ھ) کی عظیم کتاب ''تحفة الأحوذي شرح سنن الترمذي'' آپ ہی کی خوش نویسی کا شاہکار ہیں۔

آپ نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے والدِ مکرم سے حاصل کرنے کے بعد تحصیلِ علم کے لیے حضرت حافظ صاحب وزیر آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے حدیث وتفسیر اور فقہ وغیرہ علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کے لیے دہلی، امرتسر اور سیالکوٹ کا رخ کیا، جہاں اپنے دور کے نامور اہلِ علم سے استفادہ کیا، جن میں مولانا عبدالغفور غزنوی (وفات: 1935ء)، مولانا عبدالجبار عمر پوری (وفات: 1334ھ)، استاذ الاساتذہ حافظ عبداللہ غازی پوری (وفات: 1337ھ) اور مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی (1956ء) نمایاں ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے استاد مولانا میر سیالکوٹی اور شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری کے حسبِ ارشاد گوجرانوالہ میں فروکش ہوئے۔ یہ 1921ء کے وسط کی بات ہے۔ اس وقت گوجرانوالہ

میں میاں نذیر حسین محدث دہلوی (وفات: 1320ء) کے شاگرد مولانا علاء الدین مرحوم (وفات: 1922ء) کی دعوتی اور تبلیغی مساعی جاری تھیں، اور گوجرانوالہ کی مرکزی مسجد اہلِ حدیث نیائیں چوک کی امامت وخطابت کی ذمے داری انہی کے سپرد تھی۔ ابتدا میں مولانا سلفی مرحوم گوجرانوالہ کے محلّہ حاجی پورہ کی مسجد اہلِ حدیث (پہلوانوں والی مسجد) میں اقامت گزیں ہوئے اور وہیں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ گوجرانوالہ آمد کے تقریباً چھے ماہ بعد جب مولانا علاء الدین صاحب وفات پا گئے تو 1922 میں مسجد اہلِ حدیث چوک نیائیں کی امامت و خطابت آپ کے سپرد ہوئی اور تادمِ واپسیں فروری 1968 تک اسی جگہ مصروفِ کار رہے۔

مولانا سلفی مرحوم نے گوجرانوالہ میں اپنے نصف صدی قیام کے دوران میں دعوتِ دین کے سلسلے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں، جن میں مقامی سطح سے لے کر ملکی و قومی سطح کی ذمے داریاں اور دینی و سیاسی سرگرمیاں شامل ہیں۔ مولانا مرحوم نے ایک طرف تو گوجرانوالہ میں دعوتی ضروریات کے لیے درس و تدریس، دعوت وتبلیغ اور مساجد و مدارس کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا اور دوسری طرف (تقسیم سے قبل اور بعد میں) ہر طرح کی ملی وملکی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور ان میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ پھر جب اپنے رفقا کے ساتھ مل کر جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی بنیاد (جولائی 1948ء) رکھی تو اس کے پلیٹ فارم سے ملک میں مسلکِ سلف کے احیا اور نفاذِ اسلام کی خاطر بے انتہا محنت کی، جس کی وجہ سے کئی مرتبہ اسارت اور نظر بندی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

''تاریخِ اہلِ حدیث شہر گوجرانوالہ'' کے مصنف اور مولانا سلفی کے دیرینہ ساتھی بابا عبداللہ اہلِ حدیث آپ کی ہمہ جہتی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

گوجرانوالہ شہر کے اندر آج جتنی بھی اہلِ حدیث جماعت کی ترقی آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں، اس کے تمام تر روحِ رواں صرف اور صرف حضرت الامیر (سلفی) رحمہ اللہ کا وجودِ مسعود تھا۔ خدا تعالیٰ ان پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل کرے۔

اصل بات یہ تھی کہ خداوند عالم نے مولانا موصوف کو بہت سی خوبیوں اور صلاحیتوں سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ آپ کی تقریر موثر اور دلنشین ہوتی۔ آپ کی تحریر نہایت شستہ اور نہایت لطیف اندازِ مزاح

لیے ہوتی، اور اس کے باوجود نہایت عالمانہ اور محققانہ ہوتی۔ حلقۂ درس و تدریس میں ہوتے تو ایسے سلیقے سے علمی جواہر پارے سامعین اور طلبا کے سامنے بکھیرتے کہ وہ ذہنوں میں اس طرح اپنا مقام بناتے جیسے کسی نے نہایت عقل مندی سے گھر سجا رکھا ہو کہ ہر ایک چیز قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر رکھی ہو۔

آپ کی بے شمار خوبیوں میں سے چند ایک خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ مردم شناسی میں آپ کو ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ آپ اپنے واقف کار لوگوں میں ہر ایک صفت کا سراغ لگاتے اور جو آدمی جس کام کا اہل ہوتا، اس سے وہ کام لیتے۔ گفتگو کرنے کا ایک خاص انداز تھا۔ ایسی گفتگو فرماتے، جس سے لطف بھی حاصل ہوتا، محبت اور پیار کی خوش بو بھی اس میں رچی بسی ہوتی اور سامع کو قائل ہوتے ہی بنتی۔

معاملہ فہمی بھی آپ کی ایک خاص خوبی تھی، فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ جاتے۔ پھر اس کے نفع و نقصان کو سمجھ کر بالکل صحیح اور مخلصانہ و ہمدردانہ مشورہ دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ بلا مبالغہ روزانہ بیسیوں آدمی اپنے معاملات ان کے سامنے پیش کرتے۔ میں نے بارہا کئی ایک وکیلوں کو آپ سے مشورہ کرتے دیکھا ہے۔

سیاسی سوجھ بوجھ میں ان کو وہ دسترس حاصل تھی کہ آپ کئی ایک سیاسی جماعتوں کے عہدیدار رہے۔ جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان نے جتنی ترقی آپ کے دورِ نظامت و امارت میں کی، اس سے قبل کبھی نہ ہوئی تھی۔ حافظہ بلا کا تھا۔ مغربی پاکستان کے جس جس جماعتی آدمی سے ایک دفعہ گفتگو اور تعارف ہو گیا، دوبارہ اس سے پوچھنے کی ضرورت کبھی نہ پیش آئی کہ کہاں سے آئے ہو؟

کام کی لگن کا عجیب انداز تھا، جو کام سنبھال لیا، اس کو پوری جانفشانی سے کیا اور نباہ کر دکھایا۔ اس کے علاوہ جو ان کا اصلی جوہر تھا، وہ ان کی پاکبازی، پرہیز گاری، خدا ترسی اور عبادت گزاری تھا۔ غرض کیا کہوں! ان میں کتنی خوبیاں تھیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ع

لَيْسَ عَلَى اللّٰهِ بِمُسْتَنْكِرٍ　　أَنْ يَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِيْ وَاحِدٍ [1]

مزید لکھتے ہیں:

1921ء میں یہاں (گوجرانوالہ) تشریف لائے تو آتے ہی تبلیغِ دین کا بوجھ کندھوں پر اٹھا لیا اور اس کو احسن طریقے سے مختلف شعبوں میں تقسیم کیا۔ عوام کو متوجہ کرنے کے لیے اسلامی دار المطالعہ، خواتین میں علمی ذوق پیدا کرنے کے لیےمدرسہ البنات، احباب کے لیے خطبہ و درس، سنتِ نبوی کے

[1] ''تاریخ اہلِ حدیث گوجرانوالہ'' (صفحہ: 74,73)

خوشہ چینوں کے لیے درسِ نظامی اورعلومِ قرآن کے شیدائیوں کے لیے ایک مدرسہ حفظ وتجوید کا اجرا کیا۔

حکومت کو نیکی کی رغبت دلانے کے لیے خطبہ جمعہ میں ملکی حالات پر تبصرہ فرماتے۔ رفقاء کو ان کے مشن میں کامیاب بنانے کے لیے مرکز میں نظامتِ علیا وامارت کے عہدے پر سرفرازی، ان کے علاوہ تحریر وعمل اور خوش خلقی تو ایسی صفات تھیں کہ ہر شخص کو گرویدہ بنا دیتے تھے۔ اندازِ گفتگو اتنا دلکش، دلربا، پرمغز، پرلطف اور جامع تھا کہ مخالف سے مخالف بھی ان کی تقریر سے اٹھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

ایک دن ان کے والد مرحوم جامع مسجد اہلِ حدیث چوک نیائیں گوجرانوالہ میں لیٹے ہوئے تھے کہ بات چلتے چلتے مولانا مرحوم پر آ گئی، ان کے والد بزرگوار نے فرمایا: بچپن میں ایک دفعہ ان سے کسی کی کھیتی کا کچھ نقصان ہوا، اس نے آ کر شکوہ کیا۔ میں نے کہا: بیٹا ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اس دن سے انھوں نے اس طرف سے گزرنا ہی چھوڑ دیا اور پھر تا زندگی کسی نے مجھ سے ان کے متعلق شکایت نہیں کی۔ اللہ اکبر! چنانچہ گوجرانوالہ میں چھیالیس سالہ زندگی عوام کے سامنے ہے۔ کیا مجال جو امانت، دیانت، تقویٰ اور پرہیزگاری پر کوئی حرف آئے۔[1]

مولانا سلفی مرحوم کی گوناگوں خدمات اور شخصی اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے رفیقِ کار شیخ عبدالغفار اثر رقم طراز ہیں:

مولانا موصوف اپنی ہمہ گیر شخصیت کے لحاظ سے منفرد اور بے مثال تھے۔ آپ نے 75 برس عمر پائی اور قریباً نصف صدی تک قرآن و حدیث اور توحید وسنت کی ترویج و اشاعت میں ہر امکانی کوشش صرف فرما دی۔ 1921ء میں گوجرانوالہ تشریف لائے۔ کچھ عرصہ مسجد حاجی پورہ میں خطابت کے فرائض سرانجام دیے۔ جلد ہی مرکزی مقام چوک نیائیں میں مسجد مولانا علاء الدین میں منبر ومحراب کی زینت بن گئے اور تادمِ زیست ان فرائض کو ایسی عمدگی سے نبھایا کہ دوست دشمن عش عش کرتے رہے۔ ان کی وجہ سے توحید وسنت اور مسلکِ اہلِ حدیث کو فروغ حاصل ہوا۔ اس عرصے میں پچاس سے زائد موحدین کی نئی مساجد کی تعمیر عمل میں آئی اور تقریباً ہر مسجد کی بنا اور تاسیس میں ان کی مساعی شامل رہیں۔

[1] ''تاریخ اہلِ حدیث گوجرانوالہ'' (صفحہ: 85-87)

مولانا کے مواعظ، درس و تدریس اور تبلیغ کا سلسلہ نہایت وسیع تھا۔ صبح کا درسِ قرآن نہایت فاضلانہ، عالمانہ، دلنشین، موثر اور جامع ہوتا تھا۔ شہر کے ہر حصے سے سامعین جوق در جوق تشریف لاتے تھے۔ صبح کے درس کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ عہدِ حاضر کا ابن تیمیہ قرآن و حدیث کے موتی لٹا رہا ہے اور اہلِ طلب، علم و حکمت کی جھولیاں بھر بھر کر لے جا رہے ہیں۔ کئی سال سے یہ سلسلہ جاری تھا اور کئی بار قرآن پاک ختم کیا۔ آپ کے حلقۂ درس سے فارغ التحصیل کئی علما دُرِ نایاب اور گوہرِ ماہتاب بن کر نکلے اور اپنے چراغ سے کئی چراغ روشن کیے۔

مولانا علم و حکمت اور عقل و دانش کے بے مثل چراغ تھے۔ مشکل سے مشکل مسائل ایسے حل فرماتے کہ بالکل عام شخص بھی اپنی تشنگی بجھا سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ بعض اکابر علم و فضل میں آپ سے بڑھ کر ہوں، لیکن عقل و فراست اور تفقہ فی الدین کے امتزاج نے ان کو یگانۂ روزگار بنا دیا تھا۔ تقریر نہایت دلپذیر اور خطابت نہایت فصیح، بلند پایہ اور عام فہم ہونے کے علاوہ نہایت جامع اور پرمغز ہوتی تھی۔ مولانا کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، تمام مکاتبِ فکر کے علما سے ذاتی مراسم تھے۔ مولانا محمد چراغ صاحب، صوفی عبدالحمید صاحب سواتی، مولانا عبدالواحد صاحب، قاضی شمس الدین صاحب اور مولانا محمد بشیر صاحب، سب کے ساتھ برادرانہ تعلقات تھے۔

مولانا نے اپنے خطبات اور خطابت میں فروعی مسائل کو کبھی اس طرح بیان نہیں کیا کہ اختلاف کی آگ بھڑک اٹھے۔ آپ نے منبر و محراب میں کبھی فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیخت نہیں کیا۔ وہ اس کو افتراق و تشتت سے تشبیہ دیتے تھے۔ مخالفین کے ناروا حملوں کی صورت میں بھی مصالحانہ رویے کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔[1]

خطابت:

مولانا سلفی رحمہ اللہ کی خدمات بہت متنوع اور مختلف جہات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، جو ایک مستقل تصنیف کی متقاضی ہیں۔ سرِدست ہم زیرِ نظر کتاب کی مناسبت سے ان کی شخصیت کے ایک پہلو درس و خطابت اور اس کے نتائج و اثرات کے حوالے سے چند باتوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ان کی

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (8 مارچ 1968ء)

زندگی کا یہ پہلو بھی نمایاں ہو سکے اور معلوم ہو کہ اس میدان میں ان کی کارگزاریوں نے مقامی وملکی سطح پر کیا اثرات چھوڑے ہیں۔

مولانا سلفی رحمہ اللہ میدانِ خطابت کے شہسوار اور ایک منفرد اسلوب کے مالک تھے۔ آپ کی تقریر حشو و زوائد سے پاک اور وضعی حکایتوں سے مبرا ہوتی تھی۔ دورانِ خطاب الفاظ کا انتخاب اور عربی، فارسی اردو اشعار کی ایسی آمد ہوتی کہ عوام وخواص جھوم جھوم جاتے تھے۔ خطبہ جمعہ نصف گھنٹا اور عام تقریر زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے پر مشتمل ہوتی، جس میں اپنے موضوع کے ہر پہلو پر ایسے بصیرت افروز انداز میں روشنی ڈالتے کہ سامعین بات کو بہ آسانی سمجھ جاتے۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی 1935ء میں اپنے آبائی علاقے میں ہونے والے ایک جلسے میں مولانا کی تقریر پر لوگوں کے تاثرات نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''تقریر ختم ہوئی تو لوگوں کا تاثر یہ تھا کہ سلسلۂ تقریر ابھی جاری رہنا چاہیے تھا۔ اس قسم کی زور دار اور موثر تقریر اور کوئی نہیں ہو گی۔ یہ اپنی نوعیت کی واحد تقریر تھی۔ اللہ نے اس شخص کو علم بھی دیا ہے اور بات کہنے کا سلیقہ بھی عطا فرمایا ہے۔''[1]

❀ مولانا سلفی کے طرزِ بیان کی اثر انگیزی کے سلسلے میں ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمائیے، مولانا محمد اسحاق بھٹی رقم طراز ہیں:

مولانا کے اسلوبِ تقریر اور طرزِ بیان سے تاثر پذیری کے بارے میں جناب اسماعیل ضیا (وفات: 1997ء) کی ایک روایت ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ سن وسال کا تو انھیں علم نہیں، البتہ یہ معلوم ہے کہ خود ان کی اس وقت عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ خدا جانے کس مردِ حق کی طرف سے اشارہ ہوا اور پھر کس کس کی کوششوں سے بیل منڈھے چڑھی کہ گوجرانوالہ کے اہلِ سنت یعنی اہلِ حدیث، دیوبندی اور بریلوی حضرات اس بات پر متفق ہو گئے کہ شہر میں نمازِ جمعہ ایک ہی جگہ پڑھی جائے اور ہر مسلک کا خطیب باری باری جمعہ پڑھائے۔

بریلوی مکتبِ فکر کے خطیب مولانا بشیر حسین اور مولانا صابر حسین تھے۔ اہلِ حدیث جماعت

[1] ''نقوشِ عظمتِ رفتہ'' (صفحہ: 155)

میں مولانا محمد اسماعیل اور مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی علمی اعتبار سے بڑی شہرت کے مالک تھے۔ دیوبندی حضرات کی دو مسجدیں تھیں، ایک شیرانوالہ باغ کے قریب جہاں مولانا عبدالواحد خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے اور دوسری قبرستان کے قریب مسجد آرائیاں تھی، جس کے خطیب مولانا محمد چراغ تھے۔

حافظ محمد صاحب اور مولانا محمد چراغ بے شک جید علمائے دین تھے، لیکن ان کا خطابتی رنگ اتنا تیکھا اور موثر نہ تھا، ان دونوں حضرات میں سے مولانا محمد چراغ نے اپنے خطبے کی باری مولانا عبدالواحد کو اور حضرت حافظ محمد صاحب نے مولانا محمد اسماعیل کو دے دی۔ البتہ دونوں بریلوی خطیب اپنی اپنی باری لینے پر مُصر رہے۔ اب چار خطیب تھے، ایک اہلِ حدیث، ایک دیوبندی اور دو بریلوی۔

شہر کے اہلِ سنت کا پہلا اجتماعی جمعہ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے پڑھایا اور ان کا خطبہ دیوبندی حضرات کے علاوہ بریلوی مسلک کے علما وعوام نے بھی سنا اور نماز بھی ان کی اقتدا میں پڑھی۔

مولانا نے تین یا چار اجتماعی خطبے دیے تھے کہ بریلوی حضرات نے حیلے بہانوں سے راہِ فرار اختیار کرنا شروع کر دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فطرتِ سلیم رکھنے والے دانش مند بریلوی عوام مولانا سلفی کے دلائل اور خطابت سے متاثر ہونے لگے تھے اور اپنے علما کی سطحیت ان پر آشکارا ہونے لگی تھی۔ جمعے کا یہ اجتماعی سلسلہ قائم تو نہ رہ سکا، البتہ اس کے اثرات دیر پا ثابت ہوئے اور نتائج نہایت اچھے نکلے۔ بعض دیوبندی حضرات نے تو مستقل طور پر نمازِ جمعہ مولانا کے پیچھے جامع مسجد اہلِ حدیث میں پڑھنا شروع کر دی اور اہلِ حدیث کے متعلق جو تھوڑی بہت شکایتیں کسی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں، ختم ہوگئیں۔ بریلوی گروہ کے بھی سلیم الطبع لوگ ذہن کو تعصب سے پاک کر کے منطق اور دلیل پر مبنی بات سننے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک عرصے سے دلوں میں جو بغض وتعصب پایا جاتا تھا، اگر اس کا بالکل خاتمہ نہیں ہوا تو اس میں کسی حد تک کمی ضرور واقع ہو گئی۔ یہ مولانا کی تقریروں اور متوازن و مدلل خطبوں کا نتیجہ تھا۔[1]

❁ مولانا سلفی مرحوم کے اندازِ تدریس اور خطابت میں مہارت کے معترف نہ صرف عوام، بلکہ اکابر علمائے کرام بھی اس کے قدردان تھے۔ اس سلسلے میں شیخ عبدالغفار اثر کا بیان کردہ ایک واقعہ ملاحظہ کریں کہ جب مولانا سلفی مرحوم 1953ء کی تحریکِ ختمِ نبوت کے دوران میں لاہور

---

[1] ''نقوشِ عظمتِ رفتہ'' (صفحہ: 168,167)

جیل میں قید ہوئے تو محترم اثر صاحب بھی وہیں محبوس تھے، فرماتے ہیں:

''تحریکِ ختمِ نبوت کی نظر بندی کے دوران میں لاہور سنٹرل جیل میں کئی ماہ تک ساتھ رہے، بلکہ ایک ہی کمرے میں نشست و برخاست کا موقع ملا۔ میں نے ان کو نہ صرف ایک عظیم انسان پایا، بلکہ چند در چند نایاب خصوصیات کا حامل دیکھا۔ پہلی چیز جو بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ نہ صرف عوام کے نزدیک ہی امامت کے لائق تھے، بلکہ خواص، بلکہ علما کے طائفہ میں بھی رشد و ہدایت کے سرتاج اور علم و حکمت کے بادشاہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ نظر بندی کے دوران میں جب کبھی خطباتِ جمعہ اور عیدین یا دوسرے مواقع اور اسلامی تقریبات میں قیادت کی ضرورت محسوس ہوتی تو بلا تاویل ان ہی کو منتخب کیا جاتا، حالانکہ ملک کے بڑے بڑے عالم و فاضل صاحبانِ منبر و محراب موجود ہوتے، جن میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا امین احسن اصلاحی، صاحبزادہ فیض الحسن اور مولانا ابو البرکات حسنات آف مسجد وزیر خان بھی سجنِ عام میں مولانا کے ساتھ محبوس ہوئے۔''[1]

نیز محترم پروفیسر حافظ محمد ارشد صاحب گوجرانوالہ بھی فرماتے ہیں کہ جب سفرِ حج پر میری ملاقات فیصل آباد کے مولانا مجاہد الحسینی سے ہوئی تو انھوں نے بھی بیان کیا کہ تحریکِ ختمِ نبوت کے زمانے میں ایامِ نظر بندی کے دوران میں جیل میں موجود تمام علما کا متفقہ فیصلہ تھا کہ درسِ قرآن صرف شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی ارشاد فرمائیں گے، حالانکہ اس جیل میں ہر مکتبِ فکر کے بڑے بڑے فاضل علمائے کرام موجود تھے۔[2]

- جناب ملک عبدالرشید عراقی بھی ایسا ہی ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ مولانا سلفی مرحوم کو تدریس کا خاص ملکہ حاصل تھا، مسئلے کی وضاحت بڑے دلنشین انداز میں فرماتے۔ ان کے تدریس کے انداز کا ایک واقعہ راقم کو مولانا محمد علی کاندھلوی مرحوم (سیالکوٹ) نے سنایا، فرماتے ہیں:

1953ء کی قادیانی تحریک میں گوجرانوالہ سنٹرل جیل میں نظر بند تھا۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا عبدالمجید سوہدروی، حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی اور کئی دوسرے علمائے کرام بھی ہمارے ساتھ

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (18 مارچ 1968ء)

[2] ''مخدوم العلماء مولانا محمد اسماعیل سلفی'' از سعدیہ ارشد (صفحہ: 48)

اسیرِ زنداں تھے۔ ایک دن میں نے مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم سے عرض کی کہ ہم یہاں سارا دن بیکار وقت گزارتے ہیں۔ آپ ہمیں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا درس دیا کریں۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے رضا مندی ظاہر کی۔ چنانچہ اسی دن آپ نے گھر سے ''حجۃ اللہ البالغہ'' منگوائی اور دوسرے دن اس کا درس دینا شروع کر دیا۔ میں نے دیوبند میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' مولانا شبیر احمد عثمانی سے پڑھی تھی۔ مولانا عثمانی مرحوم جس انداز سے حجۃ اللہ البالغہ پڑھاتے تھے، مجھے یقین تھا کہ اس طرز پر مولانا عثمانی کا مقابل کوئی عالم حجۃ اللہ البالغہ پڑھانے میں نہیں ہے، لیکن مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے حجۃ اللہ البالغہ کا درس شروع کیا تو میں حیران و ششدر رہ گیا کہ ان کا انداز ہی نرالا ہے اور مولانا عثمانی مرحوم سے آپ بازی لے گئے۔ ①

❀ خطبہ جمعہ سے تاثر پذیری کے سلسلے میں ایک اور واقعہ سنیے! مولانا فضل حق ہاشمی کے فرزند گرامی جناب احسان الحق ہاشمی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے والد بتاتے تھے:

میں جب بھی میانوالی سے لاہور جاتا تو گوجرانوالہ میں رک کر مولانا اسماعیل سلفی کی اقتدا میں جمعہ پڑھ کر لاہور کی طرف روانہ ہوتا۔ فرماتے ہیں کہ میرے پاس صرف جمعہ ادا کرنے کا وقت ہوتا تھا، اس لیے نماز کے فوراً بعد مولانا سلفی کو ملے بغیر لاہور نکل جایا کرتا۔ ایک دن مسجد میں داخل ہوا تو مولانا سلفی نے دورانِ خطبہ ہی کہا: ''فضل حق! نماز کے بعد مجھے مل کر جانا۔''

مولانا ہاشمی کہتے ہیں کہ جمعہ کے بعد مولانا سلفی کو ملنے بیٹھا تو پوچھنے لگے: ''تم اکثر نظر آتے ہو، لیکن ملے بغیر ہی نکل جاتے ہو؟'' میں نے کہا: جمعہ کے بعد ٹرین کی وجہ سے فوراً نکلنا پڑتا ہے، اس لیے رک نہیں پاتا اور ملاقات کے بغیر ہی چلا جاتا ہوں۔ مولانا سلفی پوچھنے لگے: ''اگر لاہور ہی جانا ہوتا ہے تو پھر گوجرانوالہ کیوں رکتے ہو؟'' مولانا ہاشمی کہنے لگے کہ آپ کے ساتھ جمعہ پڑھنے کی خاطر رک جاتا ہوں۔ پوچھا: ''یہاں جمعہ پڑھنے کا اس قدر اہتمام کیوں کرتے ہو؟'' کہنے لگے: آپ کے پاس ایک جمعہ پڑھ لیتا ہوں تو کئی ہفتے میری طبیعت پر اس کا اثر باقی رہتا ہے!

مولانا سلفی یہ سن کر فرمانے لگے: ''اگر تم لاہور جا کر مولانا داود غزنوی کے پیچھے جمعہ پڑھا کرو

① ''چالیس علمائے اہلِ حدیث'' (صفحہ: 332,331)

تو یہ اثر کئی مہینے باقی رہے گا۔'' مولانا ہاشمی کہتے ہیں کہ میں نے یہ سنا تو سوچنے لگا کہ آپ کسرِ نفسی کی بنا پر ایسا کہہ رہے ہیں، لیکن جب میں نے یہ تجربہ کیا تو واقعتاً مولانا غزنوی کی اقتدا میں پڑھے گئے جمعہ کا اثر کئی مہینے مجھ پر باقی رہا کرتا تھا۔

گوجرانوالہ میں درس و خطابت کی ابتداء:

''تاریخِ اہلِ حدیث گوجرانوالہ'' کے مولف بابا عبداللہ اہلِ حدیث لکھتے ہیں کہ گوجرانوالہ میں تحریکِ اہلِ حدیث کے ابتدائی دنوں میں ہم لوگ وقتاً فوقتاً تبلیغی جلسوں کا انعقاد کرتے، تاکہ عوام الناس ہماری دعوت کو سنیں اور مخالفت میں کمی آئے۔ ان جلسوں سے اہلِ حدیث کے اکابر علما مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا محمد جونا گڑھی اور مولانا محمد ابو القاسم سیف بنارسی کو خطاب کی دعوت دی جاتی۔

ایک دن یہ ہوا کہ دال بازار کی اہلِ حدیث مسجد کی دیوار پر کسی بندۂ خدا نے لکھ دیا: ''گوجرانوالہ کے اہلِ حدیث بدعتیوں کی طرح ہیں۔ بدعتی لوگ تو سال بعد ایک عرس مناتے ہیں اور یہ آئے دن کوئی نہ کوئی جلسہ منعقد کر دیتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ کوئی مدرس رکھیں، جو درس و تدریس وغیرہ کا کام کرے۔''

جماعت اہلِ حدیث نے اس بات پر غور کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اس کارِ خیر کے لیے ضرور کوشش کرنی چاہیے۔ اس دور میں اللہ کے فضل و کرم سے جماعت اچھی تعداد میں تھی۔ اسی دوران میں قاضی کوٹ والوں پر برطانوی حکومت نے ایک کیس ٹھونس دیا، جن میں قاضی عبیداللہ صاحب مرحوم، قاضی عبدالرؤف صاحب مرحوم جیسی ہستیاں شامل تھیں، اس مقدمے کا سبب صرف یہ تھا کہ ان لوگوں کا مجاہدین کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ اس مقدمے کے سلسلے میں حضرت مولانا ابو الوفاء صاحب مرحوم امرتسری اور حضرت مولانا میر سیالکوٹی گوجرانوالہ میں تشریف لائے۔ ان دنوں میر صاحب مرحوم نے سیالکوٹ شہر میں ایک عظیم الشان درس گاہ قائم کر رکھی تھی۔ اسی درس گاہ میں مولانا محمد اسماعیل سلفی جیسی عظیم تر ہستیاں زیرِ تعلیم تھیں۔

جس وقت مولانا میر مرحوم سیالکوٹی گوجرانوالہ میں تشریف فرما ہوئے تو حافظ محمد عمر صاحب

مرحوم نے مولانا موصوف کو کہا کہ ہمیں کسی اچھے مدرس کی ضرورت ہے جو درس و تدریس کے کام کو بڑے احسن طریقے سے انجام دے سکے۔ مولانا سیالکوٹی مرحوم یہ سن کر فرمانے لگے: ہم آپ لوگوں کو ایسی شخصیت سے نوازیں گے جو سُچا موتی ثابت ہوگی، اور وہ چیز ڈبیا میں بند کرنے کے قابل ہے۔

پھر مولانا مرحوم واپس سیالکوٹ تشریف لے گئے۔ جب دوسری تاریخ کے لیے تشریف فرما ہوئے تو مولانا موصوف سلفی صاحب کو ساتھ لیتے آئے۔ اس وقت مولانا کی عمر تقریباً بیس اکیس سال کی تھی۔ حافظ محمد عمر صاحب کہنے لگے کہ میں نے گزارش کی تھی کہ ہمیں کسی عالم شخص کی ضرورت ہے تو مولانا مرحوم نے اپنے پہلے الفاظ کو دہرایا۔

حافظ محمد عمر صاحب مرحوم کہنے لگے: مولانا ہم کشمیری قوم سے تعلق رکھنے والے ہیں، ہم جس کو بھی پکڑ لیں، اللہ کے فضل و کرم سے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ہم اچھی طرح مولانا کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔

پھر تیسری تاریخ کو مولانا میر مرحوم سیالکوٹی مولانا سلفی صاحب کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ یہ جمعے کا دن تھا۔ مولانا میر مرحوم نے جمعے کا خطبہ مسجد مولانا علاء الدین صاحب مرحوم واقع چوک نیائیں میں ارشاد فرمایا۔ خطبے کے اختتام پر فرمایا کہ آپ لوگوں سے اپیل ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر یہیں تشریف رکھیں، کیوں کہ مولوی محمد اسماعیل صاحب آپ کے سامنے تقریر کریں گے۔

مولانا سلفی نے ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب: ۲۱] کے موضوع پر بہترین انداز میں تقریر فرمائی۔ سامعین حضرات نے خوب داد دی اور کہنے لگے کہ عمر ابھی بالکل چھوٹی ہے، تاہم فہم بہت اچھا ہے۔

جمعے سے فارغ ہو کر ہم سب اپنے محلّہ حاجی پورہ میں چلے آئے اور مولانا مرحوم نے مولانا محمد اسماعیل کی تنخواہ صرف پچیس روپے ماہوار مقرر کی۔ مولانا موصوف کی دال بازار والی مسجد میں دستار بندی بھی کی گئی۔ ہم تمام لوگوں کا اٹھنا بیٹھنا مولانا محمد اسماعیل سلفی کے ساتھ تھا۔ سردار محمد مہر اور یہ راقم الحروف عبداللہ خصوصاً آپ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ آپ کے سپرد جو بھی کام کیا گیا، آپ اس کو بڑے احسن طریقے سے انجام دیتے رہے۔[1]

[1] ''تاریخ اہلِ حدیث گوجرانوالہ'' (صفحہ: 25-28)

درسِ قرآن:

حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی تحریک پر جب مولانا سلفی گوجرانوالہ تشریف لے آئے تو آپ نے بیک وقت کئی مشاغل شروع کر دیے۔ درس و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا، لیکن اس سے استفادہ صرف باقاعدہ طلبا کر سکتے تھے اور جس مقصد کی خاطر مولانا سلفی نے یہ منصبِ دعوت سنبھالا تھا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ عام لوگوں کی بھی دینی تربیت کی جائے، ان کے عقائد کی اصلاح کی جائے اور ان میں دینی روح بیدار کی جائے۔ چنانچہ مولانا سلفی نے اوائل ہی میں نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ابتدا میں چند لوگ ہی مستفید ہوتے تھے، مگر رفتہ رفتہ آپ کے اندازِ بیان کی دھوم دور دراز تک پھیل گئی اور قرب و جوار سے بھی لوگ نمازِ فجر جامع مسجد چوک نیائیں میں ادا کرنے لگے۔ فجر کی جماعت کی امامت مولانا خود فرماتے تھے اور اس لگن ولحن سے قرآن کی تلاوت کرتے کہ نمازی اشکبار ہو جاتے۔ نماز کے بعد آپ درسِ قرآن شروع کر دیتے۔

چند آیات کی تلاوت فرمانے کے بعد ترجمہ کرتے۔ سیاق و سباق کی تشریح فرماتے۔ آیات کی شانِ نزول بیان فرماتے۔ آپ کے درسِ قرآن کا انداز وہ تھا جو امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے تفسیر ابن کثیر میں اختیار فرمایا ہے، یعنی آپ آیات کی تشریح میں پہلے آیات پیش کرتے۔ پھر حدیثِ نبوی سے استدلال کرتے۔ اس کے بعد اقوالِ صحابہ و تابعین پیش کرتے۔ اگر ائمہ اربعہ میں کہیں اختلاف ہوتا تو وجہ بیان فرماتے۔ مگر مجال ہے کہ کسی کے متعلق کوئی ناروا فقرہ زبان سے نکل جائے۔ احتیاط سے کام لیتے اور دلائل سے صحیح موقف کی نشان دہی فرماتے۔

اگر دورانِ درس میں کوئی صاحبِ علم کوئی سوال دریافت کرتا تو علم کا دریا طغیانی پر آ جاتا۔ پھر آپ بیضاوی، تفسیر خازن، تفسیر ابن عباس، مدارک، تفسیر طبری، تفسیر کشاف اور رازی کی تفسیر کبیر سے حوالے دیتے۔ مولانا نے ان تفاسیر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوا تھا۔ تفسیر بالماثور کے ساتھ آپ کو فلسفہ اور علمِ کلام پر بھی عبور حاصل تھا اور عربی علم و ادب پر بھی آپ گہری بصیرت رکھتے تھے۔ اس وجہ سے مشکل سے مشکل سوال کو اس طرح حل فرماتے، جیسے اس میں کسی قسم کی کوئی گنجلک ہے ہی نہیں۔

عموماً درسِ قرآن نمازِ فجر کے بعد ہوتا، مگر ایسا بھی ہوا کہ کچھ عرصہ مولانا نے درسِ قرآن کا پروگرام مغرب کے بعد رکھا۔ درسِ قرآن کے شائق تاجر حضرات کاروبار سے فارغ ہوکر بروقت مسجد میں پہنچ جاتے اور اپنی روح کی بالیدگی کا سامان حاصل کرتے۔ زندگی میں تقریباً نصف صدی تک یہ سلسلۂ درسِ قرآن جاری رہا، کئی قرآن ختم ہوئے۔ مولانا کے درس میں باقاعدہ حاضری دینے والے خود اس قدر دین سے آگاہ ہو جاتے تھے کہ وہ بلا تکلف تبلیغِ دین کا فریضہ سرانجام دے سکتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد گوجرانوالہ کی کئی مساجد میں درسِ قرآن باقاعدگی سے ہوتا تھا، مثلاً: صوفی عبدالحمید صاحب سواتی، حضرت مولانا قاضی شمس الدین، حضرت مولانا محمد چراغ اور حضرت مولانا مفتی محمد خلیل؛ یہ سارے حضرات مختلف مساجد میں درسِ قرآن دیتے تھے۔ مگر جو نرالا رنگ مولانا سلفی کے درس میں تھا، وہ کہیں اور نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے اصحاب اپنے مکتبِ فکر کے عالم کا درس چھوڑ کر مولانا سلفی کا درس سنتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عالم ہم نوا ہو گیا۔[1]

خطبہ جمعہ:

مولانا سلفی کی آمد سے پہلے گوجرانوالہ شہر کی کئی مساجد میں جمعۃ المبارک کے اجتماعات ہوتے تھے، مگر مسلکِ اہلِ حدیث کا کوئی موزوں مرکز نہ تھا۔ الحمد للہ جب مولانا گوجرانوالہ تشریف لائے تو کچھ عرصہ کے لیے حاجی پورہ میں قیام فرمایا، پھر مسجد مولانا علاء الدین چوک نیائیں میں منتقل ہو گئے اور باقاعدہ جمعۃ المبارک کا خطبہ ارشاد فرمانا شروع کیا۔ پہلے پہل تو حاضری معمولی رہی، پھر دور دراز تک مولانا کے مواعظِ حسنہ کی خوش بو پھیل گئی۔

خطباتِ جمعہ میں نہ صرف شہر گوجرانوالہ کے لوگ شمولیت کرتے، بلکہ قرب و جوار کے مضافات کے لوگ جوق در جوق شامل ہونے لگے۔ مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی۔ مسجد کی بالائی منزل میں خواتین جمعے میں شرکت کرتیں اور زیریں منزل میں مرد حضرات، بالآخر مسجد کی توسیع کرنا پڑی۔

مولانا کے خطبہ جمعہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ مختصر اور جامع ہوتا، آدھ گھنٹے سے زیادہ خطاب نہ فرماتے۔ 20 منٹ کسی دینی موضوع کے لیے اور 10 منٹ سیاست اور حالات پر تبصرہ

[1] تاریخ اہلِ حدیث شہر گوجرانوالہ۔ مخدوم العلماء مولانا محمد اسماعیل سلفی از سعد یہ ارشد (صفحہ: 69,68)۔

کرنے کے لیے۔ مولانا نہایت دلیری کے ساتھ حکومت کی غلط پالیسیوں پر تنقید فرماتے۔ یہ تنقید برائے تنقید نہ ہوتی، بلکہ خیر خواہی سے معمور نصیحتیں ہوتیں۔ عام واعظین عموماً داستان گوئی اور لمبے لمبے قصے خطبہ جمعہ میں سنانے شروع کر دیتے ہیں، چونکہ ان حضرات کا مبلغ علم واجبی ہوتا ہے، اس لیے ان کے ہاں قصص ہی پر گزارہ ہوتا ہے، لیکن مولانا پر مغز مسائل بیان فرماتے اور دورانِ خطبہ کبھی ترنم نوائی نہیں فرمائی۔ [1]

❁ مولانا سلفی مرحوم کے خطبہ جمعہ کی بابت اپنے تاثرات و مشاہدات بیان کرتے ہوئے آپ کے شاگرد مولانا محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں:

''پورے پنجاب (بلکہ ہندوستان) میں میرا خیال ہے دو ہی خطیب تھے، جنھوں نے آغازِ قرآن سے آخر تک تسلسل کے ساتھ خطباتِ جمعہ میں قرآن مجید کی تفسیر وتشریح کا التزام کیا۔ وہ تھے گوجرانوالہ میں مولانا محمد اسماعیل صاحب اور لاہور کی مسجد مبارک میں ان کے شاگردِ رشید مولانا محمد حنیف ندوی۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے 1921ء میں یہ سلسلہ شروع کیا تھا، جو ان کی وفات (فروری 1968ء) تک جاری رہا۔ اس طرح سے انھوں نے غالباً جمعے میں دو قرآن مجید ختم کر کے تیسرے کے کچھ حصے کی تفسیر بھی بیان فرما دی تھی۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے 1930ء سے آغاز کر کے 1949ء کے وسط تک اٹھارہ انیس سال یہ بابرکت سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں (بقول میاں عبدالمجید صاحب کے) وہ ایک قرآن مجید ختم کر کے دوسرے کی آخری سورتوں تک پہنچ گئے تھے۔

یہ دونوں بزرگ صرف رمضان المبارک میں روزے سے متعلق آیات تلاوت کر کے روزے کے اہم مسائل بیان فرماتے یا روزے کے فلسفے اور حکمت سے بحث کرتے تھے، باقی گیارہ مہینے وہی سلسلہ جاری رہتا۔

کسی عالمِ دین یا ملک کی اہم شخصیت کے بارے میں مولانا اسماعیل صاحب کچھ ارشاد فرمانا لازمی خیال فرماتے تو اس کا اعلان خطبہ ثانی میں فرماتے تھے، مثلاً: 1941ء میں حضرت مولانا محمد صاحب دہلوی جوناگڑھی نے وفات پائی تو اس کا اعلان مولانا نے خطبہ ثانی میں فرمایا تھا اور مولانا جوناگڑھی کی خدمات کا تذکرہ کیا تھا، غالباً یہ مارچ کا مہینا تھا۔

[1] ''مخدوم العلماء مولانا محمد اسماعیل سلفی'' (صفحہ: 66,65)

میں 1940ء سے 1942ء کے آغاز تک حضرۃ الاستاد المحترم کی خدمت میں رہا۔ وہ پون بجے خطبہ شروع فرماتے تھے۔ میں بالالتزام پہلی صف میں بیٹھتا اور نہایت توجہ سے ان کے ارشادات سنتا اور ان سے مستفید ہوتا۔ وہ پنجابی میں تقریر کرتے تھے اور تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ یکساں ان سے استفادہ کرتے تھے۔[1]

خطبات کی جمع وتدوین:

مولانا سلفی رحمہ اللہ کے خطباتِ جمعہ کی ریکارڈنگ اور تحریر و اشاعت کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا، لیکن آخری سالوں میں گوجرانوالہ میں آپ کے بعض معتقدین اور خطبہ جمعہ کے سامعین نے اس طرف توجہ مبذول کی تو 1963ء سے خطبات کی تحریر اور اشاعت کا یہ عمل شروع ہوا۔ اس کارِ خیر میں جن افراد نے حصہ لیا، ان میں آپ کے تلمیذِ رشید حافظ خواجہ محمد قاسم رحمہ اللہ اور ان کے ساتھ جناب چوہدری عبدالواحد گوندل شامل ہیں۔ بعض خطبات قاضی عبداللہ بن قاضی عبدالرحیم صاحب نے بھی لکھے ہیں۔ ایک خطبہ جناب خواجہ محمد یوسف صاحب کا تحریر کردہ ہے۔

چوہدری عبدالواحد گوندل صاحب نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ہم لوگ خطبہ جمعہ لکھتے، جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں شائع ہوتا اور اسے مولانا سلفی صاحب مرحوم ملاحظہ فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح سے ان خطبات کو مولانا سلفی مرحوم کی مراجعت کے بعد ایک طرح سے درجۂ استناد حاصل ہے، جو ہمارے لیے باعثِ اطمینان ہے۔

ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں اشاعت کے ایک مدت بعد ان کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا خیال آیا تو انجمن اسلامیہ سلفیہ (مسجد مکرم) ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ کے اصحابِ انتظام کی طرف سے ان مضامین کی نقل نویسی اور مراجعت کی ذمے داری مولانا سلفی مرحوم کے شاگردِ رشید جناب حافظ عبدالسلام بھٹوی رحمہ اللہ کے سپرد کی گئی، جو اس وقت مسجد بلال اہلِ حدیث سیٹلائٹ ٹاؤن میں خطیب تھے۔ یوں اس کی پہلی اشاعت 1986ء میں عمل میں آئی، جس میں مولانا سلفی کے ستر خطبات شامل تھے۔ اسے نعمانی کتب خانہ لاہور نے شائع کیا اور صفحات کی تعداد 352 تھی۔

[1] ''نقوشِ عظمتِ رفتہ'' (صفحہ: 165-167)

اشاعتِ نو:

خطبات کے اس جدید اڈیشن کے چند نمایاں پہلو کچھ یوں ہیں:

- اس سلسلے میں ہم نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور کے متعلقہ تمام رسائل کو دیکھا اور اس میں شائع شدہ تمام خطبات کو مدِ نظر رکھ کر زیرِ نظر مجموعہ مکمل کیا ہے، جس میں بیس سے زائد نئے خطبات بھی شامل ہیں۔
- مولانا محمد اسحاق بھٹی مرحوم کے سہ روزہ اخبار ''منہاج'' میں مولانا سلفی مرحوم کے شائع شدہ خطبات بھی اس مجموعے کی زینت ہیں، جو پہلی اشاعت میں شامل نہیں تھے۔ اس کے لیے ہم نے سہ روزہ ''منہاج'' کی مکمل فائل دیکھی تو اس میں صرف دو عدد خطبات ہی مل سکے۔ علاوہ ازیں مولانا سلفی مرحوم کا ایک یادگار خطبہ جو لاہور کانفرنس کے موقع پر دیا گیا تھا اور ابھی تک آڈیو کیسٹ میں موجود تھا، وہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ اب اس مجموعے میں شامل خطبات کی تعداد 92 ہے۔
- چونکہ مولانا سلفی مرحوم خطبہ جمعہ میں قرآن مجید ہی کی ترتیب کے مطابق خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، اس لیے خطبات کی ترتیب بھی قرآنی سورتوں کے مطابق ہے۔ اس طباعت میں اضافہ شدہ خطبات کو بھی اسی ترتیب کے مطابق کتاب میں درج کیا گیا ہے۔
- ہم نے حتی الامکان بیشتر مقامات پر خطبات اور ان کی اشاعت کی تاریخ بھی درج کر دی ہے۔
- خطبات میں موجود آیات کی ترقیم اور احادیث و آثار کی تخریج کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔
- عربی، فارسی اشعار کے تراجم اور منقول عبارات کی تصحیح و تقابل کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ کئی مقامات پر ذیلی عناوین کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔
- چند مقامات پر شیخ محترم حافظ عبدالسلام بھٹوی رحمہ اللہ نے حواشی رقم کیے تھے، جنھیں ان کے نام سے درج کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس حقیر سی خدمت کو قبول فرمائے اور اس سلسلے میں ہمارے ساتھ جن حضرات نے کسی بھی طرح کا تعاون کیا ہے، انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، بالخصوص استادِ محترم حافظ عبداللہ سلیم صاحب اور عزیزم حافظ اعزاز الحق نعیم و حافظ ضیاء الحق نعیم کا میں تہہ دل سے

ممنون ہوں کہ اس مجموعے کی تصحیح اور حوالہ جات کی نشاندہی میں ان کا تعاون شاملِ حال رہا۔

اللہ تعالیٰ ان تمام احباب و اخوان کے علم و عمل میں برکت فرمائے اور ہم سب کے لیے اس عمل کو توشۂ آخرت بنائے۔ آمین یا رب العالمین

حافظ شاہد رفیق

۲/ دسمبر ۲۰۲۳ء



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تصدیر

مولانا محمد اسماعیل صاحب رحمہ اللہ 1339ھ مطابق 1921ء میں اپنے محترم استاد حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی کی معیت میں گوجرانوالہ تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ درس کی صورت میں مدت العمر میں ایک دفعہ قرآنِ مجید مکمل ہوا۔ خطباتِ جمعہ کی صورت میں ساری عمر میں انیس پارے مکمل ہو سکے۔

درس اور خطبے کا طرۂ امتیاز تسلسل تھا، جس کی وجہ سے باقاعدگی سے درس سننے والے اور جمعہ میں حاضر ہونے والے کی مسلسل ذہنی تربیت ہوتی تھی اور ہر ایک درس یا خطبہ آنے والے خطبے یا درس کی بنیاد بنتا تھا، جس کی وجہ سے قرآن مجید کے مطالب سامعین کے ذہن میں راسخ ہوتے جاتے تھے۔ ہمارے علمائے کرام اس طریقۂ کار کو اپنانے سے قاصر رہے ہیں، جس کی وجہ سے خطبات ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہوتے اور سامعین ذہنی پراگندگی کا شکار ہوتے ہیں، نتیجتاً مسلسل مسجد میں آنے والے اصحاب بھی قرآن مجید کے مطالب سے کما حقہ واقف نہیں ہوتے۔

والدِ گرامی رحمہ اللہ یہ جواہر ریزے بکھیرتے رہے۔ آپ کے ہم عصر لاشعوری طور پر سمجھتے رہے کہ اس معمارِ امت کی عمر کبھی ختم نہ ہو گی اور ہم ان سے ہر وقت استفادہ کرتے رہیں گے، لہٰذا ان کے خطبات کو صفحاتِ قرطاس میں مقید کرنے کی کسی کو سوچ تک نہ آئی۔

آخر کچھ اصحاب نے آپ کی عمر کے دھارے کو دیکھا اور مستقبل میں جھانکا تو اُن کو محسوس ہوا کہ ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴾ [ہر ایک جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والا ہے] کے اصول سے تو کوئی مفر نہیں، کیوں نہ ان جواہر ریزوں کو محفوظ کیا جائے، تا کہ یہ ہمہ وقت کام آسکیں۔ ان میں:

1 قاضی محمد عبداللہ صاحب بن قاضی عبدالرحیم صاحب مرحوم، سابق امیر جماعت اہلِ حدیث پنجاب۔

2 چودھری عبدالواحد گوندل صاحب، بازار کسیریاں گوجرانوالہ۔

3 خواجہ محمد قاسم صاحب، خطیب جامع مسجد اقصیٰ سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ۔

شامل ہیں۔ یہ اصحاب (زادھم اللہ لطفاً و کرماً) مولانا محمد اسماعیل صاحب کے خطبات اور درس نوٹ کر لیتے۔ ان نوٹس کو ایک مسلسل مضمون کی صورت میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں جو جمعیت اہلِ حدیث کا ترجمان تھا، چھپواتے۔ والدِ گرامی اس پرچے کے سرپرست بھی تھے اور اس کا باقاعدہ مطالعہ بھی کرتے تھے۔ یہ سارے مضامین ''الاعتصام'' میں چھپے ہیں۔ آپ نے ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اس طریق سے ان دروس اور خطبات کو والدِ گرامی کی طرف سے صحت کی سند حاصل ہے۔

''الاعتصام'' کی تمام فائلیں جناب استادِ محترم مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف (صدر جمعیت اہلِ حدیث لاہور) کی معاونت سے حاصل ہوئیں۔ جزاہ اللہ أحسن الجزاء.

مضامین نقل کرنے کا صبر آزما اور کٹھن کام جناب حافظ عبدالسلام بھٹوی، (خطیب جامع مسجد بلال سیٹلائٹ ٹاؤن) نے اپنے ذمے لیا اور خوب نبھایا۔ اس میں مشکل دور بھی آئے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے پائے عزیمت میں لغزش نہ آنے دی۔ فللّٰہ الحمد علی ذلك. نقل نویسی کے اخراجات کا بار انجمن اسلامیہ سلفیہ ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ نے اٹھایا۔ فجزاهم الله أحسن الجزاء.

اس وقت جو مواد اکٹھا ہوا ہے، ان میں ستر کے قریب خطبات ہیں، جن میں عبادات، معاملات، معاشرت، خوراک، طریقِ بحث، ایمانیات، قیامت، جہاد، ردِ شرک اور اس قسم کے ڈھیر سارے مضامین آ گئے ہیں۔ ان میں ان کا اپنا نرالا اور انوکھا انداز ہے۔ یہ انتہائی سنجیدہ، عالمانہ اور محققانہ ہے، مگر اسے اتنا ادق اور مشکل نہیں بنا دیا گیا کہ وہ عام سامعین کی ذہنی سطح سے بلند تر ہو جائے۔

مولانا مسعود عالم ندوی رحمہ اللہ کو کچھ عرصہ گوجرانوالہ میں قیام کا موقع ملا۔ وہ ہمیشہ جمعہ جامع اہلِ حدیث گوجرانوالہ میں پڑھتے تھے۔ مولانا موصوف سکّے بند اور معیاری اردو بولتے اور عربی کے متبحر عالم تھے۔ والدِ گرامی رحمہ اللہ پنجابی میں خطبہ دیتے تھے۔ مولانا مسعود عالم کا کہنا ہے کہ پنجابی اس طرز کی ہوتی تھی کہ عالم اور ناخواندہ دونوں اس سے استفادہ کرتے تھے۔ یہ ایک ایسا امتیاز تھا جسے صرف اللہ کی عنایتِ خاصہ ہی کہا جا سکتا ہے، وہ اپنی نوازشات سے جسے چاہے، نواز دے۔

جناب پروفیسر عبدالحمید صاحب صدیقی رحمہ اللہ علومِ دینی اور دنیوی دونوں سے بہرہ ور تھے۔

اللہ تعالیٰ نے قلم میں روانی عطا کی تھی۔ اردو اور انگریزی سب خوب لکھتے تھے۔ پروفیسر صاحب موصوف فرماتے ہیں: جب کبھی خطبے میں شامل ہوئے، کوئی نہ کوئی نیا نکتہ لے کر خطبے سے اٹھے۔ ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ [الحدید: ۲۱]

والدِ گرامی نے 1339ھ بمطابق 1921ء سے 1387ھ بمطابق 1968ء تک خطبہ اور درس کا کام جاری رکھا۔ یہ عرصہ تقریباً سینتالیس سال پر محیط ہے۔ اگر سارے خطبے اور درس تحریر کیے جاتے تو ایک عظیم الشان ذخیرہ ہوتا، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اب جو مل گیا ہے، وہی غنیمت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے استفادہ کرنے کی توفیق بخشے اور صدقہ جاریہ کی وجہ سے مرحوم کے درجات بلند کرے۔

آپ خطبات پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ بعض خطبوں میں لغوی اور اصطلاحی معانی کی عقدہ کشائی کی گئی ہے۔ بعض دفعہ ایک ہی آیت پر خطبہ متعدد جمعوں پر محیط ہے۔ پھر خطاب میں استدلال کے ذریعے کئی مسائل کا ذکر آ گیا ہے اور یہ مسائل غیر ضروری نہیں، بلکہ ایک آدمی کے ذہن میں اٹھتے ہیں اور اس طرح ایک عام آدمی جو محسوس کرتا ہے، اس کا جواب اس کے سوال کے بغیر ہی مہیا کر دیا جاتا ہے۔ یہی ایک حسین امتزاج تھا جو سامعین کو دور دور سے کھینچ کر ان کے خطبوں میں شمولیت کی دعوت دیتا اور مسجد کی وسعتیں اپنی تنگ دامانی کی شکایت کرتیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ خطبے میں کبھی اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی تھی، نہ اتنا طویل کہ لوگ تنگ آ جائیں اور نہ اتنا چھوٹا کہ پلے کچھ نہ پڑے۔ ایک متوازن خطبہ ہوتا تھا، جو تقریباً آدھ گھنٹے میں ختم ہو جاتا اور اس قدر پُرمغز ہوتا کہ ہر شخص ایک اطمینان لے کر مسجد سے رخصت ہوتا تھا۔

یہ خطبات ایک طالبِ علم کو اس بات کی طرف راغب کرتے ہیں کہ جب علم کو حصول کے بعد اپنایا جاتا ہے اور اس کے اندر جھانکا جاتا ہے تو اس سے کس قدر نکتہ آفرینی کے مواقع مہیا ہوتے ہیں اور اس سے کس طرح مستفید ہوا جاتا ہے، نیز دوسروں کو اس سے کس طرح بہرہ ور کیا جاتا ہے۔ طالبِ علم خوب سمجھنے لگتا ہے ع

علم را بر جان زنی یارے بود [1]

[1] یعنی علم کو اپنے اوپر نافذ کرو، یہ مفید ہوگا۔

خطیب حضرات اس سے استفادہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح جذبات کی رو میں بہے بغیر ادلہ اور براہین کی بنیاد پر انسان اپنا مدعا اپنے سامعین کو سمجھا سکتا ہے، نہ صرف سمجھا سکتا ہے، بلکہ لوگ اس کے ہم خیال بن کر اس کی مجلس سے نکلتے ہیں۔

یہ خطبات قرآن و حدیث کے چولی دامن کے ساتھ کی ایک زندہ مثال ہیں۔ ان کے پڑھنے سے لاشعوری طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ حدیث قرآن مجید کی تفسیر ہے اور ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ قرآن مجید کے معانی کی بھرپور وضاحت کے لیے حدیث کی اَشدّ ضرورت ہے۔ یہ خطبات قرآنِ مجید کی اس آیت کی تفسیر ہیں: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ [النحل: ٤٤]

اس طریقِ خطاب میں منکرینِ حدیث کے الزام کا ایک مسکت جواب ہے۔

پاکستان اسلامیانِ ہند کی کوششوں سے اسلام کے نفاذ کے لیے معرضِ وجود میں آیا۔ اس ملک میں برسرِ اقتدار طبقے نے ہمیشہ اسلام کا نام لیا، تاکہ لوگ اس سے متنفر نہ ہوں، مگر نفاذِ اسلام میں ہمیشہ منفی پہلو سامنے رکھا، اس طرح مسلمانوں کا ملک ہونے کے باوجود اسلامی تعلیمات ہمارے طالب علموں کی دسترس سے باہر رہیں۔ اگر ہم یہ خطبات اپنے گھر میں رکھیں، بچوں کو پڑھوائیں تو جدید حضرات کے منفی اثرات ان کے ذہنوں سے بہت حد تک دور ہوں گے اور وہ ایک باعمل مسلمان بننے کی ایک ہموار راہ اپنے سامنے پائیں گے، اس طرح ہم اپنی ذات کے ساتھ اپنے ملک کی اجتماعی خدمت بھی کر سکیں گے اور اس طریق سے پاکستان کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

علمیت کا دعویٰ ہے نہ غلطیوں سے مصون ہونے کا ادعا، ہر انسانی کام میں فروگذاشت کا موجود ہونا تقاضائے بشریت ہے۔ ہمیں ان فروگذاشتوں کو دور کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

ان خطابات کے فاضل خطیب فروری 1968ء میں اس دنیائے فانی سے تشریف لے جا چکے تھے۔ اس لیے ان کو معیاری بنانے کے لیے ان اصحاب کی آراء کی اشد ضرورت ہے جو ان کے

خطاب میں کثرت سے شامل ہوتے رہے ہیں اور ان کے ذوق کو سمجھتے ہیں۔

امید ہے سامعین حضرات کا یہ طبقہ ہمیں بھولے گا نہیں، بلکہ انشراحِ صدر کے ساتھ فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائے گا، تاکہ ان کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکے۔

محمد بن اسماعیل السلفی

62/G سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ

17 ذیقعدہ 1406ھ بمطابق 25 جولائی 1986ء



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روزہ، اس کا مقصد اور بعض اہم مسائل

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۳]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے زندگی عطا کی اور اس مہینے سے فائدہ اٹھانے کا پھر موقع دیا۔ پچھلے سال ان دنوں میں بعض دوست جو ہمارے ساتھ تھے، اب نہیں رہے۔ وقت گزر رہا ہے اور واقعات ہو رہے ہیں، اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ انبیائے کرام اور اہل اللہ پر بھی یہ وقت آیا اور ہم پر بھی آنے والا ہے۔ انسان اگر اپنی زندگی کے وقت کو خیر و برکت میں صرف کرے تو یہ زندگی بہتر ہے، ورنہ لمبی سے لمبی زندگی بھی بے کار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اس مہینے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا کرے۔

صوم کا معنی:

اس مہینے میں مختلف عبادتیں ہیں، جن میں سے ایک روزہ ہے۔ ''صوم'' اور ''صیام'' کا لفظی معنی رک جانا ہے۔ کسی طرح کی حرکت کا رک جانا ''صوم'' کہلاتا ہے۔

نصف النہار پر سورج پہنچ کر کچھ دیر کے لیے رکتا ہے تو اس کو ''اَلشَّمْسُ صَائِمٌ'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح چلتا گھوڑا رک جائے تو اس کو بھی ''صائم'' کہا جاتا ہے۔[1]

روزے کی حالت میں ایک مسلمان بعض کاموں سے رک جاتا ہے، اس مخصوص حالت میں

[1] مختار الصحاح (۱۸۰)

اپنے اوپر پابندی عائد کرتا ہے اور صبح سے شام تک کھانا نہیں کھاتا۔ کھانا موجود ہے اور کھا بھی سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود کھانے سے رک جاتا ہے۔ اپنی ایک خواہش پر ضبط کرتا ہے اور اپنے جسم و قویٰ کو قابو رکھتا ہے۔ یہی ضبط اور قابو روزے کی اصل روح ہے۔ روزہ ایک مشن ہے جس سے مسلمان کو اپنے اوپر ضبط اور کنٹرول رکھنے کی عادت پڑتی ہے۔ وہ ایک خاص مدت میں بعض امور سے روک دیا جاتا ہے، جس سے انسان کے اندر ضبط کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

روزے کو نقصان پہنچانے والے امور:

بعض لوگ صبح سے شام تک کھاتے تو کچھ نہیں، لیکن دن بھر جھوٹ، زبان درازی، فحش کلامی اور لغویات سے باز نہیں آتے۔ ایسے لوگ روزے کے مقصد کو ختم کر دیتے ہیں اور ان لوگوں کو بھوک اور پیاس برداشت کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

«مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ أَنْ يَّدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ»[1]

”جس شخص نے جھوٹی بات اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔“

انسان کو غصہ آنا قدرتی امر ہے، بلکہ باعزت زندگی گزارنے کے لیے غصہ ضروری ہے، لیکن غصے کی حالت میں اپنے آپ پر ضبط ہونا چاہیے اور اس حالت میں خوفِ خدا بھی ذہن میں ہونا چاہیے۔ روزہ رکھنے کے باوجود اگر کوئی غصے میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور ایسی حرکات کرتا ہے جو جائز نہیں تو اسے روزے کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔ طبیعت کا ایسے وقت میں بے قابو ہو جانا اس تربیت کی عین ضد ہے جو روزے سے حاصل ہونی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کے اختلاط کو انسانی نسل کی بقا کے لیے ذریعہ بنایا ہے اور نکاح کو اس کا جائز طریقہ قرار دے کر انسان کو اس طاقت کے غلط استعمال سے روک دیا ہے۔ روزے کے ذریعے مسلمان کو دن بھر بیوی سے تعلق قائم کرنے سے روک کر یہ سکھانا مقصود ہے کہ جس امر سے اللہ تعالیٰ روک دے، اس سے رک جانا اور جس کو کرنے کا حکم دے، اس کو کرنا اصل مقصد ہے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٠٣)

بے مقصد روزہ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے کے لیے نظر عطا کی ہے اور اس پر انسان کو اختیار دیا ہے کہ جیسے چاہے اسے استعمال کرسکتا ہے، اس کے ساتھ ہی نظر کے لیے آداب وقواعد بیان کر دیے ہیں کہ کس جگہ نظر پڑنی چاہیے اور کس جگہ نہیں پڑنی چاہیے۔ ایک آدمی روزے کی حالت میں نظر کو غیر محتاط رکھتا ہے، اگر چہ رسمی طور پر اس نے روزہ پورا کر لیا، لیکن مقصد فوت ہو گیا، کیوں کہ ایسے ہی روزے داروں کے لیے کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کو روزے سے بھوک کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس سے کسی ثواب اور اجر کی توقع عبث ہے: «رُبَّ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوعُ»[1]

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ روزے کے ذریعے تمام مسلمانوں کے اندر ایسا ضبط اور ایسی اطاعتِ الٰہی پیدا ہو جائے کہ وہ ہر منکر کو بلا حیل و حجت ترک کر دیں اور ہر معروف کو اختیار کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔

ہر مذہب میں روزہ فرض تھا:

﴿ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ [البقرة: ١٨٣]: دہریت کو چھوڑ کر دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ اپنی بگڑی ہوئی شکل میں آج بھی موجود ہے، اس سے اسلام کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ ان مذاہب میں روزے کے وقت، تعداد اور کیفیت کا فرق ہے، لیکن روزے کے آثار بہرحال موجود ہیں۔ جس طرح پہلی امتوں نے دوسرے احکامِ الٰہی میں افراط وتفریط سے کام لیا، کتر بیونت اور تحریف کی، اسی طرح کا معاملہ روزے کے ساتھ بھی ہوا؛ یہود نے روزوں کی تعداد کم کرتے کرتے سال میں صرف ایک روزہ مقرر کر دیا اور نصاریٰ نے تعداد بڑھا کر پچاس کر دی۔ ایسا کرنے والے مسلمانوں میں بھی پیدا ہوئے ہیں، جنھوں نے کہا ہے کہ روزے صرف تین ہیں۔

حدود اللہ کی پابندی نہ کرنا یہودی ذہن ہے اور اپنی مرضی سے اس میں اضافہ کرنا مسیحی ذہن۔ ان حضرات نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر بوجھ زیادہ ڈال دیا تھا، اس لیے اس کی تعداد کو کم کر دیا اور دوسرے گروہ نے یہ سمجھا ہے کہ جس قدر بوجھ کی ضرورت تھی، بوجھ اس

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٩٠)

سے کم ہے، اس لیے انھوں نے تعداد کو بڑھا دیا اور اس طریقے سے اللہ کے دین کی ''مرمت'' کرتے رہے اور آج بھی یہ سلسلۂ مشق وستم جاری ہے۔

اعتدال کی راہ:

رسول اللہ ﷺ نے دونوں طریقوں کے درمیان اعتدال قائم کیا ہے۔ ایک صحابی کو رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے فرائض بتائے تو اس نے سوال کیا کہ اس کے علاوہ کچھ اور؟ جب اس کے جواب میں آپ ﷺ نے بس کہا تو اس نے کہا کہ میں ان فرائض میں کمی کروں گا نہ زیادتی ہی اور اس پر خدا کو گواہ بھی بنایا۔ اس موقع پر رسول اکرم ﷺ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

((مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَّنْظُرَ إِلٰى رَجُلٍ مِّنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَلْيَنْظُرْ إِلٰى هٰذَا))[1]

(مشكاة بحواله صحيحين)

''جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔''

اپنی مرضی اور فہم سے احکامِ الٰہی میں ترمیم کرنا بہت بڑا ظلم اور گناہ ہے۔

روزے کا مقصد:

﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾: تاکہ تقویٰ اور اللہ کا ڈر پیدا ہو۔ ہر کام کرتے وقت یہ خیال ذہن میں آئے کہ اس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض تو نہ ہوں گے؟ کیا یہ جائز اور روا ہے؟ ہر معاملے میں احتیاط کو اختیار کرنا تقویٰ ہے۔ تقویٰ کا تقاضا ہے کہ ایک مسلمان ان امور کو بھی ترک کر دے جن کے جائز ہونے کے متعلق شبہہ ہو۔[2] رخصتوں کو چھوڑ کر عزیمت کی راہ اختیار کرنا تقویٰ ہے۔ روزہ افضل امور کو اختیار کرنے کی عادت ڈالتا ہے اور اس طرح تقویٰ کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

نعمتوں کو ترک کرنا تقویٰ نہیں ہے:

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو ترک کر دینا تقویٰ نہیں ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اہلِ تصوف نے تقویٰ کی یہ صورت پیدا کر دی کہ بعض نے ہاتھ بیکار کر دیے، تاکہ ہاتھ سے ہونے والی برائیوں سے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦، ١٣٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢)

بچ جائیں۔ بعض نے نظر کی برائیوں سے بچاؤ کے لیے آنکھیں ضائع کر دیں۔ بعض نے کھانے اور لباس کو انتہائی حد تک حقیر کر دیا۔ دنیا کی چیزوں اور مال و دولت سے تعلق بالکلیہ توڑ کر اس امر کی دعوت بھی دی جاتی رہی۔ کیا یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے بیکار پیدا کی ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور ﴿ مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾ [آل عمران: ۱۹۱] ''تو نے یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔'' درست ہے تو ان سے فائدہ نہ اٹھانے کا کیا مطلب ہے؟

درمیانی راہ:

انبیائے کرام علیہم السلام کا اسوہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ انبیاء نے دنیا کے تمام وسائل کو استعمال کیا اور ان سے کام لیا ہے۔ اسراف اور تبذیر سے بھی روکا اور بخل سے بھی منع کیا اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٧]

رسولِ اکرم ﷺ کی پیدائش غربت کے ماحول ہی میں ہوئی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکومت عطا کی تو بے شمار مال و دولت سے بھی نوازا اور یہ آیت بھی نازل کر دی گئی: ﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ﴾ [الأعراف: ٣٢] یعنی بے نیازی سے پھیر دیا اور یہ بات بتا دی کہ توفیق کے مطابق کھانا، پینا اور پہننا چاہیے اور بہر حال اس معاملے میں احتیاط لازم ہے۔

روزے میں جائز کام:

روزے کی حالت میں بعض امور کو جائز رکھا ہے، جن میں خوش بو لگانا، غسل کرنا، سرمہ ڈالنا اور کان میں دوا ڈالنا شامل ہے، جب کہ بطور غذا ہر چیز کے استعمال سے منع کر دیا گیا ہے۔

رمضان میں قیام اللیل کی اہمیت:

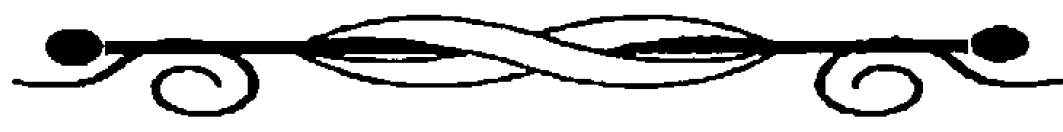
رمضان میں دوسری عبادت قیام اللیل ہے۔ زائد نماز فرض نہیں کی گئی، بلکہ نوافل معین کیے گئے ہیں اور ان کو ادا کرنے کی ترغیب دی ہے:

((مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَاناً وَّاحْتِسَاباً، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ)) [1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧)

اس حدیث میں نوافل، یعنی تراویح پر اجرِ عظیم کی بشارت دی گئی ہے۔ دراصل یہ تہجد کی نماز ہے جس کو عشاء کے وقت پر کر دیا گیا ہے۔

تراویح کا ثبوت سنتِ رسولِ اکرم ﷺ سے آٹھ رکعات ہے اور وتر 1، 3، 5 یا اس سے زائد طاق عدد میں۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تراویح 8 سے زائد 20، 30، 40 بھی پڑھی ہیں۔[1] اس معاملے میں بحث کی ضرورت نہیں۔ جس قدر انسان آسانی سے اور صحیح طور پر ادا کر سکے، پڑھے۔[2]



[1] بیس یا اس سے زائد تراویح کسی ایک صحابی سے بھی ثابت نہیں۔ جن روایات میں کسی صحابی سے بیس رکعات تراویح کا ذکر آیا ہے، ان میں سے کوئی بھی سند کے لحاظ سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی، جیسا کہ اس دور کے مشہور محدث علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ "صلاۃ التراویح" میں مدلل طور پر بیان فرمایا ہے۔ (عبدالسلام)

[2] خطبہ بتاریخ 17 جنوری 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (31 جنوری 1964ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روزے کے بارے میں بعض ضروری امور

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿183﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿184﴾ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۳، ۱۸۴]

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ (روزے) گنتی کے چند دن ہیں، پھر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دِنوں سے گنتی پوری کر لے اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو اس کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے، پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے (زیادہ) نیکی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے اور تمھارا روزہ رکھنا تمھارے لیے کہیں بہتر ہے، اگر تم علم رکھتے ہو۔“

تقویٰ:

پچھلے جمعہ کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ روزہ ایسی ریاضت اور عبادت ہے جو پہلی امتوں پر فرض کی گئی تھی اور اس کا مقصد ﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ بتا کر یہ حکم دیا ہے کہ ہم احتیاط سے گزر کریں اور اپنے اندر ضبط پیدا کریں۔ اس طریقے سے یہ تقویٰ پیدا ہوگا، گناہ سے بچنے کی قوت اور نیکی کرنے کی توفیق ملے گی۔ اگر کوئی آدمی روزہ تو رکھتا ہے، لیکن زبان پر قابو نہیں رکھتا، جھوٹ بولتا ہے اور فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے تو اس نے روزے کا مقصد نہیں سمجھا اور اسے روزے کے فوائد حاصل ہونے کے بجائے روزے سے صرف بھوک اور پیاس ہی ملے گی۔ منشائے روزہ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ ہرگز حاصل نہیں ہوگا۔

روزے کی حالت میں لڑائی جھگڑے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص بالکل آمادۂ فساد

ہو جائے تو اس کے جواب میں "إِنِّي صَائِمٌ"[1] "میں روزے دار ہوں" کہہ کر خاموش ہو جانا چاہیے۔ بظاہر عقل اس جواب کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتی، لیکن دشمن کے حملے کے جواب میں ایسی متانت کا اظہار اپنے اندر بے حد حکمتیں رکھتا ہے اور بے انتہا لطف۔

ایامِ معدودات اور روزے کے فوائد:

ابتدائے اسلام میں مسلمان ہر ماہ تین روزے رکھتے تھے اور محرم کی دس تاریخ کے روزے کا بھی التزام کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ﴿ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ﴾ [البقرۃ: ۱۸٤] کا اشارہ ان دنوں کی طرف ہے، لیکن یہ معنی کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے، کیوں کہ اگر ایسا ہی ہو تو یہ آیات منسوخ سمجھی جاتیں، جب کہ اس سے اگلی آیت میں رمضان کے روزے کی صراحت آ گئی ہے۔

اس معاملے میں ایک بات قابلِ غور ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ہر ماہ تین اور عاشورے کے روزے کی بے حد ترغیب دلائی ہے، اگر چہ واجب نہیں کیا، لیکن خود رسول اللہ ﷺ کا معمول تمام عمر یہی رہا ہے۔ آپ ﷺ نے ان روزوں کو کبھی نہیں چھوڑا۔ اس کے علاوہ آیت کا سیاق و سباق بھی تقاضا کرتا ہے کہ یہ الفاظ رمضان کے متعلق ہی ہیں۔ ویسے غور کیا جائے تو 29، 30 دن بھی کوئی لمبی مدت نہیں ہے، بلکہ ایامِ معدوات ہی ہیں۔ یہ ہماری تسکین کے لیے فرمایا کہ یہ چند گنتی کے دن ہیں، لہٰذا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ناقابلِ برداشت بوجھ نہیں ڈال دیا گیا اور فی الواقع جو لوگ روزے رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی تکلیف کی بات نہیں ہے۔

غور کیجیے! یہ تکلیف کی کون سی بات ہے کہ دو وقت کھانے کی گنجایش ہے، افطار کی اجازت ہے، بلکہ حکم ہے۔ صرف کھانے کے وقت تبدیل کر دیے گئے اور ناشتہ اڑا دیا گیا ہے، اس طرح زیادہ فرق نہیں پڑا۔ طبی نقطۂ نظر سے روزہ کئی امراض کا علاج ہے۔ معدے کو کافی عرصے کے لیے آرام مل جاتا ہے، جس سے اس میں قوتِ کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔ رطوبات خشک ہو جاتی ہیں۔ معدے کو تندرست کرنے کے لیے بھوک ایک قدرتی علاج ہے، جس طرح ایک تھکا ہوا آدمی سستانے سے آسودہ ہو جاتا ہے، اسی طرح آرام سے معدہ بھی درست ہو جاتا ہے۔

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۵۱)

روزے کے دوران میں ایک احساس یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ بھوک کی تکلیف کیسی ہوتی ہے؟ جن لوگوں کو دو وقت کھانے کو نہیں ملتا، ان کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور جن کے کئی کئی روز فاقے پڑتے ہیں، ہم ان سے کیا تعاون کرتے ہیں؟ اس طرح سے ان لوگوں کی تکالیف کی طرف ذہن متوجہ ہوتے ہیں۔

رعایت:

اگر کسی قانون میں لچک موجود نہ ہو اور اس میں مستثنیات نہ رکھی گئی ہوں تو وہ قابلِ عمل نہیں ہوتا۔ ایسے مراحل اور مواقع آ جاتے ہیں جن کے لیے قانون میں رعایت موجود ہونی چاہیے۔ اسی طرح روزے سے بھی بعض لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

بیمار کے لیے رخصت:

ایسے لوگ جو انتہائی بیمار ہوں اور روزہ رکھنا ان کے لیے انتہائی محال ہو، ان کو رعایت دی گئی ہے کہ روزہ نہ رکھیں: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾[البقرۃ: ۱۸۴]

بیماریاں دو قسم کی ہیں:

1. ایک وقتی ہوتی ہیں اور مریض جلد شفایاب ہو جاتا ہے۔
2. بعض امراض لمبے ہوتے ہیں، جیسے دق اور سل وغیرہ۔ سالہا سال مریض ان میں مبتلا رہتا ہے اور صحت کے بعد بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ روزہ رکھ سکے۔

اول الذکر بیماری کی صورت میں ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ کی رعایت دی گئی ہے، یعنی جس قدر روزے اس نے چھوڑے ہوں، رمضان کے بعد ان کو مسلسل یا بغیر تسلسل کے پورے کر لے۔

دوسری قسم کی بیماری میں ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾[البقرۃ: ۱۸۴] کی ارزانی کی گئی ہے، یعنی مشکل میں پڑنے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا دیتے جائیں۔ اس ضمن میں رسولِ اکرم ﷺ نے تصریح فرمائی ہے کہ اس میں ایسا بوڑھا آدمی جو روزہ نہ رکھ سکتا ہو، شامل ہے۔ پیرِ فرتوت کے لیے فدیہ دینے کی رعایت ہے۔

حمل اور رضاعت میں:

حمل اور رضاعت کی حالت میں عورت کو اجازت ہے کہ فدیہ دے کر روزہ چھوڑ دے۔

روزے کی حالت میں ماں اور بچے دونوں کی صحت پر برا اثر پڑ سکتا ہے، اس لیے یہ رعایت دی گئی ہے۔

عام طور پر 30، 40 سال تک مسلسل عورتیں اس صورتِ حال سے دوچار رہتی ہیں کہ ایک سال امید سے ہیں تو ایک سال بچے کو دودھ پلا رہی ہیں۔ اس صورت میں اگر وہ پیدائش کا سلسلہ بند ہونے پر چھوڑے ہوئے روزوں کی تعداد پوری کرنی شروع کریں تو باقی عمر روزے رکھنے ہی میں گزر جائے گی، اس وجہ سے ان کے لیے فدیہ طعامِ مسکین کی رعایت رکھی گئی ہے۔

مریض اور مسافر:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ [البقرة: ١٨٤] مریض کے لیے کھلی چھٹی ہے کہ روزے کی حالت میں جب تکلیف محسوس کرے، روزہ کھول دے۔ دن کے کسی بھی حصے میں روزہ کھول سکتا ہے۔ مسافر کے لیے ضروری ہے کہ آغازِ سفر میں روزہ رکھے۔ اس کے برعکس مرض کے آغاز میں بھی رخصت ہے۔

کس مرض میں روزہ نہ رکھے؟

کیسا مرض ہو تو روزہ نہ رکھے اور کس قدر سفر ہو کہ افطار کرے؟ اس معاملے میں کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس کی صراحت موجود نہیں ہے۔

امراض کئی قسم کے ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ روزہ ان میں مفید ہوتا ہے، مثلاً زکام۔ لیکن یہ اختیار مریض کو ہے اور اس معاملے میں کوئی مفتی نہیں ہے۔ صرف مریض کا ضمیر ہی اس کا مفتی ہے۔ اگر وہ سمجھے کہ فی الواقع روزہ رکھنا مشکل ہے تو چھوڑ دے، اس کے لیے کوئی پیمانہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے انگلی کے درد کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا تھا۔[1] اگر واقعی انگلی کا درد شدید ہو تو روزہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ بہرحال کسی طرح بھی پابند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مریض اور اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، اس ضمن میں ایک حدیث یاد رہنی چاہیے:

”رمضان کا ایک روزہ بھی اگر جان بوجھ کر چھوڑا گیا تو ساری عمر کے روزے بھی اس کا کفارہ نہیں ہو سکتے۔“[2]

---

[1] التفسير الكبير للرازي (٥/٢٤٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٩٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٢٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٧٢) اس کی سند میں یزید بن مطوس راوی ضعیف ہے۔

جنگِ بدر اور فتح مکہ دونوں رمضان میں ہوئی تھیں۔ جو اصحاب ان جنگوں میں شریک ہوئے تھے، ان میں سے بعض نے روزہ رکھا تھا اور بعض نے چھوڑ دیا تھا۔ رکھنے والے چھوڑنے والوں پر کوئی اعتراض اور ملامت نہیں کرتے تھے۔ ایک سفر کے دوران میں ایک مقام پر روزہ دار نڈھال ہو کر گر گئے تو جن لوگوں نے روزے نہیں رکھے تھے، انھوں نے ان کی سواری اور سامان وغیرہ سنبھالا تو اس پر رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا تھا:

"آج روزہ نہ رکھنے والے روزہ رکھنے والوں پر فوقیت لے گئے ہیں۔"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ بعض حالتوں میں روزہ چھوڑ دینا ضروری ہوتا ہے۔ جنگ کے موقع پر آپ ﷺ روزے سے حکماً روک دیتے تھے، تاکہ دشمن سے لڑنے میں کمزوری لاحق نہ ہو۔

کتنے سفر میں روزہ نہ رکھے؟

آسان سفر میں بھی روزہ چھوڑنے کی رعایت موجود ہے، لیکن اگر رکھ لے تو مسافر کی مرضی پر منحصر ہے۔

کتنی مسافت پر روزہ چھوڑنا چاہیے؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض علمائے اہلِ حدیث کے نزدیک 9 میل، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک 38 میل اور شوافع کے نزدیک 47 میل ہے۔ اسی طرح دوسرے ائمہ کرام نے بھی اختلاف فرمایا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد سے مسافت واضح نہیں ہوتی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل بھی اس معاملے میں مختلف ہے۔ درحقیقت مرض کی طرح سفر کی بھی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ سفر کی نوعیت میں کوئی بحث نہیں ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی سفر کی سہولتوں کا فرق موجود تھا اور اب بھی ایسا ہی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ہوائی جہاز کا سفر ہو تو افطار نہ کرے؛ درست نہیں۔ ظاہری پابندی، احترامِ رمضان کرنا ضروری ہے۔ بے روزہ دار کے لیے سہولتیں مہیا کرنا غلط ہے۔ بے عذر روزہ نہ رکھنے والوں کو کھانا دینا ظلم اور گناہ ہے۔ ایسا کاروبار ناجائز و حرام ہے اور بددیانتی ہے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١٩)

فدیہ میں تطوع کا مطلب:

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۚ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

[البقرۃ: ۱۸٤]

اگر ایک سے زیادہ آدمیوں کا کھانا کھلا دے تو یہ تطوع ہے۔ اسی طرح فدیہ دینے کے باوجود روزہ بھی رکھے تو یہ بھی تطوع ہے۔ مریض، مسافر، حاملہ اور مرضعہ اگر روزہ رکھیں تو یہ پسندیدہ ہے، لیکن روزے کی وجہ سے جان کو ہلاکت میں ڈالنا گناہ اور ناجائز ہے۔[1]



[1] خطبہ بتاریخ 24 جنوری 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (7 فروری 1964)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رمضان المبارک اور قرآن مجید

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿185﴾﴾ [البقرۃ: ۱۸۵]

''رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی واضح اور حق کو باطل سے جدا کرنے والی دلیلیں ہیں، پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دِنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو۔''

رمضان کی برکات:

1. ماہِ رمضان اس لحاظ سے بابرکت ہے کہ اس میں روزے فرض کیے گئے اور حکم دیا گیا کہ 29 یا 30 روزے رکھو۔
2. اس وجہ سے بھی اس میں برکات ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اس مہینے میں عبادت، صدقات، نوافل اور تلاوتِ قرآن کی زیادہ سے زیادہ ترغیب دی ہے اور خود بھی اس پر سختی سے عمل کیا۔

انفاق فی سبیل اللہ کی کیا حالت ہوتی تھی؟ رسول اکرم ﷺ اس مہینے میں بے حد مال و دولت غرباء و مساکین اور مستحقین پر خرچ کیا کرتے تھے۔ ''کَرِیحٍ مُرْسَلَةٍ'' ''چلتی ہوئی ہوا کی طرح۔''[1]

[1] دیکھیں: صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۲۲)

3 رمضان کا مہینا اس وجہ سے بھی بابرکت ہے کہ رمضان میں رات کی نماز اور قیام کی خاص تاکید ہے۔ حدیث میں ہے:

((مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَاناً وَّاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ))[1]

''جو رمضان میں ایمان کی حالت اور ثواب کی نیت سے قیام کرتا ہے، اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔''

رسولِ اکرم ﷺ اور اہلِ بیت کی رمضان کی راتوں میں کیا حالت ہوتی تھی؟ وہ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ رمضان کے آخری عشرے میں رسولِ اکرم ﷺ کمر باندھ لیتے، رات کو قیام کرتے اور اہلِ خانہ کو نوافل کے لیے جگاتے۔[2]

4 ماہِ رمضان کی برکات میں سے ایک برکت اس میں نزولِ قرآن بھی ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ [البقرة: ١٨٥]

اس مہینے میں ایک ایسی کتاب اتاری گئی جو پہلی تمام کتابوں اور ان کی تعلیمات کی محافظ اور پہلی تمام شرائع کی کمیوں کو پورا کرنے والی ہے اور اس کے پروگرام کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

قرآن مجید کے نازل ہونے کی ابتدا اس مہینے میں ہوئی تھی اور سارا قرآن 23 سال کی مدت میں وقتاً فوقتاً اور ضرورت کے مطابق نازل ہوتا رہا۔

حفاظتِ قرآن:

امت نے قرآن مجید کی پوری طرح حفاظت کی ہے۔ ہر تحریر کی حفاظت کے لیے دو چیزوں کی حفاظت ضروری ہے: ایک الفاظ اور دوسرے معانی۔

مسلمانوں نے دونوں طرح سے قرآن مجید کی پوری پوری حفاظت کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن مجید سنتے ہی حفظ کر لیا۔ اس وقت سیکڑوں کی تعداد میں حفاظ موجود تھے۔ کچھ اصحاب کو جزوی طور پر بھی کافی قرآن مجید یاد تھا اور پھر ہر دور میں بے شمار حفاظ موجود رہے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٢٤)

قرآن کے الفاظ اور تلفظ کو اس طریقے سے محفوظ کیا گیا ہے کہ ایک پورا فن علمِ تجوید کے نام سے مدوّن ہو چکا ہے اور قرآن مجید کے ہر لفظ، ہر حرف، ہر نقطہ اور ہر حرکت کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اس معاملے میں دوسری کوئی بھی آسمانی و غیر آسمانی کتاب قرآن مجید کی ہمسری نہیں کر سکتی۔

چودہ صدیوں کے گزر جانے کے باوجود ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید بالکل وہی کتاب ہے جو رسولِ اکرم ﷺ پر نازل ہوئی تھی اور اس کا ایک لفظ بھی آج تک نہیں بدلا۔ یہ شرف صرف قرآن مجید کو حاصل ہے۔ بعض آسمانی کتابوں کے الفاظ بدل دیے گئے۔ ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ [النساء: ٤٦]

بعض کتابوں کا ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہوئے الفاظ کے ساتھ ساتھ فقرے اور معانی و مطالب بھی بدل گئے۔ تورات، انجیل اور زبور کے تراجم موجود ہیں، لیکن یہ کتابیں کس زبان میں اتری تھیں؟ ان کے حاملین وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔

بعض مسیحی علماء اور مورخین نے لکھا ہے کہ تورات عبرانی اور انجیل یونانی زبان میں اتری تھی۔ لیکن غور کا مقام ہے کہ اس وقت جو نسخے عبرانی اور یونانی زبان میں موجود ہیں، وہ دوسری زبانوں سے ترجمے کے نسخے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن مجید کے تراجم اگرچہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکے ہیں، لیکن اصل عربی زبان میں بہ تمام و کمال موجود ہے۔

معانیِ قرآن: حدیثِ نبوی کی حفاظت:

کسی کتاب کی حفاظت کے لیے مفہوم، مطالب اور مقاصد کا تحفظ بھی ضروری ہوتا ہے۔ الفاظ و تلفظ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ معانی اور مطالب کی حفاظت صرف ضروری ہی نہیں، بلکہ اس سے بھی اہم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ مسلمانوں نے اس معاملے میں بھی پوری پوری کوشش کی ہے۔ اس کے لیے ایک تو تمام مسلمان قرآن مجید کی ایک عملی تصویر بن گئے اور اس کے احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

دوسرا رسولِ اکرم ﷺ کی پوری زندگی کے حالات کو محفوظ کیا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی سیرت کا ہر گوشہ مرتب کر لیا کہ کس طرح وحی پر انھوں نے عمل کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور اعمال کو جمع کیا، جس سے ایک تو احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا، دوسرا شبہات کے رفع ہونے کی صورت پیدا ہو گئی۔

جمع و تدوینِ حدیث:

پہلی صدی ہجری میں جمع حدیث کے بہت سے تذکرے ملتے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اور فتوے اور مرفوع احادیث کو جمع کیا گیا۔ مسند امام احمد رحمۃ اللہ اسی زمانے کی کتاب ہے۔ تیسری صدی ہجری میں اس علم نے پورا عروج حاصل کیا۔ احادیث کا پورا ذخیرہ جمع ہو گیا اور ﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ ﴾ [البقرۃ: ١٨٥] کی صورت بن گیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس زمانے میں دولت مند اور ذہین طبقے نے دینی تعلیم سے پہلوتہی اختیار کر لی ہے۔ ان کے ذہن بدل گئے ہیں اور زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنا رہ گیا ہے۔

دینی علم کی طرف توجہ دینے والوں میں ایک طبقہ ایسا بھی داخل ہو گیا ہے جو اس کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنا رہا ہے اور یہ بہت بڑی خرابی ہے جس سے بے شمار مفاسد پیدا ہو رہے ہیں۔ ایسے لوگ غلط معانی اور مطالب بیان کر کے اپنا مقصد پورا کرتے ہیں، اس وجہ سے اختلافات دن بدن بڑھ رہے ہیں اور علماء کی بدنامی ہو رہی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص قرآن مجید کا سادہ ترجمہ سوچ کر پڑھے اور علومِ قرآن کا جو ذخیرہ موجود ہے، اس سے استفادہ کرے تو یقیناً اسے اختلافات کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ سلف صالحین نے ماضی میں مستقبل کے لیے اتنا کچھ جمع کر دیا ہے جو ہماری ہدایت کے لیے کافی ہے۔ قرآن مجید اس لیے نہیں ہے کہ ہم سرہانے رکھ کر سو جائیں یا تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیں یا لکھا ہوا گھول کر شفا کے لیے پی لیں یا اس سے جن بھوت بھگانے کا کام لیں۔

دراصل قرآن مجید تو کتابِ ہدایت ہے، اس کی تعلیمات واضح اور روشن ہیں۔ اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ ہدایت کی راہ بغیر کسی مشکل کے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کتاب نے حق اور باطل کے فرق کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ اس میں بھی کوئی ابہام باقی نہیں رہنے دیا۔

روزہ ہر مسلمان پر فرض ہے:

﴿ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ [البقرۃ: ١٨٥]

’’پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔‘‘

تمام بالغ مرد و زن پر روزے فرض ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بعض ممالک میں دن اور رات کا

حساب دوسرے ممالک سے بالکل الگ ہے اور رمضان کا مہینا ان پر چڑھتا ہی نہیں۔ کیا ان پر بھی روزے فرض ہیں؟ مثلاً قطبین میں دن اور رات چھے چھے ماہ کے ہیں۔ اگر واقعی یہی صورت ہے تو ان لوگوں پر روزے فرض نہیں ہوتے، کیونکہ ﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ ﴾ کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

بعض جغرافیہ دانوں نے یہ لکھا ہے کہ گرین لینڈ اور ناروے جیسے ممالک میں اگرچہ دن اور رات کی کیفیت یہی ہے، لیکن طلوع اور غروبِ آفتاب کے وقت وہاں افق پر آثار پیدا ہوتے ہیں۔ جس زمانے میں گھڑیاں ایجاد نہیں ہوئی تھیں، تب وہاں کے باشندے انھی آثار کی مدد سے اپنے سونے اٹھنے اور کام کے اوقات مقرر کیا کرتے تھے۔ بہتر ہوگا کہ وہاں کے رہنے والے انھی آثار کی مدد سے سحری وافطاری کا انتظام کر لیں اور روزے رکھیں، یہی تقویٰ ہے۔[1]

روزے میں آسانی:

﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۵]

مریض اور مسافر کے لیے رعایت کا ذکر اس سے قبل گزر چکا ہے اور یہاں اس کا دوبارہ ذکر کرنے کے ساتھ ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آسانی چاہتا ہے، وہ اپنی مخلوق کو مشکل اور مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر بھی اس امر کو بے حد وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اللہ مسلمانوں پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالتا جس کے وہ متحمل نہ ہوں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے بھی دین کے معاملے میں شدت، سختی اور غلو سے منع کیا ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ))[2]

''دین کے معاملے میں غلو اور شدت کرنے والے ہلاک ہو گئے۔''

---

[1] اوقات کی تعیین کے ساتھ ایسے ممالک میں رہایش پذیر لوگوں پر بھی روزے فرض ہیں اور اس کی صریح دلیل وہ حدیث ہے جس میں ذکر ہے کہ قربِ قیامت دجال کی آمد پر دن اور رات کے اوقات میں بہت تغیر ہوگا، ایک دن سال کے برابر اور ایک دن مہینے کے برابر ہوگا تو نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان ایام میں نماز کے اوقات مقرر کر کے نماز پڑھو۔ دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٩٢٧)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٧٠)

دوسری حدیث میں فرمایا:

((يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا))[1]

''آسانی اور سہولت دو، تنگی اور سختی نہ کرو۔ خوش خبری دو اور نفرت نہ پھیلاؤ۔''

نیز فرمایا:

((إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ))[2]

''تمھیں آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، مشکل کا پیدا کرنے والا نہیں۔''

ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ کی پوری زندگی کا طرزِ عمل واضح کر دیا ہے:

((مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ إِثْماً))[3]

''جب کبھی رسولِ اکرم ﷺ کو دو کاموں میں سے ایک کام کا اختیار دیا گیا تو آپ ﷺ نے ان میں سے آسان ترین کو اختیار کیا، اگر وہ گناہ نہ تھا۔''

روزے کی قضا اور شکر:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿185﴾ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

مریض اور مسافر جتنے روزے چھوڑیں، دوسرے ایام میں ان کی گنتی پوری کر لیں۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور کبریائی بیان کرنی چاہیے کہ ایک تو اس نے ہدایت عطا کی، دوسرا ہمارے لیے آسانیاں پیدا کیں، اسی طرح شکر کا حق ادا ہو گا۔[4]



---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٢٧)

[4] خطبہ بتاریخ 30 جنوری 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (28 فروری 1964ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا اور اس کی قبولیت

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ١٨٦﴾ [البقرۃ: ١٨٦]

”اور (اے نبی!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب بھی وہ مجھ سے دعا کرے، پس چاہیے کہ وہ بھی میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔“

روزے کے ساتھ دعا کا تذکرہ:

مسائلِ رمضان کے تذکرے کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے دعا کا بھی ذکر کیا ہے۔ غالباً مقصد یہ ہے کہ دعا کا تعلق عبادات سے خاص ہے اور رمضان میں عبادات کثرت سے ہوتی ہیں۔ روزہ، تلاوتِ قرآن اور قیام اللیل کا تعلق دعا سے براہِ راست ہے، اس لیے دعا اور اس کے متعلق مسائل کا ذکر ایک عجیب انداز میں کیا ہے۔

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا سنتے ہیں اور اس کو قبول بھی کرتے ہیں۔

مانگنا صرف اللہ سے:

اس معاملے میں ایک چیز کے متعلق ذہن صاف ہونا چاہیے، وہ یہ کہ دعا کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے ہے۔ مانگنا صرف اسی سے چاہیے اور کوئی ہستی اس قابل نہیں کہ اس کو مدد کے لیے پکارا جائے۔

مختارِ کل اللہ کی ذات ہے:

قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ [البقرۃ: ١٨٦] زمین و

آسمان اور مافیہما سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے، اس میں تصرف کرتا ہے۔ وہی مختارِ کل ہے۔ مخلوق میں سے کوئی بھی، خواہ بڑے سے بڑا ہو یا چھوٹا، اس اختیار میں اس کا شریک اور ساتھی نہیں ہے۔ انبیاء، صحابہ، صلحاء اور اولیائے کرام کا تعلق ہماری نسبت اللہ تعالیٰ سے بے حد زیادہ تھا اور پھر ان کی خدمات بھی بے شمار ہیں۔ حق کی اشاعت اور تبلیغ میں انھوں نے ناقابلِ فراموش سرگرمیاں دکھائیں اور اس راہ میں بے حد مصائب بھی اٹھائے، لیکن زمین و آسمان کی ملکیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے؛ وہ کل کے مختار ہیں نہ جز ہی کے!

بعض اختیارات اللہ نے اپنی مخلوق کو دیے ہیں، مثلاً: نظر کا اختیار۔ ہم جس طرح چاہیں نظر کو استعمال کر سکتے ہیں، لیکن یہ اختیار بھی اللہ تعالیٰ جب سلب کر لیتے ہیں تو کوئی ہستی اس کو واپس نہیں کرا سکتی۔ بچپن، جوانی یا بڑھاپے کے اندر جب چاہے آنکھوں سے محروم کر دے۔ انسان اس معاملے میں مختارِ مطلق نہیں ہے۔ اسی طرح انسان کے دوسرے اعضاء ہاتھ پاؤں وغیرہ کے استعمال کی نوعیت ہے۔ انبیاء ہوں یا عام آدمی، سب کے ساتھ معاملے کی نوعیت یہی ہے۔

حضرت ایوب صابر علیہ السلام پر مصائب آتے ہیں، شعیب علیہ السلام نابینا تھے، لیکن یہ اختیارات بلا رکاوٹ صرف اللہ تعالیٰ ہی استعمال کر سکتے ہیں، البتہ اعضاء وغیرہ پر جزوی اختیارات نیک و بد سب کو دیے ہیں۔ اس طرح جب ایک عقل مند آدمی غور وفکر کرتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ صرف اللہ ہی مطلقاً بااختیار ہے: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ﴾ [الحج: ٧٣]

دنیا میں کسی کو نہ تو طاقت ہے نہ حق ہے کہ خدا کے فیصلے کو رد کر سکے۔ قرآن اس کو بالکل واضح کرتا ہے اور سنت میں بھی اس کی پوری صراحت موجود ہے۔ یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں، بلکہ از اول تا آخر تمام ائمہ کرام کا یہی خیال ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ پوری امت عقائد میں متفق ہے۔

آج لوگوں کی حالت:

اس آخری دور میں اس معاملے کے متعلق بعض مفاد پرستوں نے کہانیاں اور افسانے تراشے ہیں کہ فلاں حضرت صاحب نے یہ کر دیا اور فلاں پیر صاحب نے یہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے راستے میں فقیروں نے رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ اس طرح سے عوام کو گمراہ کیا گیا ہے۔ جاہل واعظ ہیرا پھیری

کر کے کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ عورتوں کا اعتقاد اس معاملے میں بے حد کمزور واقع ہوا ہے۔ اولاد اور مال کی خاطر شرک کرتی ہیں۔ ایمان جیسی قیمتی متاع کسی بھی اَستھان پر جانے سے ضائع ہو جاتی ہے اور تمام اعمالِ صالحہ باطل ہو جاتے ہیں۔

ابو جہل بڑا پرہیز گار تھا۔ خانہ کعبہ کی جاروب کشی کیا کرتا تھا۔ حج کرتا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا مانتا تھا، لیکن ہمیں یقینِ کامل ہے کہ وہ جہنمی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس نے اللہ کے ساتھ غیروں کو شریک بنا لیا اور خدائی کا مقام بتوں کو دے دیا۔

آج کے برائے نام مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ شرک بھی کرتے جاتے ہیں اور ایمان کا دعویٰ بھی جاری ہے! ہمیں غور کرنا چاہیے کہ پہلے لوگوں کے کفر میں کیا نقص تھا اور ہمارے اس ایمان و اسلام کے دعوے میں کیا خوبی ہے؟ ﴿ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿43﴾ ﴾ [القمر: ٤٣] ''کیا تمھارے کفار ان لوگوں سے بہتر ہیں یا تمھارے لیے (پہلی) کتابوں میں کوئی چھٹکارا ہے؟''

خدا سے مانگیے اور اسی سے دعا کیجیے، وہ ضرور قبول کرے گا ع

ایں درگہ ما درگہ نا امیدی نیست [1]

سب اللہ کے محتاج ہیں:

رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ''اے اللہ میں تیری تعریف نہیں کر سکتا، تو ہی اپنی تعریف کو بہتر جانتا ہے۔'' [2] یہاں سے جس نے بھی لینا ہے، مانگ کر لے گا۔ سوال کرے گا تو پا لے گا۔ ﴿ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ [الفاطر: ١٥] اس کے دربار میں سب فقیر ہیں، بلکہ جو اکڑے گا تو: ﴿ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿29﴾ ﴾ [الأنبياء: ٢٩] اس کا بدلہ جہنم ہے، اہلِ توحید کو گستاخی کا طعنہ دے کر توحید سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ ادب اگر خدائی کے حصے بخرے کرتا ہے تو یہ غلط ہے۔ یہ ادب نہیں، حقیقت میں یہی تو بے ادبی اور گستاخی ہے۔

---

[1] یہ ہماری درگاہ ہے، جس میں ناامیدی نہیں ہے۔

[2] مسند أحمد، رقم الحدیث (٧٥١)

سوال اور طلب صرف خدا سے ہونا چاہیے۔ دعا کی قبولیت کے لیے کوئی نصاب اور پیمانہ نہیں ہے۔ اس میں کسی شخصیت کو بھی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ نہ مانے تو وہ حضرت نوح علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کی نہ مانے اور ماننے پر آئے تو ایک گناہ گار کی مان لے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دعا کی، لیکن قبول نہ ہوئی۔ ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ﴾ [التوبة: ١١٤] ''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا بس ایک وعدے کے باعث تھا، جو وعدہ انھوں نے اس سے کیا تھا۔''

جب ہر ایک نے اسی سے مانگا تو ہمیں بھی اسی سے مانگنا چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
جب ایک مسلمان دعا کرتا ہے تو تین چیزوں میں سے ایک اس کو ضرور حاصل ہو جاتی ہے:

1. دعا کی قبولیت۔
2. دنیا ہی میں کسی دوسرے طریقے سے اس دعا کا بدل۔
3. آخرت میں اجر۔[1]

اللہ بہت قریب ہے:

﴿فَإِنِّي قَرِيبٌ﴾: یہاں قرب اور بُعد ان معنوں میں نہیں، جن میں ہم انسان ایک دوسرے کے قریب اور دور ہیں، بلکہ ان معنوں میں ہے کہ ہر انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کر سکتا ہے، حتیٰ کہ دل ہی دل میں کچھ گزارش کرتا ہے تو وہ سن لیتا ہے اور اس پر فیصلہ بھی کر دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کسی دعا کو رد نہیں کرتے، جب تک دعا مانگنے والا جلدی نہیں کرتا۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ جلدی سے کیا مراد ہے؟ تو حکم ہوا: ''وہ بندہ یہ کہے کہ میں نے بہت دعائیں کی ہیں، لیکن میری تو اللہ مانتا ہی نہیں، قبول ہی نہیں کرتا۔''[2]

مایوسی گناہ ہے:

ملحدین اس طریقے سے اپنے ایمان کا ستیاناس کرتے اور اللہ سے مایوس ہو کر دوسری جانب رخ کر لیتے ہیں۔

[1] مسند أحمد، رقم الحديث (١١١٣٣)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٥)

''اللہ تعالیٰ منظور نہیں کرتا'' یہ کہنا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بدگمان ہونا معصیت ہے۔ وثوقِ قبولیت سے دعا کرنی چاہیے اور مانگتے وقت ملنے کا پورا یقین رکھنا چاہیے۔ اس کی درگاہ میں پکے فقیر کی طرح جانا چاہیے کہ اس درگاہ سے لے کر ہی پلٹنا ہے اور کہیں نہیں جانا۔

یہ ضروری نہیں کہ دعا بالکل اسی صورت میں قبول ہو۔ رسولِ اکرم ﷺ کی خواہش تھی کہ اولاد نرینہ ہو، بیویاں موجود تھیں، لیکن اولاد نہیں ہوئی۔ ایک لونڈی سے ابراہیم پیدا ہوئے اور پندرہ ماہ کی عمر میں فوت ہو گئے۔ نزع کے وقت رسولِ اکرم ﷺ کے ہاتھوں میں تھے، آنکھوں سے آنسو جاری تھے، لیکن زبان پر یہ الفاظ تھے:

«لَا نَقُوْلُ إِلَّا مَا يُرْضِي رَبَّنَا وَإِنا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ»[1]

معلوم ہوا کہ ضروری نہیں ہے کہ انبیاء کی دعا بالکل اسی صورت میں قبول ہو۔

قبولیت کے اوقات:

جمعے کے دن بعد نمازِ عصر قبولیتِ دعا کا وقت ہوتا ہے۔[2] خطبۂ جمعہ کے دوران میں امام کے بیٹھنے کے وقت قبولیتِ دعا کا وقت ہوتا ہے۔[3] رات کا وقت بھی دعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔[4]

اللہ دعا قبول کرتا ہے:

﴿ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾: جب بھی دعا کی جائے اللہ تعالیٰ سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔ صرف یہ ضروری ہے کہ اس کی بارگاہ میں ایمان لے کر آئے۔ بے ایمان ہو کر نہ آئے۔ یقین محکم کے ساتھ آئے، آزمائش کے طور پر نہ آئے۔

حصولِ مقصد کے دو طریقے:

ہر مقصد کے حصول کے لیے دو طریقے ہیں:

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٣)
2. سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٩٧)
3. صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥٣)
4. صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥٧)

1. اسباب و ذرائع کے استعمال کا طریقہ۔
2. اسباب سے ماورا۔ اس صورت میں استمداد صرف خدا سے کرنی چاہیے، کسی دوسرے کو پکارنا حرام ہے۔ رشد و ہدایت کا یہی طریقہ ہے، باقی تمام باطل ہیں۔[1]



[1] خطبہ بتاریخ 7 فروری 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (13 مارچ 1964ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توبہ واستغفار کی حقیقت
اور
حضرت مسیح اور ان کی والدہ کا اصل مقام

﴿ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ ﴾ [المائدۃ: ۷۴، ۷۵]

''پھر کیا وہ اللہ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ مسیح ابن مریم نہیں ہیں مگر ایک رسول ہی۔ بلاشبہ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اور ان کی ماں صدیقہ (نہایت راست باز) تھی، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھیں ہم ان کے لیے کیسی کیسی نشانیاں بیان کرتے ہیں، پھر دیکھیں وہ کدھر الٹے پھرے جاتے ہیں!''

توبہ کا مفہوم:

توبہ کہتے ہیں واپس آجانے کو یا لوٹ آنے کو۔ گناہ سے پہلے ایک مومن بارگاہِ رب العزت میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن جب گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو بارگاہِ رب العزت میں اس کی وہ پہلی حالت نہیں رہتی، بلکہ وہ اپنے گناہ کے سبب بہت دور نکل جاتا ہے۔

''توبہ'' کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے دل میں اپنے گناہ کا احساس ہو اور اس احساسِ ندامت کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئے۔ اگر اس گناہ کو وہ اپنی زندگی کا مشن بنالے تو بجائے پہلی حالت پر واپس آنے کے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و بخشش سے مزید دور ہو گا، اسے توبہ نہیں کہتے۔

﴿ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴾ [النساء: ١١٦] اس کا معنی بھی یہی ہے کہ انسان اپنے گناہ اور اعمالِ بد کی بنا پر گمراہی کی تاریک غار میں چلا جاتا ہے اور اس کی وہ پہلی حالت (ارتکابِ گناہ سے پہلے والی) باقی نہیں رہتی۔ اب اس حالت کے لوٹنے کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان تائب ہو جائے، جو کچھ اس نے کیا ہے، اس پر نادم ہو اور آیندہ زندگی محتاط طریقے سے گزارے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اللہ کے حضور استغفار کرے، اپنے گناہوں کی معافی چاہے تو اس صورت میں وہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ سکتا ہے۔

ایک غلط فہمی:

جن لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ توبہ سے انسان گناہ اور معاصی پر اور بھی بے دریغ ہو جاتا ہے، انھوں نے توبہ کا مفہوم سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کے نزدیک توبہ کا مفہوم غالباً یہ ہے کہ ایک انسان گناہ کے ارتکاب کے بعد دو یا تین بار لفظ ''توبہ، توبہ'' کہہ لے تو توبہ ہو گئی۔ توبہ سے گناہ کا دروازہ نہیں کھلتا، بلکہ گناہ کا پھاٹک بند ہو جاتا ہے۔ توبہ انسان کو خدا کے دربار سے دور نہیں لے جاتی، بلکہ خدا کے دربار سے نزدیک کرتی ہے۔

ہر گناہ سے توبہ:

جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کہتے ہیں، وہ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ ایسے لوگوں کو اتنے بڑے ظلم کے ارتکاب کے بعد بھی قرآن نے یہ دعوت دی ہے کہ ﴿ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ﴾ [المائدۃ: ٧٤]

اس سے یہ معلوم ہوا کہ گناہ کتنا بڑا کیوں نہ ہو، توبہ و استغفار سے اس کی معافی ہو جاتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ ایک طرف مخلوق اللہ رب العزت کی غیرت کو چیلنج کرتی ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ انھیں توبہ کی دعوت دیتا ہے۔ یہاں توبہ کی دعوت سے یہی مراد ہے کہ عیسائی اپنے اس بدعقیدے سے رجوع کر لیں اور مقربِ بارگاہِ الٰہی سے ہو جائیں، کیوں کہ اس عقیدے کی موجودگی میں وہ اللہ کی رحمت و غفران سے بہت دور چلے گئے ہیں۔

غفران کا معنیٰ:

''غفران'' کہتے ہیں کسی چیز کے ڈھانپ لینے کو۔ ''استغفار'' کا معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کو ڈھانپ لینے کی درخواست کی جائے۔ درخواست کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گناہ کی بابت سوال نہ کرے، بلکہ اس گناہ کو نظر انداز کر دے۔ جو لوگ توبہ و استغفار سے حق کی طرف واپس آجاتے ہیں، ان کے متعلق ارشاد ہے: ﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ ''غفور'' کا معنیٰ ہے سزا کو معاف کر دینے والا۔ مجرم اپنے جرم کی سزا سے بچ جائے، یہ ''غفران'' ہے، لیکن ایسے مجرم جو توبہ و استغفار کے ذریعے اپنی پہلی حالت پر واپس آجاتے ہیں، ان کے لیے گناہ کی معافی کا بھی وعدہ ہے اور مزید رحمت کا بھی۔ یہ وہ خوش قسمت مجرم ہیں جو جرم کے ارتکاب کے بعد توبہ واستغفار کے ذریعے سے نہ صرف گناہ کی سزا سے بچ گئے، بلکہ اللہ کی رحمت کے بھی مستحق ٹھہرے۔

رسول کا مطلب:

﴿ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ﴾ [المائدۃ: ۷۵] حضرت مسیح علیہ السلام تو صرف اللہ کے رسول ہیں۔ رسول صرف قاصد کو نہیں کہتے، بلکہ لفظِ رسول میں تین مفہوم شامل ہیں:

1. اللہ کے پیغام کو رسول خود سمجھے۔
2. اللہ کے پیغام پر رسول خود عمل پیرا ہو۔
3. امت کو اللہ کا پیغام پہنچائے اور اس کا مفہوم بھی سمجھائے۔

﴿ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ﴾: صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہی اللہ کے رسول نہیں، بلکہ ان سے پہلے بھی متعدد اللہ کے رسول گزر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی خاندانِ نبوت سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر پہلے انبیاء الٰہ نہیں تو حضرت مسیح علیہ السلام بھی الٰہ نہیں۔

﴿ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ﴾: صدیقہ کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی والدہ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، ہمیشہ سچی بات کہی۔ دوسرے معنی یہ ہیں: ﴿ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا ﴾ [التحریم: ۱۲] حضرت مریم علیہا السلام نے اللہ تعالیٰ کے کلمات کی تصدیق کی، اس سے مراد احکامِ الٰہی کی پیروی ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام میں یہ دونوں خوبیاں نمایاں تھیں: آپ سچ بولتیں اور ہمیشہ احکامِ الٰہی کی پیروی کرتیں۔

خدا محتاج نہیں ہوتا:

﴿ كَانَا يَأْكُلٰنِ الطَّعَامَ ﴾: یہ دونوں ماں بیٹا کھانا کھایا کرتے تھے اور کھانا ایک احتیاج ہے۔ معلوم ہے کہ پیٹ کا خلا بھرنے کے لیے کھانے کی احتیاج رکھی گئی ہے اور جب تک یہ خلا پُر نہ ہو، انسانی زندگی کی یہ گاڑی دو قدم نہیں چل سکتی۔ اللہ تعالیٰ ﴿ اَلصَّمَدُ ﴾ ہے، وہ ٹھوس ہے، اس میں خول نہیں اور جب خول نہیں تو کھانے پینے کی احتیاج بھی نہیں۔ لیکن حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں: پیٹ میں خلا ہے اور ساتھ اس خلا کو پُر کرنے کی احتیاج بھی، لہٰذا یہ دونوں الٰہ نہیں ہو سکتے، کیوں کہ الٰہ محتاج نہیں ہوتا۔ کھانے کی احتیاج ایک ایسی زبردست دلیل ہے جس نے عیسائی معتقدات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ لوگ الٰہ ہونے کی مختلف تاویلیں کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴾ [المائدۃ: ۷۵] دیکھیے اتنی واضح آیات آجانے کے بعد بھی یہ کہاں بہکائے جاتے ہیں؟ ﴿ ثُمَّ انْظُرْ ﴾: سے یہ بات متحقق ہوئی کہ قرآنی دلائل تو بے شک ان کی عقل کو اپیل کرتے ہیں، لیکن ایسے واضح دلائل کی موجودگی کے باوجود وہ ذہن کی کجی سے نکلنا نہیں چاہتے۔ آج کل عیسائی الٰہ کی جو مختلف تاویلیں اور توجیہیں کرتے ہیں، وہ بحسبِ ارشادِ قرآن، قران کی تصدیق ہی ہے: ﴿ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝٧٥ ﴾ یعنی جو بھی تاویل کی جائے گی، وہ ﴿ يُؤْفَكُوْنَ ﴾ بھٹکنے کے زمرے میں آجائے گی۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (22 مارچ 1968ء) مرتب: قاضی محمد عبداللہ صاحب (اسلامی دار المطالعہ گوجرانوالہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وفاتِ مسیح سے متعلق ایک شبہہ اور نفع ونقصان کا اختیار

﴿مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّى يُؤْفَكُونَ ﴿75﴾ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿76﴾﴾ [المائدة: ٧٥، ٧٦]

''مسیح ابن مریم نہیں ہیں مگر ایک رسول ہی۔ بلاشبہہ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ (نہایت راست باز) تھی، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھیں ہم ان کے لیے کیسی کیسی نشانیاں بیان کرتے ہیں، پھر دیکھیں وہ کدھر الٹے پھرے جاتے ہیں! (اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تمھارے لیے نقصان اور نفع کا کوئی اختیار نہیں رکھتی؟ اور اللہ ہی تو خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''

قادیانیوں کا ایک شبہہ اور اس کا جواب:

قادیانیوں نے اس آیت سے وفاتِ مسیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ان کا استدلال لفظ ﴿قَدْ خَلَتْ﴾ سے ہے اور معنی ومفہوم آیت کا یہ لیا ہے کہ جس طرح باقی رسول اپنے اپنے وقت پر آئے اور زندگی کا وقت گزار کر بالآخر پہلے رسولوں کی طرح موت سے ہمکنار ہوئے، اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام بھی ایک رسول ہیں، جو اپنے وقت پر آئے اور اپنی زندگی کا وقت گزار کر پہلے رسولوں کی طرح موت سے ہمکنار ہوئے۔

قادیانیوں کی یہ تاویل قرآن کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتی، وہ اس طرح کہ اس آیت میں سابقہ انبیاء کا ذکر بحیثیتِ رسالت کے ہوا ہے، یعنی تمام انبیاء اپنی اپنی امتوں کی طرف آئے اور

سب کی دعوت کا مقصد ایک ہی تھا؛ یہ توحید کی طرف دعوت تھی:

﴿ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ﴾ [الأعراف: ٥٩]

''اے قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔''

حضرت مسیح علیہ السلام بھی خاندانِ نبوت کے ایک فرد ہیں۔ ان کی دعوت بھی وہی ہے جو سابقہ انبیاء کی متفقہ دعوت تھی، اگر پہلے انبیاء الٰہ نہیں ہیں اور نہ انھوں نے الٰہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو پھر حضرت مسیح علیہ السلام کیونکر الٰہ ہو سکتے ہیں؟ اس آیت میں موت کا کہیں ذکر ہے نہ اس آیت سے مقصود انبیاء کی موت کا پیش کرنا ہے، بلکہ اصل چیز جو اس موقع پر قرآن نے پیش کی ہے، وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی نفی ہے۔

پھر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور فرمایئے: ﴿ خَلَتْ ﴾ یا ﴿ خَلَوْا ﴾ کے معنی موت ہی کے نہیں ہوتے۔ قرآن میں یہ لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور اس کے معنی بھی مختلف ہیں، مثلاً: پہلے پارے میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَیٰطِیْنِهِمْ ﴾ [البقرۃ: ١٤]

''اور جب یہ منافقین اپنے شیاطین کی طرف جدا ہوتے ہیں۔''

﴿ خَلَتْ ﴾ اور ﴿ خَلَوْا ﴾ کا مصدر ایک ہی ہے، یہاں ﴿ خَلَوْا ﴾ جدا ہونے کے معنی میں آیا ہے، موت کا معنی مراد نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ﴾ [آل عمران: ١٣٧]

یہاں بھی ﴿ خَلَتْ ﴾ موت کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ اس لیے سنن کا لفظ بطورِ نظیر پیش کیا گیا ہے۔ پہلی امتوں کے عادات اور اطوار کا امرِ الٰہی کا مقدر بننا، یہ تمام چیزیں قرآن نے واقعات کے طور پر بیان کی ہیں، تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو: ﴿ هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴾ [آل عمران: ١٣٨]

کیا اس بیان کو موت سے تعبیر کیا جائے گا؟ قادیانیوں نے قرآن کی اس آیت سے ایک ایسا مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی ہے جو بے محل اور بے موقع ہونے کے ساتھ اس آیت کے اندازِ بیان کے منافی بھی ہے۔ نیز قادیانیوں کا دعویٰ کہ ﴿ قَدْ خَلَتْ ﴾ کے معنی موت ہی کے ہیں، درست نہیں

ہے۔ نظائر اگر مرنے والی چیز نہیں تو پھر محض ایک لفظ کی کھینچا تانی کرنے سے بات کس طرح صحیح ثابت کی جا سکتی ہے؟

نفع ونقصان کا مالک صرف اللہ ہے:

﴿ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۚ ﴾ [المائدة: ٧٦]

''کہو! کیا تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو تمھارے کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں۔''

انسان کو دو چیزیں ودیعت کی گئی ہیں:

1 نقصان سے بچاؤ۔ 2 نفع کا حصول۔

دنیا کا تمام کاروبار ان دو چیزوں پر قائم ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ نقصان سے بچے اور فائدہ حاصل کرے۔ پہلے نقصان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، پھر نفع کے حصول کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات نقصان کی تلافی مشکل ہوتی ہے، گو بعد میں نفع بھی حاصل ہو جائے۔ ایک شخص لنگڑا ہو جائے یا اسے کوئی شدید عارضہ لاحق ہو جائے، اگرچہ بعد میں مال و دولت بھی حاصل ہو جائے، لیکن صحت کے نقصان کی تلافی ناممکن ہے۔ عام کاروباری زندگی میں بھی انسان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اسے بغیر کسی نقصان اور گھاٹے کے نفع حاصل ہو، اسی لیے پہلے وہ نقصان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضور ﷺ کے متعلق فرمایا:

﴿ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ ﴾

[الأعراف: ١٨٨]

''اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سا بھلا حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی تکلیف نہ پہنچتی۔''

انبیاء اور اولیاء بھی نصرتِ الٰہی کے محتاج ہیں:

نبی اکرم ﷺ کو اپنی زندگی میں کئی مقامات پر اپنے مخالفین کی اذیتوں کا شکار ہونا پڑا۔ جنگِ احد، صلح حدیبیہ اور دیگر مختلف مواقع پر خود حضور ﷺ کو، آپ کے رفقاء کو سخت پریشانی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس وقت پیش آمدہ تکلیف کو دور کرنے پر اللہ کی ذات کے سوا کوئی قادر نہ تھا۔ جنگِ احد کے موقع پر جو مسلمانوں کا وقتی نقصان ہوا، سب کو معلوم ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے سب سے بڑی تکلیف نبی اکرم ﷺ کا دنیا سے چلے جانا ہے، لیکن یہ صدمہ برداشت کیے بغیر چارہ نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کی خبر تمام اطراف و اکناف میں پھیل چکی ہے۔ صحابہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، دل شدتِ غم سے پھٹا جا رہا ہے اور دماغ اس اچانک صدمے کے باعث کچھ سوچنے سے قاصر ہے۔ گویا صحابہ کے لیے آج ساری دنیا تاریک ہے، مگر اس نقصان کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی۔

اولیاء اللہ تو خیر ایک کمتر درجہ ہے، نبی اکرم ﷺ کے بعد سب سے اعلیٰ درجہ آپ کے صحابہ کا ہے۔ بالخصوص حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین ایسے پائے کی شخصیتیں ہیں کہ سابقہ امتوں میں بھی اس پائے کے لوگ نہیں گزرے، لیکن بے بسی کی انتہا ہے، اپنے سامنے ایک نقصان دیکھ رہے ہیں، لیکن اس سے بچنے کی قدرت حاصل نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی تکفین و تدفین کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: ''آپ کے دل نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ اس مہبطِ وحی کو مٹی میں دفن کر دیا جائے؟''[1] یہ پوچھنا رنج و ملال کی انتہا ہے![2]



[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٦٢)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (29 مارچ 1968ء) مرتب: قاضی محمد عبداللہ صاحب (اسلامی دار المطالعہ گوجرانوالہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غلو اور اس کے اثرات

﴿قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٧٧﴾ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٧٨﴾ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾

[المائدة: ۷۷_۷۹]

”کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے ہیں، اور انھوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھی راہ سے بہک گئے۔ بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر ہوئے، ان پر داود اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو برے کام سے منع نہیں کرتے تھے، کیونکہ انھوں نے وہ خود کیا ہوتا تھا، بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے۔“

پہلی آیات میں یہود و نصاریٰ کی غلطیوں کا الگ الگ ذکر ہوا۔ یہ دونوں گروہ اہلِ کتاب ہیں۔ ان کتابوں میں جو تعلیم انھیں دی گئی تھی، وہ وہی تعلیم تھی جو سابقہ انبیاء اپنے اپنے وقت پر اپنی اپنی امتوں کو دیتے چلے آئے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جب تعلیم درست ہے اور انبیاء کی دعوت بھی صحیح ہے تو پھر عقیدے میں کھوٹ اور توحید میں شرک کی نجاست کہاں سے آ گئی؟ فرمایا: یہ غلو کا نتیجہ ہے۔

دین میں اعتدال ضروری ہے:

دین اعتدال کا نام ہے۔ یہ اعتدال جب تک برقرار ہے، ایمان صحیح اور درست ہے۔ اگر اعتدال میں بڑھاؤ پیدا ہو جائے تو یہ غلو ہے اور یہ اللہ کی اطاعت نہیں، بلکہ نفسانی خواہشات کی تعمیل ہے۔ اہلِ کتاب

کو اس مرض سے روکا گیا ہے، فرمایا: ''دین میں ناحق غلو نہ کرو۔'' ماں باپ کا ادب، استاد، شیخ، پیر، بزرگ سب کا ادب بجا ہے، لیکن یہ ادب حدِ اعتدال میں رہنا چاہیے۔ اعتدال سے اگر بڑھ گیا تو غلو ہو گا۔

﴿وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

[لقمان: ۱۵]

''اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے، جس کا تجھے علم نہیں، تو ان کی اطاعت نہ کرنا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ماں باپ کی اطاعت مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ اللہ اور رسول کی نافرمانی نہ ہو۔ استاد، شیخ، پیر، عالم اور امام سب کے لیے یہ شرط برقرار ہے۔

ناحق غلو کی مذمت:

فرمایا: ﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾ [المائدة: ۷۷]

﴿غَيْرَ الْحَقِّ﴾ کا معنی ''باطل'' ہے۔ حق کے مقابلے میں جو چیز ہو وہ باطل ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین کی پیروی میں غلو کر کے اپنے اعمال باطل نہ کرو۔ یہ کہنا غلط ہے کہ غیر الحق غلو تو جائز نہیں، البتہ جو غلو حق کے ساتھ ہو وہ جائز ہے۔ یہ اس لیے غلط ہے کہ غلو سارے کا سارا ہی باطل ہے۔

"غُلُوّ" آج بھی ہر طرف عام ہے۔ نبی کریم ﷺ کے عہدِ مبارک میں نماز کی طرف دعوت دینے کے لیے اذان مقرر ہوئی، پھر صبح کی اذان میں دو کلمات کا مزید اضافہ ہوا: "اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ" بس اس پر مزید اضافہ نہیں کیا گیا۔ اذان تو خود دعوتِ نماز ہے، اس پر مزید اضافے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن بعد کے لوگوں نے اذان کے بعد "يَا خَلِيفَةَ الْمُسْلِمِينَ" ''یا وزیر صاحب'' نماز کے خطابات نکال کر اپنی طرف سے مزید اضافہ کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ سعید میں ایک شخص نے اذان دی تو بعد میں کہا: "يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ اَلصَّلَاةَ اَلصَّلَاةَ"، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تو مجھے پاگل سمجھتا ہے؟ جب تم نے اذان دے دی اور میں نے اذان سن لی، اب یہ علاحدہ دعوتِ نماز کیسی ہے؟[1]

دین میں اس طرح کا غلو آپ نے برداشت نہیں کیا۔

[1] مصنف ابن أبي شيبة (۳۰۷/۱)

غلو کے نتیجے میں بدعات کا فروغ:

مصر میں جب فاطمیوں کو فتح حاصل ہوئی تو یہ لوگ غالی شیعہ تھے، ان لوگوں نے اذانوں میں صحابہ کرام پر تبرا شروع کر دیا۔ مساجد کے در و دیوار پر صحابہ کے نام کے ساتھ لعنت کے الفاظ رقم کیے گئے، ان لوگوں کے لیے یہ بھی تثویب ہی تھی۔

آج کل ہمارے اس دور میں بریلوی فرقے کے لوگوں نے اذان میں بہت کچھ اضافہ کر رکھا ہے۔ اذان سے پہلے اور اذان کے بعد کافی دیر تک ''الصلاۃ والسلام'' کی گردان کی جاتی ہے اور یہ لوگ بھی اسی مرض کا شکار ہیں، جس مرض سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کو روکا: ﴿يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾۔ حق وہ تھا جس کی نبی کریم ﷺ نے ہمیں تعلیم دی۔ غیر الحق یہ ہے جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ [المائدۃ: ۷۷] غلو کو ابھارنے والی چیز خواہشِ نفسانی ہے۔ اس قوم کی خواہشات کی پیروی مت کرو، جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔ ﴿وَضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ دین کا جو اصل صحیح راستہ تھا، وہ اس سے بھٹک گئے۔

ہویٰ پرستی کے مفاسد:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تھی، مگر اس قوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہنے کے بجائے اپنی اہواء کی اتباع کی۔ بت تراشے، بتوں کی پوجا کی، خود بھی گمراہ ہوئے اور قوم کے اکثر لوگوں کو بھی لے ڈوبے۔ ان کے نزدیک بتوں کی پرستش ہی اپنے آباء واجداد کا ادب تھا، کیوں کہ جن بتوں کی وہ پرستش کرتے تھے، وہ ان کے آباء کے ناموں سے منسوب تھے، ورنہ یہ بات وہ خود بھی جانتے تھے کہ بت کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں، پھر بھی انھوں نے ادب کا ایک فرضی معیار بنا رکھا تھا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہ تھا، بلکہ اپنی خواہشات کی پیروی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر

لبیک کہتے تو ﴿ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴾ ہوتا، لیکن انھوں نے اپنے پیغمبر کی بات کو ٹھکرایا اور خواہشِ نفس کے پیچھے لگ گئے۔ چنانچہ قرآن کے ارشاد کے مطابق وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلائے اور ہوائے نفس سے ہر مسلمان کو بچائے۔ آمین [1]



[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (12 اپریل 1968ء) مرتب: قاضی محمد عبداللہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاشرتی خرابی کی اصل وجہ

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾ [المائدۃ: ۷۸، ۷۹]

''بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر ہوئے، ان پر داود اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو برے کام سے منع نہیں کرتے تھے، کیونکہ انھوں نے وہ خود کیا ہوتا تھا، بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے۔''

تین الفاظ:

بعض الفاظ ایسے ہیں جن کی معنوی حیثیت تو ہمارے معاشرے میں مسلم ہے، لیکن جب ان الفاظ کی نسبت کسی معاشرے یا معاشرے کے کسی فرد کی طرف کی جائے تو معاشرہ اسے گوارا نہیں کرتا اور فرد اسے اچھا نہیں سمجھتا، حالانکہ یہ الفاظ معناً صحیح ہیں، مگر ظاہری اعتبار سے ناگوار گزرتے ہیں۔ ان الفاظ میں سے تین لفظ حسبِ ذیل ہیں: 1 کافر۔ 2 مشرک اور 3 ملعون۔

کافر:

کفر کا معنی انکار کرنا ہے اور اسلام کی اصطلاح میں جو لوگ حق کا انکار کرتے ہیں، انبیاء کی تعلیم پر ایمان نہیں لاتے؛ پیغمبروں کو جھٹلاتے ہیں، یہ لوگ کافر ہیں۔ معناً یہ لفظ درست ہے، لیکن آج کے معاشرے میں کسی ایسی قوم یا فرد کے متعلق، جو اس لفظ کا واقعی مصداق بھی ہو، بول کر دیکھیں، وہ ناگواری کا اظہار کرے گا۔ نماز ترک کرنا کفر ہے اور جو شخص بالکل بے عمل ہو، وہ عملاً انکار (کفر) کی شکل کا مرتکب ہے، لیکن کافر کہلانا یا سننا وہ ہرگز گوارا نہیں کرے گا۔

مشرک:

کاروبار میں شراکت کو کوئی بھی عیب نہیں سمجھتا، نہ اسے معاشرے میں گالی تصور کیا جاتا ہے، لیکن ایک شخص جب یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے تو اسے مشرک کہا جاتا ہے، جو معناً بالکل درست ہے۔ اب اپنے لیے ''مشرک'' کا لفظ سننا کوئی بھی گوارا نہیں کرتا، لیکن اس کے باوجود قبروں کی پرستش جاری ہے، اولیاء اللہ کے مزارات شرک کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں، اللہ کی اعانت کے ساتھ غیر اللہ سے بھی امداد طلب کی جاتی ہے، ان لوگوں سے حاجت روائی کے لیے بیسیوں کارخانے بھی بنا رکھے ہیں، لیکن مشرک کہلانا انھیں پسند نہیں، حالانکہ عملاً جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ شرک ہی ہے، لیکن الفاظ کی کڑواہٹ ایسی ہے جو دل کو بھلی نہیں لگتی۔

لعنت یا ملعون:

یہی حال لفظ ''لعنت'' کا ہے۔ لعنت کا معنی ہے: اللہ کی رحمت سے دور ہو جانا اور جو شخص فرائض کا تارک ہو، وہ یقیناً اللہ کی رحمت سے دور ہے۔ رحمت کا استحقاق تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں مضمر ہے، نہ کہ عصیان، تکبر اور کفر میں!

اب معناً یہ لفظ صحیح ہے، لیکن ایسے افراد جو عملاً خدا کے نافرمان ہیں اور فسق و فجور میں بے دریغ ہیں، انھیں اگر لعنتی کہا جائے تو وہ یہ لفظ سننا کسی طرح گوارا نہیں کریں گے۔ غالباً ہمارے انکار کی وجہ الفاظ کے معنی و مفہوم سے لاعلمی ہے، ورنہ عرب کفار اور مشرکین کے متعلق ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے یہ الفاظ اپنے حق میں سن کر انکار کیا ہو، اس لیے کہ وہ ان الفاظ کے معنی و مفہوم کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اگر عملاً حضور ﷺ پر ایمان نہیں لائے تو زبان سے بھی انھوں نے ایمان لانے سے انکار کیا ہے۔ یہی انکار کفر ہے اور اسی بنا پر انھیں کافر کہا گیا، لیکن آج کے مشرک مسلمان شرک کا ارتکاب تو کریں گے، لیکن مشرک کہلانا پسند نہیں کریں گے!

لعنت کے مستحق:

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، وہ لعنت کے مستحق ہوئے اور یہ لعنت کہیں باہر سے نہیں آئی، بلکہ خود ان کے گھر سے آئی: ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ

دَاوٗدَ وَعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ ﴾ ''بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، اُن پر حضرت داود اور عیسیٰ بن مریم علیہم السلام کی زبان سے لعنت کی گئی۔'' یہ لوگ رحمتِ الٰہی سے دور ہو گئے اور انبیاء کی زبان سے انھیں لعنت کا سرٹیفکیٹ عطا ہوا۔

فرمایا: یہ لعنت ویسے ہی نہیں ہے، اس کی وجہ تو کفر تھی، دوسرا یہ لوگ نافرمان تھے اور نافرمانی میں بھی حد سے بڑھ جاتے تھے: ﴿ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوۡا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ۝78 ﴾ ''عصیان'' ایسی نافرمانی کو کہتے، جو جان بوجھ کر کی جائے۔ بھول سے غلطی ہو جائے تو یہ بھی غلطی ہے، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ یہ کام غلط ہے، اللہ کے حکم کی نافرمانی کی جائے تو یہ ''عصیان'' ہے۔

لعنت کا سبب:

﴿ كَانُوۡا لَا يَتَنَاهَوۡنَ عَنۡ مُّنۡكَرٍ فَعَلُوۡهُ ؕ ﴾: ایک برا کام ہوتے دیکھ کر اس سے منع نہ کرنا، یہ معاشرے کی عام خرابی کا ذکر ہے کہ یہ لوگ جمود میں یہاں تک گزر گئے کہ ایک برا کام ہوتا دیکھتے تو ایک دوسرے کو منع کرنے کی جرأت نہ ہوتی، کوئی بھی دوسرے کو کہنا پسند نہ کرتا۔

جب کسی معاشرے میں برائی پر روک ٹوک نہ ہو تو معاشرے سے برائی کا احساس جاتا رہتا ہے اور احساس ناپید ہو جائے تو تباہی یقینی بن جاتی ہے۔ جس گھر میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ جاری ہے، وہاں سے خیر بالکل نہیں اٹھ جاتی۔ ہاں! جب انداز ایسا پیدا ہو جائے کہ ہمیں کسی کے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس انداز سے خیر کی توقع جاتی رہتی ہے۔

﴿ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ۝79 ﴾: بنی اسرائیل نے جو کام اختیار کر رکھے تھے، وہ بہت برے کام تھے اور ان میں خیر ناپید تھی۔ اسی لیے یہ لوگ لعنت کے مستحق ٹھہرے۔ خیر اٹھ گئی تو لعنت آ گئی۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (19 اپریل 1968ء) مرتب: قاضی محمد عبداللہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کفار سے دِلی دوستی کے نتائج

﴿تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَھُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓي اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ [المائدۃ: ۸۰۔۸۳]

’’آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جنھوں نے کفر کیا۔ بہت برا ہے جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے آگے بھیجا کہ اللہ ان سے ناراض ہو گیا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں۔ اور اگر ایسا ہوتا کہ وہ اللہ پر اور اس کے نبی پر اور اس پر ایمان لاتے جو اس کی طرف نازل کیا گیا، تو ان (کافروں) کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ نافرمان ہیں۔ (اے نبی!) یقیناً آپ لوگوں میں اہلِ ایمان سے عداوت رکھنے میں سخت ترین یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے، اور اہلِ ایمان سے دوستی رکھنے میں ضرور قریب ترین ان لوگوں کو پائیں گے جنھوں نے کہا: بے شک ہم نصاریٰ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بے شک ان میں کچھ عالم ہیں، کچھ دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے ہیں اور یہ کہ وہ غرور نہیں کرتے۔ اور جب وہ رسول پر نازل کیا گیا کلام سنتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ رہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب!

ہم ایمان لے آئے، لہٰذا تو ہمارے نام (حق کی) گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے۔''

اہلِ کتاب کی گمراہی کا دوسرا سبب:

اہلِ کتاب کے گمراہ ہو جانے کا جو پہلا سبب تھا، اس کا ذکر ہو چکا۔ اب اہلِ کتاب کی گمراہی کا دوسرا سبب بیان کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو کافروں کو اپنا دوست رکھتے تھے۔ یہاں اہلِ کتاب کی مجلسی زندگی کا ذکر ہے۔ انسانی زندگی میں مجلس کا اثر ایک دوسرے پر لازمی ہوتا ہے، مجلس اچھی ہو تو خیالات بھی اچھے ہوں گے اور اخلاق بھی بہتر ہو گا۔ اگر مجلس بری ہے تو اس کا اثر بھی طبائع پر برا ہی پڑے گا ؏

صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالح ترا طالح کند[1]

بری مجلس کا اثر:

ماں باپ اگر خود بری مجلس سے نہ بچیں تو اس کا اثر یہ ہو گا کہ اولاد بھی ان کے برے خیالات سے متاثر ہو گی۔ والدین اگر خود بااخلاق ہوں اور ہمیشہ اچھی مجلس میں بیٹھنے کے عادی ہوں تو اپنی اولاد کو بھی ہمیشہ بری مجلس سے بچے رہنے اور نیک مجلس اختیار کرنے کی تلقین کریں گے، جس سے بچوں میں نیکی و بدی کا امتیاز ہو گا، اخلاق سدھریں گے اور طبیعت میں نیکی کی طرف رغبت اور رجحان بڑھے گا۔

حضرت لقمان سے کسی نے پوچھا: آپ نے حکمت کہاں سے لی؟ کہا: بے وقوفوں سے! جو کام بے وقوف کرتے ہیں ان کاموں سے بچتا ہوں!

کیسا حکیمانہ جواب ہے! اگر برے لوگوں کی مجلس میں بیٹھو گے تو پھر برے خیالات سے بچنا مشکل ہے۔ چنانچہ اس بری مجلس کا اثر اہلِ کتاب پر بھی ہوا، کفار کی مجلس میں بیٹھ کر کفر کی باتیں سنتے ہیں، لیکن دل نہیں پسیجتا۔ قرآن نے فرمایا: ﴿ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ انھوں نے اپنی بدعملی کی بنا پر اپنے اللہ کو ناراض کر لیا۔ اللہ کی ناراضی ہدایت کا سبب نہیں ہوتی، بلکہ یہ چیز انسان کو کفر میں اور بھی دور لے جاتی ہے، جس کا نتیجہ بالآخر دائمی عذاب ہے۔ ﴿ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿٨٠﴾ ﴾ انھوں نے بری مجلس کا انتخاب کر کے اہلِ کفر کے ساتھ کفر کی جو راہ اختیار کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔

---

[1] ''نیک کی صحبت تجھے نیک اور بد کی صحبت تجھے بد بنا دے گی۔''

اہلِ کتاب کی دوغلی پالیسی:

بعض لوگوں کی پالیسی دوغلی ہوتی ہے اور بظاہر وہ صلح کن رہنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے کہ جس شخص کا اللہ اور اس کے رسول پر صدقِ دل سے ایمان ہے وہ توحید کے ساتھ کفر سے مفاہمت کس طرح کرسکتا ہے؟ ایک شخص مسجد میں نماز بھی ادا کرے اور شراب خانے میں شراب بھی پیے تو گناہ اور معصیت کی طرف اس کی یہ رغبت کیسے ممکن ہے؟

ایمان کے تین ستون:

﴿وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ ''اور اگر ایسا ہوتا کہ وہ اللہ پر اور اس کے نبی پر اور اس پر ایمان لاتے جو اس کی طرف نازل کیا گیا، تو ان (کافروں) کو دوست نہ بناتے۔''

اس آیت میں تین چیزوں کا ذکر فرمایا:

1. اللہ پر ایمان۔
2. حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان۔
3. حضور ﷺ کی وحی پر ایمان۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل ایمان وہی ہے جو ان تین ستونوں پر قائم ہو۔ اللہ پر ایمان کوئی معنی نہیں رکھتا، تو محض اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان لانے کا بھی کچھ فائدہ نہیں، اگر نبی کریم ﷺ کی طرف وحی کا انکار کر دیا جائے۔ یہ تین باتیں اگر کسی میں پیدا ہو جائیں تو ایمان کامل ہے ورنہ ناقص۔ اور ایمان کی تکمیل کے بعد پھر اس بات کی توقع ناممکن ہے کہ ایک مومن ایسی مجلس اختیار کرے جو خدا کی باغی ہو۔

مشرکین اور یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے دشمن ہیں:

فرمایا: آپ یہود اور مشرکین دونوں کو مسلمانوں کے حق میں عداوت کے لحاظ سے نہایت سخت پائیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نصاریٰ مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں؛ مطلب یہ ہے کہ عداوت دونوں طرف سے ہے، لیکن ایک کی عداوت میں شدت ہے، دوسرے میں نرمی، اس کی وجہ قرآن نے یہ بتلائی:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنۡهُمۡ قِسِّيۡسِيۡنَ وَرُهۡبَانًا وَّاَنَّهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴾ نصاریٰ میں عالم ہیں، صوفی ہیں اور یہ لوگ تکبر بھی نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہود اور مشرکین میں علم کی شدید کمی ہے اور زہد ناپید ہے۔ جہالت بھی ایک بہت بڑی خرابی ہے، اس کے ساتھ طمع و حرص ہو تو یہ نہایت خطرناک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں میں سودی کاروبار عام تھا، ان کا ذہن اور ہندو کا ذہن تقریباً ایک ہی جیسا ہے۔

نصاریٰ کے ایک گروہ کی تعریف:

یہاں قرآن نے نصاریٰ کے ایک خاص گروہ کی تعریف کی ہے، جن کی صفت ﴿ وَاِذَا سَمِعُوۡا ﴾ [المائدة: ۸۳] میں بیان فرمائی ہے۔ ﴿ الرَّسُوۡلِ ﴾ سے مراد حضور ﷺ ہیں۔ فرمایا: نصاریٰ میں ایک ایسا گروہ ہے جب وہ اللہ کا اتارا ہوا کلام رسول اللہ ﷺ سے سنتا ہے تو آپ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھتے ہیں، اس لیے کہ انھوں نے حق کو پہچانا۔

حق کسی چیز کا واقع کے مطابق ہونے کو کہتے ہیں۔ عیسائیوں کا حضرت مسیح کے متعلق جو عقیدہ تھا، وہ حقیقت اور واقع کے خلاف تھا۔ اس عقیدے پر نصاریٰ کا ایک گروہ غیر مطمئن بھی تھا، جب اس گروہ نے اللہ کا کلام، جس میں حضرت مسیح علیہ السلام کی حیثیت و مقام کا ذکر تھا، سنا تو یہ بات انھیں واقع کے مطابق نظر آئی تو انھوں نے حق کو پہچان لیا۔

شاہدین کا معنی:

﴿ فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ۝ ﴾ [المائدة: ۸۳] کے دو معانی ہیں: ایک تو یہ کہ ہم اس حق کے معاملے میں گواہی دینے کو تیار ہیں۔ بعض اوقات ماحول کے زیرِ اثر انسان ایک بات کو حق سمجھتا ہے، لیکن اس حق کی گواہی دینے سے احتراز کرتا ہے۔ یہ ماحول سے دباؤ کا قدرتی نتیجہ ہے کہ ہم عدالت میں کئی شہادتیں محض اس لیے نہیں دیتے کہ ہم فریقِ مخالف کی طاقت اور دباؤ سے ڈرتے ہیں۔ فرمایا: ''اے اللہ! ہمیں شاہدین میں لکھ لے۔'' یعنی اگر گواہی کا موقع آئے تو ہم علی الاعلان اس کلامِ حق کی تصدیق کریں گے۔

شاہد کا دوسرا معنی معاون اور مددگار ہے:

﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: ۲۳]

''اور اگر تم اس (قرآن) کے متعلق شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا تو تم اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو۔''

یہاں شہداء کا معنی مددگار ہے، ویسے گواہی میں بھی معاون کا معنی شامل ہے، جو شخص کسی کے حق میں گواہی دیتا ہے تو ایک لحاظ سے وہ اس کا معاون ہوتا ہے۔

ایمان کے متلاشی:

انسان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس کا حشر صالحین کی قوم میں ہو۔ جس انسان کے دل میں یہ خواہش ہو اور اس کے سامنے جب حق آئے تو وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دے، یہ کس طرح ممکن ہے؟

﴿وَمَا لَنَا لَا نُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ﴾: عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو عقیدہ تھا، اسے یہ گروہ خوب سمجھتا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی ساری زندگی جس تکلیف اور عسرت سے گزری، پھر صلیب پر ان کا لٹکایا جانا، یہ ایک اضطراب کی حالت تھی۔ وہ سمجھتے تھے یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ابن اللہ بھی ہوں اور سولی پر بھی چڑھائے جائیں؟ چنانچہ جب قرآن کا پیغامِ حق سنا تو فوراً ایمان لے آئے، گویا وہ پہلے ہی حق کے متلاشی تھے۔ اللہ نے انھیں یہ جزا دی کہ انھیں جنت میں دائمی زندگی عنایت فرما دی۔

ہاتھ پاؤں سے جو عمل سرزد ہو، اسے بدنی عمل کہتے ہیں۔ دل سے جو عمل کیا جائے، اسے نیت یا عقیدہ کہتے ہیں اور زبان کے عمل کو قول کہتے ہیں۔ فرمایا: ﴿فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوۡا﴾، یعنی اس حسنِ قول پر ہی انھیں جنت کا سرٹیفکیٹ دے دیا گیا۔

محسن کے معانی:

﴿وَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿85﴾﴾ محسن کے تین معانی ہیں:

1 حسنِ عمل۔

2. کسی پر احسان کرنا، جیسے: بھوکے کو کھانا کھلا دینا یا کسی کی ضرورت پوری کر دینا۔
3. «أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ»[1] ''تو اس طرح عبادت کرے گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر (اس یقین سے عبادت کرو کہ بے شک) وہ (اللہ) تجھے دیکھ رہا ہے۔''

یہ اس گروہ کا ذکر تھا جو سچائی کا متلاشی تھا اور جب سچائی کو پا لیا تو اسے دل سے قبول بھی کیا، اس کے بالمقابل ایک دوسرا گروہ وہ ہے جن کا کام حق کا انکار اور قرآن کی تکذیب کرنا ہے، ان لوگوں کا حقانیت سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ لوگ ماحول کے دباؤ یا آباء واجداد کے مذہب کی بنا پر حق سے دشمنی کرتے ہیں، ایسے لوگوں کی جزا جہنم ہے۔[2]



[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨)
[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (10 مئی 1968ء) مرتب: قاضی محمد عبداللہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حلال اور طیب کھانے کی تاکید

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُحَرِّمُوۡا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیۡۤ اَنۡتُمۡ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ ﴾ [المائدۃ: ۸۷، ۸۸]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! وہ پاکیزہ چیزیں حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور تم حد سے نہ گزرو، بے شک اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اللہ نے تمھیں جو حلال پاکیزہ رزق دیا ہے اس میں سے کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔''

اسراف اور تکلف کی ممانعت:

جیسے یہود و نصاریٰ میں غلو کا عقیدہ اور اس کی مذمت کا ذکر ہو چکا ہے، اہلِ ایمان کو بھی اس طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اللہ نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے، ان سے بے رغبتی کرنا، یہ بھی غلو ہے۔ حلال چیزیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، اہلِ ایمان کو ان کی قدر کرنی چاہیے، نہ کہ کفرانِ نعمت!

ہاں، اسراف اور تکلف سے بچنا ضروری ہے۔ اگر کسی شخص میں نفیس کپڑا پہننے کی توفیق نہیں تو قرض لے کر کپڑوں کی نمایش نہ کی جائے۔ اچھی خوراک کھانے کی طاقت نہیں تو پرتکلف کھانوں میں اپنی قلیل پونجی کو ضائع نہ کیا جائے۔ اسراف اور تکلف کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ فرمایا: ﴿ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۸۷﴾ ﴾ جیسے یہ دونوں (اسراف اور تکلف) چیزیں بری ہیں، اسی طرح طاقت وتوفیق کے ہوتے ہوئے کفرانِ نعمت کرنا بھی برا ہے۔

حلال چیزوں کے ساتھ ''طیبات'' کی قید لگائی گئی ہے۔ حلال اور طیب، دونوں شرطیں صحیح

ہوں تو بھی ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ حرام اور حلال کی حدیں اللہ نے متعین کر دی ہیں۔ اہلِ ایمان کو حکم ہے کہ ان حدود کا خیال رکھا جائے اور انھیں توڑنے کی کوشش نہ کی جائے۔

طیب کا مفہوم:

"طَیِّبٌ" حلال کی صفت ہے۔ طیب کا معنی لذیذ، صاف ستھری اور پاکیزہ چیز ہے۔ بعض وقت ایک چیز حلال تو ہوتی ہے، لیکن طیب نہیں ہوتی، جیسے دریا کا پانی پاک ہے، لیکن جب دریا میں طغیانی ہو تو مٹی اور جھاگ کی بنا پر یہ پانی پینے کو دل نہیں مانتا، جس کا معنی یہ ہے کہ پانی تو پاک ہے، لیکن طیب نہیں۔ موسمِ برسات میں کنویں عموماً بند رہتے ہیں جس سے پانی میں بو پیدا ہو جاتی ہے۔ پانی تو حلال ہے، لیکن بو کی وجہ سے طیب نہیں رہا۔

رزق کے ذرائع:

اللہ نے جو رزق اتارا ہے، اس میں حلال اور طیب رزق تلاش کرنا چاہیے۔ ذرائع دو قسم کے ہیں: جائز اور ناجائز۔ جائز ذرائع کو بروئے کار لانا، یہ حلال طریقہ ہے اور ناجائز طریقوں سے بچا جائے۔

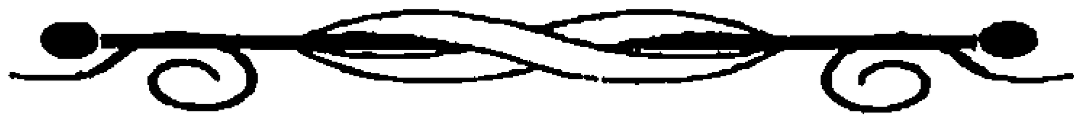
﴿ وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ﴾: رزق کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے لیے وہی رزق کھانا درست ہے جسے اللہ نے تمھارے لیے حلال قرار دیا ہے۔ زمین کی تمام پیداوار ضروری نہیں کہ حلال ہی ہو، حلال صرف وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔

رزق ملنے پر اللہ کا تقویٰ اور شکر ادا کرنا:

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴾: ایمان ایک مومن کے لیے وجہِ تسلی ہے۔ فرمایا: جس ذات پر تم ایمان لائے ہو، اگر یہ ایمان فی الواقع تمھارے لیے وجہِ تسلی ہے تو پھر اللہ سے ڈرو۔

ایمان میں ضعف ہو تو دل غیر مطمئن رہتا ہے، پھر خشیتِ الٰہی کہاں سے آئے؟ رزقِ حلال کے بعد ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ کہہ کر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ تمھارا کام بس اتنا ہی نہیں کہ اللہ کی پیدا کردہ حلال اور طیب چیزوں سے فائدہ اٹھا لینا اور اس کے بعد یادِ الٰہی سے غافل ہو جانا!

فرمایا: اب نعمتوں کا حق ادا کرنا تمھارے ذمے ہے۔ سب سے بڑا حق یہ ہے کہ تم کسی پر ظلم نہ کرو۔ مال و دولت کی فراوانی، عموماً سرکشی اور ظلم کا باعث ہوتی ہے اور اس دولت کے سہارے انسان بہت کچھ کر گزرتا ہے۔ فرمایا: اللہ سے ڈرو، رزق دیا ہے، دولت دی ہے تو اب دوسروں پر ظلم و زیادتی مت کرو۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (24 مئی 1968ء) مرتب: قاضی محمد عبداللہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شراب اور جوئے کی حرمت کے وجوہ

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ ﴾ [المائدة: ۹۰-۹۲]

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک شراب اور جوا، آستانے اور فال نکالنے کے تیر، سب گندے کام ہیں اور شیطان کے عمل سے ہیں، پس تم ان سے بچو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ بے شک شیطان چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے سے دشمنی اور بغض ڈال دے، اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے، پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟ اور تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، اور احتیاط کرو، پس اگر تم حق سے پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول پر تو صرف کھول کر پہنچا دینا لازم ہے۔“

شراب اور جوئے کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ تم رکتے ہو یا نہیں؟ ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ میں ایک شدید قسم کی ڈانٹ ہے کہ آیندہ ایسی غلطی ہرگز نہ ہو۔

شراب کی مذمت کا سبب:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شراب کو اسلام نے اتنی اہمیت کیوں دی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے جو سب سے بڑی دولت دی ہے، وہ عقل ہے۔ عقل ہی سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ علم کا استعمال بغیر عقل ناممکن ہے۔ ایک پڑھا لکھا انسان اگر فاتر العقل ہو جائے تو اس کا علم برباد

ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کا مال، یعنی دولت یہ بھی عقل کے بغیر بے کار ہے۔ عقل ہی ہے جو مال کی حفاظت کرتی ہے۔

ایک دولت مند انسان محض دماغ ماؤف ہو جانے سے اپنی ساری دولت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس لحاظ سے دین و دنیا، دونوں کی حفاظت کے لیے عقل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور شراب کی مضرت یہ ہے کہ اس کا سب سے پہلا حملہ عقل ہی پر پڑتا ہے، جب عقل سلامت نہ رہی تو دین کب سلامت رہا؟

شراب کا گناہِ عظیم:

شراب کی حرمت کے ضمن میں قرآن کا یہ ارشاد بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے: ﴿اِثۡمُهُمَاۤ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا﴾ [البقرۃ: ۲۱۹] شراب اور جوا، ان کا گناہ، نفع کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ یہاں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ قرآن نے نفع کے مقابلے میں نقصان کا ذکر نہیں کیا، بلکہ گناہ کا ذکر فرمایا ہے، جو لفظِ ''اثم'' سے ظاہر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام دنیا کے نفع کا دنیا کے نقصان سے موازنہ نہیں کرتا، بلکہ دنیا کے ''قلیل نفع'' کا آخرت کے ''عظیم نقصان'' سے مقابلہ کرتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ شراب میں خواہ ہزاروں فوائد پوشیدہ ہوں، وہ سب فائدے آخرت کے عظیم نقصان کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔

''اثم'' کے معنی گناہ ہیں، یعنی ہر وہ چیز گناہ ہے جس میں اللہ کے حکم کی نافرمانی ہو، لہٰذا دنیوی فوائد کے مقابلے میں اور کوئی نقصان ہو یا نہ ہو، آخرت میں گھاٹا اور گناہ کی فردِ جرم ضرور نقصان دہ ہے اور مومن کو اپنی نگاہ دنیا کے فائدے پر نہیں، آخرت کے نفع و نقصان پر مرکوز رکھنی چاہیے۔

اطاعت کا حکم:

﴿وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاحۡذَرُوۡا ۚ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ۝۹۲﴾ [المائدۃ: ۹۲]

تمام علوم کا سرچشمہ ذاتِ الٰہی ہے۔ پیغمبر کا علم اللہ کے علم سے ماخوذ ہے، جبکہ اطاعت ہر دو کی فرض ہے۔ معجزہ پیغمبر کے اپنے اختیار و قدرت میں نہیں، بلکہ صرف ذاتِ الٰہی کی قدرت میں ہے، اسی لیے

تو بعض وقت منکرین نے یہ اعتراض کیا: ﴿ لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ ﴾[طٰہٰ: ۱۳۳] پیغمبر معجزہ کیوں نہیں لاتا؟ معجزے کا لانا پیغمبر کے اپنے اختیار میں نہیں، بلکہ موقع ومحل کی مناسبت اور امرِ الٰہی سے اس کا صدور ہوتا ہے۔

پیغمبر کے علم کا ماخذ چونکہ ذاتِ الٰہی ہے، اس لیے پیغمبر کی اطاعت بھی ایسے ہی فرض ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت فرض ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے، پیغمبر اس کی تشریح وتبیین کرتا ہے، جس طرح قرآن کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے الہام ہیں، اسی طرح پیغمبر کی حدیث ''وحیِ غیر متلو'' ہے، جو پیغمبر کی زبان سے ادا ہوتی ہے۔

حجت صرف کتاب وسنت ہے:

پہلے اللہ کی اطاعت کا حکم دیا، پھر حضورِ اکرم ﷺ کی اطاعت کا، پھر ان دونوں کی مخالفت سے بچنے کا حکم دیا۔ پیغمبر کی ذات کے سوا اللہ نے اور کسی کے لیے یہ ضمانت نہیں دی کہ اس کا ہر قول امت کے لیے حجت ہو۔

ائمہ اور محدثینِ کرام عظیم شخصیتیں ہیں۔ یہ وہ پاکباز لوگ ہیں جن کی وساطت سے حضور اکرم ﷺ کا دین امت تک پہنچا۔ ان کے قول وفعل کی بھی اللہ نے ضمانت نہیں دی، بلکہ فرمایا کہ اللہ کی اطاعت کرو اور ﴿ الرَّسُولَ ﴾ یعنی حضور ﷺ کی اطاعت کرو، ان دونوں کے حکم کے خلاف اگر کوئی بات ہو تو ﴿ وَاحْذَرُوا ﴾ اس سے بچو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایسا قول وفعل یا حکم، جو اللہ اور رسول کے احکام سے ٹکرائے، رد کر دینے کے لائق ہے۔ ائمۂ دین کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ بیسیوں مسائل میں ان کا باہمی اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ چاروں کا اختلاف چاروں کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ حق صرف ایک ہے اور ان اختلافات میں اصل کسوٹی اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول ﷺ کو قرار دیا ہے۔

یہود ونصاریٰ کی بغاوت:

مشرک سب سے پہلے اللہ کی اطاعت کا باغی ہے۔ یہود ونصاریٰ، جن کی غلطیوں کا پہلے الگ الگ ذکر ہوا، اللہ کی اطاعت سے منحرف ہو گئے۔ اللہ کا فرمان یہ تھا: ﴿ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ﴾ [المائدۃ: ۷۵] کہ مسیح ابن مریم علیہ السلام صرف اللہ کے رسول ہیں، انھیں ''ابن اللہ'' کہنا غلط

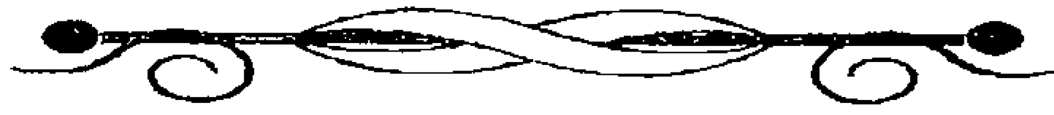
ہے۔ دونوں گروہ اس صریح حکمِ خداوندی سے پھر گئے اور ہر ایک نے اپنے پیغمبر کو خدا کا بیٹا کہا۔

اطاعتِ الٰہی کے بعد ان پر دوسرا فریضہ اطاعتِ رسول کا تھا۔ اس سے بھی انھوں نے بغاوت کی راہ اختیار کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی اپنی امت کو یہ تعلیم تھی:

﴿ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ ﴾ [الصف:٦]

''اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے۔''

حضرت مسیح علیہ السلام نے صاف اور صریح الفاظ میں اپنے رسول ہونے کا اعلان کیا اور دونوں مقام پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے گریز اور نافرمانی سے بچنے کی تلقین کی گئی، مگر اسے انھوں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ مشرکین کی یہی تو کج فہمی ہے کہ اللہ کی اطاعت سے گریز، پیغمبر کی اطاعت سے فرار اور بزرگوں کو خدائی مسند پر لا بٹھانا![1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (17 مئی 1968ء) مرتب: قاضی محمد عبداللہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اخلاق النبی ﷺ

﴿ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۤءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ ﴾ [الصف: ٦]

''(لوگو!) یقیناً تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آ گیا ہے، اس پر تمھارا تکلیف میں مبتلا ہونا گراں (گزرتا) ہے، وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) حریص ہے، مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے۔''

یہ آیت سورت توبہ کی آخری آیات میں سے ہے۔ سورت انفال اور توبہ کا زمانۂ نزول قیامِ مدینہ کا آخری دور ہے۔ مکہ میں مسلمان کمزور تھے، طاقت و اختیار ہاتھ میں نہ تھا، لیکن مدینے میں حالات اس کے برعکس تھے، اگرچہ قیصر و کسریٰ جیسی عظیم طاقت تو ابھی نہ بن سکے تھے۔ اس آیت کے نزول کے وقت کچھ درمیانی سی صورتِ حال تھی، اسلام میں اس وقت ہر طاقت سے ٹکرانے کی قوت تھی نہ ضرورت و اصول۔

طریقۂ تبلیغ:

اسلام کا موقف یہ نہ تھا کہ ہر مسئلہ جنگ ہی سے حل کیا جا سکتا ہے، بلکہ: ﴿ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ﴾ [النساء: ٦٣] تبلیغ کے لیے مناسب الفاظ، دلنشین انداز اور گفتگو ایسی ہونی چاہیے کہ دل میں اتر جائے۔ ٹھیس لگانا اور طعن و تشنیع وغیرہ سے منع فرمایا، یعنی اندازِ گفتگو باعثِ تنفر نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کو ستانے یا تنگ کرنے کی غرض سے قوت کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا، ہمیشہ رحم دلی اور نرمی اختیار کی اور اس کی تلقین بھی کی۔ آپ ﷺ ہی کا ارشاد ہے:

((مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ، يُحْرَمِ الْخَيْرَ كُلَّهُ))[1]

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٩٢) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٨٠٩)

''جو شخص نرمی سے محروم کر دیا گیا، وہ ہر قسم کی بھلائی سے محروم کر دیا گیا۔''

لیکن اس نرمی کو بزدلی کبھی بننے نہیں دیا، مرعوبیت کو کبھی راہ نہیں دی۔ جہاں بھی اور جس وقت بھی قوت کے مظاہرے یا استعمال کی ضرورت محسوس ہوئی، وہاں اس کو حکیمانہ انداز میں استعمال کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں 82 جنگیں لڑیں، ان میں سے 23 جنگوں میں آپ ﷺ بنفسِ نفیس شامل ہوئے اور 13 جنگیں ان میں سے بڑی اہم اور یادگار ہیں۔قوت کا اظہار و مظاہرہ ممنوع نہیں ہے، لیکن اس کو صرف ایک نیک اور پاکباز انسان کی طرح استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

شرک:

دنیا میں جب انسانی عقائد بدل جاتے ہیں، توحید کی جگہ شرک آ جاتا ہے اور انبیاء کی اطاعت اور آخرت پر یقین ختم ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس ظلمت اور اندھیرے کو ختم کرنے کے لیے انبیاء مبعوث فرماتے رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل مکہ میں بت پرستی عام تھی، اس قدر زیادہ کہ خدا کا گھر بھی بتوں سے بھر دیا گیا تھا۔ جنگل کا قانون رائج تھا۔ کمزور، غریب، مسکین؛ طاقت ور کے رحم و کرم پر تھے۔ عقائد اور اخلاق، دونوں پر ظلمت چھا چکی تھی۔ بیت اللہ جیسی جگہ کے خدمت گزاروں کے عقائد و اخلاق کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

ان حالات کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بھیجا۔ آپ ﷺ نے قوم کے حالات کی اصلاح ہر ممکن طریقے سے کی، اس کام کا آغاز آپ نے عقائد کی اصلاح سے کیا اور ان میں انسانیت کو اجاگر کیا۔ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝﴾ [التین: ٤] اس کائنات میں انسان سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

دو راستے:

بحیثیتِ مجموعی انسان تمام مخلوق سے اشرف ہے۔ فرشتے پاکباز ہیں، لیکن ان کا گناہ سے سابقہ ہی نہیں پڑتا۔ بھوک، جنس کا تعلق اور برائی کے دوسرے محرکات سے ان کا کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا۔ برائی کا کوئی بھی دروازہ ان کے سامنے کھلتا ہی نہیں ہے، اس لیے انسان سے ان کے مقابلے کا کوئی معنی ہی نہیں ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ ایک آدمی نابینا ہے، وہ نظر کی برائی سے محفوظ ہے، لیکن اس میں اس کی کوئی خوبی تو نہیں ہے۔ انسان کے مزاج میں نیکی اور برائی کی کشش رکھی گئی ہے، اختیار وقوت دیے گئے ہیں۔ ﴿ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ ﴾ [الدھر: ۳] انسان میں نیکی اور برائی، دونوں جذبات رکھے گئے ہیں، بے تکلف نیکی اور گناہ کر سکتا ہے۔ اب انسان کا اپنا وتیرہ ہے کہ وہ ﴿ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴾ [التین: ۵] کا مصداق بننا چاہتا ہے یا ﴿ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴾ کا حق دار۔

① اسلوبِ دعوت:

رسول اللہ ﷺ نے اصلاح اور سدھار کا جو طریقہ اختیار فرمایا، وہ حکمت کے تقاضے کے بالکل مطابق تھا۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے شرک سے اجتناب کی تلقین کی کہ خدا کے سوا کوئی مسجود نہیں ہے، اس کے سوا کسی کے آگے مت جھکو۔ اس تبلیغ پر اس وقت کی دنیا نے بڑے تعجب کا اظہار کیا: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ ﴾ [صٓ: ۵] لیکن یہ تعجب آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور لوگ قولِ بلیغ سے متاثر ہوتے گئے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ کے قریب فرزندانِ توحید جمع ہو گئے تھے، یہ اسی قولِ بلیغ کا اثر تھا۔

تبلیغ کے لیے کس طرح کوشش کی جاتی تھی، اس کا اندازہ نجد کے رئیس ثمامہ کے واقعہ سے لگائیے:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو پکڑ کر لے آئے اور مسجدِ نبوی کے ستون سے باندھ دیا گیا۔ ہر روز نبی کریم ﷺ دریافت فرماتے: ((مَا عِنْدَكَ يَا ثُمَامَةُ؟)) ''ثمامہ! کیا کہتے ہو؟'' وہ جواب میں یہی کہتا رہا: اگر آپ چھوڑ دیں گے تو آپ کا احسان ہے، اگر قتل کر دیں گے تو میری قوم بدلہ لے گی۔ تیسرے دن آپ ﷺ نے اس کو کھول دیا۔

ان تین دنوں میں وہ قرآن مجید سنتا رہا، اس کا اثر یہ ہوا کہ تیسرے روز رہائی کے بعد غسل کر کے واپس آیا اور مسلمان ہو گیا۔[1]

عربوں سے لڑائیاں ہوتی رہیں، لیکن اس کے باوجود ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جاتا تھا کہ قرآن مجید کی آواز ہر کان میں پڑ سکے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٧٢)

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ٦] اگر مشرکین میں سے کوئی اکیلا آ جائے تو اس کو پناہ دی جاتی تھی، حتیٰ کہ وہ کلامِ الٰہی سنتے، اس کے اثرات بڑے بہتر ہوئے اور شرک ختم ہو گیا۔ توحیدِ باری تعالیٰ کے متعلق کوئی رعایت نہیں کی۔

عقائد کے معاملے میں اسلام میں کوئی لچک نہیں ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کو سجدہ جائز نہیں ہے۔ غور کیجیے! کہاں ایک بت اور کہاں ایک رسول؟ رسول اللہ ﷺ کا مقام بڑا بلند ہے، لیکن توحید کے معاملے میں رعایت نہیں دی۔ سجدہ کسی کے لیے جائز نہیں، اس معاملے میں لچک، رعایت، جھکاؤ سے منع فرمایا: ﴿ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ ﴾ [القلم: ٩]، ''وہ چاہتے ہیں کہ آپ (کچھ) نرم پڑیں تو وہ بھی نرم پڑ جائیں۔'' ﴿ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ [هود: ١١٣] ''اور تم ان لوگوں کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا۔''

دوسرے یہ کہ عبادت کی تلقین کی۔ خود رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا: ﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ [الحجر: ٩٩] ''اور آپ اپنے رب کی عبادت کریں، حتی کہ آپ کے پاس یقین (موت) آ جائے۔''

② عبادات:

ہجرت سے دو سال قبل نماز فرض، سنن اور نوافل کا تعین فرمایا۔ نماز میں کیا پڑھنا ہے، اس کے متعلق ہدایات دیں۔ نمازِ پنج گانہ خود ادا کر کے بتائی۔ دعا، قراءت، سلام، رکوع، سجود وغیرہ، سب پڑھ کر بتایا۔ ان میں کسی تبدیلی کی اجازت نہیں ہے۔

فجر اور جمعے کے دو فرضوں کے بجائے کوئی چار پڑھنا چاہے یا ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ'' کی جگہ درود اور درود کی جگہ ثنا پڑھنا چاہے، اس کی اجازت نہیں اور عقل کا بھی تقاضا یہی ہے۔ بالکل اسی طرح کہ کوئی آدمی پاجامہ سر پر باندھنے کی کوشش کرے اور پگڑی کو تہبند کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرے، تو یہ کم عقلی ہی ہو گی۔

انکارِ حدیث:

انکارِ حدیث کی تحریک بھی بے عقلی کی تحریک ہے۔ ان لوگوں نے دین کے مزاج کو سمجھا ہی

نہیں ہے۔ قرآن اور رسول اللہ ﷺ کا کیا تعلق ہے، اگر یہ سمجھ لیا جاتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ ان لوگوں نے حدیث کو چھوڑ کر قرآنِ مجید سے نماز کا تعین شروع کیا، لیکن آج تک کوئی امر طے نہیں ہو سکا۔ نماز کے اوقات، تعدادِ رکعات اور وظائف، کوئی چیز بھی طے نہیں ہو سکی اور احادیث کو عجمی سازش بتانے والے آج تک جھگڑ رہے ہیں۔

③ معاملات:

تیسرے معاملات ہیں۔ اس کے لیے چند اصول دیے ہیں: دھوکا دہی نہ کرو، وعدہ خلافی نہ کرو، طے شدہ امور میں کمی بیشی نہ کرو۔ چند اصولی ہدایات دی ہیں، لیکن آپ کاروبار کس طریقے سے کریں؟ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جو کھاتے ہو کھاؤ، جو پہنتے ہو پہنو، لیکن اسراف اور تبذیر نہ کرو۔

سیاست میں جو معاملہ دشمن کرے، وہ تم کرو، لیکن عہد شکنی نہ کرو۔ صلح کا پیغام آ جائے تو لڑائی بند کر دو۔ دشمن اکیلا آ جائے یا جماعت کی صورت میں آئے، اس کو پناہ دو۔ کلمہ پڑھنے والے کی جان کی حفاظت کرو۔ تمھاری نوکِ شمشیر کے عین سامنے بھی اگر وہ کلمہ پڑھ کر سنائے تو اس کو نقصان مت پہنچاؤ۔

یہ حکیم نبی اور حکیم دین کی تعلیمات ہیں۔ آپ ﷺ نے دس سال مدینے میں اس حکمت سے کام کیا کہ حالات بالکل بدل گئے اور یہ حالت اس وقت تک قائم رہی، جب تک صحابہ موجود رہے۔ ہماری حالت کیا ہے؟ اخلاقِ محمدی ﷺ کہاں ہیں؟ ہماری زبانوں سے کیا نکل رہا ہے؟ علامہ اقبال نے کیا خوب خواہش کی ہے کہ یا الٰہی! اول تو میرا حساب نہ کرنا اور اگر ایسا کرنا ہے تو ؏

از نگاہِ مصطفیٰ ﷺ پنہاں بگیر [1]

اسلام نے اعمال میں ایک پروگرام دیا ہے، رسول اللہ ﷺ کو فرمایا:

﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ ﴾ [الشوریٰ: ۵۲]

''آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟''

چالیس سال تک تو یہ صورت تھی۔ ایک عام شریف انسان کی زندگی بسر کی۔ چالیس سال کے

[1] مصطفیٰ ﷺ کی نگاہ سے اوجھل رکھنا۔

بعد ایمان کی حدود واضح ہوئیں۔اس کے بعد بائیس سال میں کبھی یہ حدود بارگاہِ رسول اللہ ﷺ سے محو نہیں ہوئیں۔اسلام پر عمل کسی خاص موسم یا خاص دن سے تعلق نہیں رکھتا،اس کے لیے کوئی ایک دن یا مہینا مقرر نہیں ہے، بلکہ ہر وقت دل میں خدا کا خوف اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ہونی چاہیے اور عمل میں خدا کے وفادار اور غلام اور اس کے برگزیدہ رسول و نمایندہ کا اتباع ہونا چاہیے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (18 اگست 1967ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اتفاق و اتحاد کی راہیں

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿128﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿129﴾﴾ [التوبة: ١٢٨_١٢٩]

''(لوگو!) یقیناً تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آ گیا ہے، اس پر تمھارا تکلیف میں مبتلا ہونا گراں (گزرتا) ہے، وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) حریص ہے، مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے۔ پھر بھی اگر وہ پھریں تو کہہ دیجیے: مجھے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور وہی عرشِ عظیم کا رب ہے۔''

اجتماعیت کی ضرورت:

ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں، جس میں اجتماعیت کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ وقت ایسا ہے کہ مسلمان سر جوڑ کر مل بیٹھیں اور اپنی اجتماعی، قومی، وطنی، ملی ضرورتوں کو سوچیں۔ اختلاف دنیا میں رہا ہے، رہے گا، اس کا کلی طور پر اُٹھ جانا بظاہر مشکل ہے۔ ان حالات میں مختلف گروہ اور جماعتیں اس اختلاف کی موجودگی میں بھی اپنے مشترک اور اجتماعی مسئلوں پر سوچنے کے لیے ملیں تو ملک کی خوش قسمتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کا بھی اس میں فائدہ ہے۔

آپ دنیا اور دنیا پرست لوگوں کے حالات کو دیکھیں۔ وہ آپس میں انتہائی مخالفت، مخاصمت اور دشمنی کے باوجود مشترک کاموں میں اکٹھا سوچتے ہیں۔ دنیا کے دو طاقت ور گروہ: رشیا اور مغرب؛ آپس میں سب جانتے ہیں کہ باہم بے حد رقابت ہے، دشمنی ہے، لیکن اس کے باوجود جب کوئی ایسا مسئلہ آئے، جس کا اثر دونوں پر پڑے تو ان کے بڑے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، سوچتے ہیں، کوئی نہ کوئی

حل نکالتے ہیں۔ ہمارا اس ملک میں یہ حال ہے کہ روز بہ روز اجتماعی مسائل بڑھ رہے ہیں۔ یہ ضرورت روز بہ روز زیادہ ہو رہی ہے کہ ہم اپنے مسائل کو سر جوڑ کر سوچنے کی کوشش کریں۔ سیاسی حالات، بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات، اندرون مسلم ممالک کے بعض مسئلے، ہندوستان، افغانستان کی غلط روی؛ یہ ایسے مسائل ہیں، جو صرف حکومت پر نہیں، ہم لوگوں پر بھی کسی نہ کسی مقام پر ان کا اثر ہوتا ہے اور ان چیزوں پر سوچنے کے لیے ایک اجتماعی دماغ اور ذہن ہونا چاہیے۔لیکن اسے بدنصیبی سمجھیے کہ اس وقت تک ملک میں کوئی ایسی صورت نہیں پیدا ہوسکی کہ مختلف لوگ اکٹھا سوچنے کی کوشش کریں۔

سیاسی مسائل تو بڑی بات ہے، معمولی فروعی مسائل، فقہی مسائل اور اس سے زیادہ کچھ ایسے مسائل جن میں اگر ذرا تحقیق اور سوچ سے دیکھا جائے تو الفاظ کی ہیر پھیر کے سوا اختلاف کی کوئی بنیاد نہیں۔ ہم ان چند لفظوں کی ہیرا پھیری میں اتنا بگڑتے ہیں کہ ایک دوسرے کو گوارا نہیں کرتے۔ آپ مجھے برداشت نہیں کرتے، میں اور دوستوں کو برداشت نہیں کرتا۔ یہ ملک کی بدقسمتی ہے اور اس معاملے میں تعجب انگیز صورت یہ ہے کہ ان اختلافات میں وہ لوگ پیش پیش ہیں، جن کو اتحاد کی دعوت میں پیش پیش ہونا چاہیے تھا، میری مراد اس سے حضرات علمائے کرام ہیں۔

غیر مسلموں کو دعوت:

ہماری ابتدائی زندگی سے یہ اتحاد کی دعوت مساجد کے مقام سے ہوئی ہے۔ مختلف اسلامی گروہوں کو ہی نہیں، بلکہ غیر مسلموں کو مساجد میں دعوت دی گئی ہے:

﴿ يَآاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا ﴾ [آل عمران: ٦٤]

''اے اہلِ کتاب! ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔''

حضرت محمد رسول اللہ (ﷺ) کی مبارک زبان سے مدینے کے منبر سے یہ آواز اسلام کے دشمنوں اور اُن مخالفین کو دی گئی، جن کے ساتھ اساسی اختلافات تھے۔ان کو بھی فرمایا ہے کہ ﴿ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ﴾ کہ اجتماعی مسائل جو ہمارے اور آپ کے یکساں ہیں، ان پر سوچنے

کے لیے آؤ۔ ﴿ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا ﴾ خدا ایک کی عبادت اور اس میں شرک کی نفی؛ اس پر ہم دونوں اور مختلف لوگ مل کر باہم سوچنے کی کوشش کریں۔ یہ آواز سب سے بڑے منبر اور ایسے پاکباز انسان کی زبان سے نکلی، جس سے بڑا آدمی اور زیادہ پاک باز ساری دنیا میں کوئی نہیں۔ صَلَّى اللّٰهُ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ.

اگر آنحضرت ﷺ یہ دعوت دے سکتے ہیں اور اس دعوت کے مخاطب یہود اور نصاریٰ کو بنا سکتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے اختلافات تو اس سے بہت کم ہیں۔ میں اور لاہور کے بعض دوست اتنے دور نہیں ہیں، جتنے کہ یہودی اور عیسائی۔ آپ نے مسئلہ سنا ہوگا کہ ایک دفعہ آنحضرت (ﷺ) کی مسجد میں ایک شخص گرفتار ہو کر آئے، جن کا نام ثمامہ بن اثال تھا۔ یہ غیر مسلم تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنی مسجد میں جگہ دی اور کئی دن تک ان کو مسجد میں رکھا،[1] جس کا معنی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ذہن بڑا وسیع، دل بہت کھلا تھا۔ غیر مسلم کو اپنے قریب جگہ دی اور انھیں مشاہدے کا موقع دیا اور اس کا اثر کیا ہوا کہ چند دن کے بعد اس کا ذہن بدلا اور وہ بہترین مسلمان ہوگیا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں کو اس طرح سوچنے کی عادت سیکھنی چاہیے۔ یہ آپ سے نہیں گزارش کر رہا۔ آپ اس معاملے میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ میں ان دوستوں سے گزارش کر رہا ہوں، اگر وہ سنیں یا ان تک یہ آواز پہنچے، جن کے پاس منبر ہے، جن کے پاس زبان ہے، جن کے پاس علم ہے۔ وہ علم کی روشنی میں زبان کی قوت کے ساتھ مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کریں۔ اصل مقام یہی ہے۔

اختلافات کی نوعیت:

جیسے میں نے عرض کیا کہ اختلاف رہا ہے، رہے گا۔ ان اختلافات کو کسی مقام کے لیے رکھیے، جب اس کا وقت ہو جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم مختلف مسلمان گروہ بڑے عرصے سے آپس میں جھگڑ رہے ہیں، لیکن ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو اب تک مٹا نہیں سکا، بلکہ جتنی کسی کی زیادہ نمایاں مخالفت کی گئی، وہ اتنا بڑھا ہے۔ اس لیے محض یہ ہنگامہ آرائی اور اختلاف نوازی؛ یہ کوئی مشغلہ ہے؟

اسے یوں سمجھیے کہ انسان کے جسم کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، عام طور پر وہ غذا کھاتا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٤)

ہے اور اس کی زندگی کا انحصار غذا پر ہے۔ دو وقت، تین وقت، چار وقت، جتنا معدہ برداشت کرے، وہ کھانا کھائے، اس کی صحت پر اثر، اس کی قوت پر اثر، یہ اس کی ضرورت کی چیزیں ہیں، لیکن اسی جسم میں جب کوئی خرابی پیدا ہو تو پھر دوا کھائی جاتی ہے۔ دونوں چیزیں زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن غذا اصل چیز ہے، دوا ضرورت کے وقت۔ لڑائی جھگڑا یہ بھی ایک چیز ہے، کبھی اس کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن وہ دوا ہے، غذا نہیں ہے۔ اب اس وقت میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم میں سے بعض علماء اور بعض بزرگ وہ لڑائی کو غذا سمجھ رہے ہیں اور صلح کو دوا سمجھ رہے ہیں۔ وہ جب سٹیج پر آئیں، ان کا فرض ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی کو چھیڑیں اور جب ان کی زبان ہلے، وہ چار پانچ چھے سو دو سو چار سو کو کافر کر لیں۔ پھر وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے کام کیا۔ اگر فتویٰ اس سے کم ہو تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہوا کچھ نہیں۔

وقت کی ضرورت:

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ذہن اچھا نہیں۔ ہمیں اِکفار و تکفیر کو کسی وقت کے لیے رکھنا چاہیے، لیکن ایک دوسرے کو قریب سے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ اس ضرورت کے باوجود اس وقت تک ملک میں کوئی ایسا ذہن نہیں پیدا ہو سکا۔ اس کا ایک سبب تو یہ بھی تھا کہ آج سے کچھ وقت پہلے اس ملک میں ایک اجنبی حکومت برسرِ اقتدار تھی۔ ان کا ایک مقصد یہ تھا کہ ملک میں مختلف فرقے آپس میں جھگڑیں اور ان کا وقت، ان کی طاقتیں باہم جھگڑوں میں ختم ہوں اور ہم آرام سے حکومت کریں۔ اب انھوں نے ہم لوگوں کو عادی بنا دیا ہے کہ ہم باہم لڑتے رہیں، لیکن آپ یقین کریں کہ اب وہ وقت گزر چکا۔

جہاں تک میرا خیال ہے، موجودہ حکومت یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتیں لڑیں۔ توازن کے لیے ان جماعتوں کو اپنے اپنے مقام پر رکھنے کے لیے انھوں نے کیا کیا ہے؟ یہ مسئلہ بحث کا نہیں، یہ سوچنے کی چیز ہے کہ اس طرح ہم لوگوں کی مساعی کہاں تک صحیح اور کارفرما ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جہاں تک ان چند سالوں میں کچھ عرصے میں ہم نے دیکھا کہ موجودہ حکومت کا منشا یہ ہے کہ مسلمان مختلف گروہ آپس میں نہ لڑیں، ایک دوسرے کی عیب جوئی سے اجتناب کیا جائے۔

مَیں سمجھتا ہوں یہ جذبہ صحیح ہے، ہمیں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ میں آپ کے سامنے کھڑا

ہوں، میں کیا ہوں؟ اپنے متعلق میں اپنا عندیہ آپ سے عرض کروں۔ اس کا مجھے حق ہے، اگر مجھ میں کوئی خوبی ہے تو میں اس خوبی کا تذکرہ آپ سے کروں کہ مجھ میں یہ اچھائی ہے، لیکن میں نے کوئی خدمت آپ کی کی ہے یا ملک کی کی ہے تو میں آپ سے یہ عرض کروں کہ فلاں بڑا بے ایمان ہے۔ اس نے ایسا کیا ہے۔ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اس سے تنفر بڑھے گا۔ حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے مَیں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ان اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے قریب ہو کر سمجھنا چاہیے۔

ایک مشکل یہ ہمارے ملک میں آرہی ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کی ترجمانی کرتے ہیں کہ فلاں کا یہ خیال ہے تو وہ دوسرے کا مذہب میں اپنی زبان سے ایسے لفظوں میں بیان کرتا ہوں کہ جن لفظوں کو وہ دوسرا پسند نہیں کرتا۔ بسا اوقات وہ کہتا ہے کہ ہمارا یہ مذہب ہی نہیں، اگر ہم اپنی ہی ترجمانی کریں، دوسرے کی نہ کریں۔ دوسرا اپنی ترجمانی خود کرے، پھر میں سمجھتا ہوں شاید اس میں فائدہ ہو اور ہم قریب ہوں۔

آنحضرت ﷺ کا مقام اور نظریات کی ترجمانی:

میں جہاں تک سمجھتا ہوں، کوئی شخص مسلمانوں میں سے ایسا نہیں ہے جو آنحضرت ﷺ کو اپنے بھائی کے برابر قابلِ ادب سمجھے۔ گو بھائی بھی ادب کا مقام ہے، لیکن جہاں تک آنحضرت ﷺ کا مقام ہے، وہ بھائی اور باپ دونوں سے اونچا ہے۔ باپ کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہمیں حق ہے کہ باپ کی رائے سے اختلاف کریں۔ بھائی کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہمیں حق ہے کہ بھائی کی رائے سے اختلاف کریں۔ بیوی خاوند سے اختلاف کرے، خاوند بیوی سے اختلاف کرے۔

یہ آراء و خیالات پر اختلاف ہوسکتا ہے جو جائز اور درست ہے، لیکن ہم میں سے کوئی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے اختلاف کرے، یہ قطعی حق نہیں پہنچتا۔ اس کے قائل نہ اہلِ حدیث ہیں نہ اس کے قائل علمائے دیوبند۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص جس نے آنحضرت ﷺ کو پیغمبر سمجھا، پھر وہ شخص جس نے آنحضرت ﷺ کو خاتم النبیین سمجھا، ایسا نہیں کرسکتا۔ باپ کبھی ایسا کرسکتا ہے کہ بیٹے کو لاوارث کردے۔ بیٹا کبھی ایسی غلطی کرتا ہے کہ باپ سے تعلقات توڑ لے، لیکن ایک مسلمان یہ کبھی نہیں کرسکتا کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے تعلق توڑ لے۔ پھر یہ بڑے بھائی کا وظیفہ کیا ہوتا ہے؟ یہ ایک ایسی

ترجمانی ہے کہ اگر میں اس کا ترجمہ کروں تو شاید میں اس سے زیادہ بہتر لفظوں میں عرض کر سکوں اور آپ میری ترجمانی کریں تو وہ ترجمانی شاید صحیح نہ ہو۔

ایمانی بھائی چارہ:

آپ سوچیں آنحضرت ﷺ بیت اللہ میں پیدا ہوئے۔ پھر ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ قریش کے خاندان میں حضرت ﷺ کے والد بزرگوار بھی تھے۔ اس خاندان میں حضرت ﷺ کے چچا بھی تھے۔ اس خاندان میں آپ کے سسرال، ننھیال، ددھیال؛ یہ سب رشتے موجود تھے۔ ان رشتوں کے لحاظ سے کئی لوگ ایسے تھے، جو آنحضرت ﷺ سے چھوٹے تھے۔ حضرت ﷺ ان سے بڑے تھے۔ آپ سے کوئی پوچھے کہ حضرت محمد ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کیا لگتے تھے؟ کیا رشتہ تھا؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ میں ہوں، آپ ہوں، لاہور کے کوئی اور بزرگ ہوں، وہ یہی کہیں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ پھر پوچھیے کہ چھوٹے تھے یا بڑے تھے تو آپ کیا فرمائیں گے؟ بڑے ہی فرمائیں گے؟ پھر اگر یہ لفظ گناہ ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک واقعہ ہے، جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے، دنیا کا کوئی آدمی اس کا انکار نہیں کرتا۔ جہاں تک حضرت ﷺ کی عزت و احترام کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں ماں باپ عزیز و اقارب کوئی بھی آنحضرت ﷺ کے مرتبے میں نہیں آ سکتا۔

« لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ » [1]

فرمایا کوئی شخص تم میں سے مومن بن نہیں سکتا، جب تک اس کے دل میں آنحضرت کی محبت اپنی اولاد، اپنے ماں باپ اور ساری دنیا سے زیادہ نہ ہو۔ اب بھائی چھوٹے یا بڑے کا بھی ایک مقام ہے۔ بیٹے اور باپ کا بھی ایک مقام ہے اور نبوت کے لحاظ سے عزت و احترام کا بھی ایک مقام ہے تو اگر دوسرے کے مقصد کی صحیح ترجمانی کریں تو شاید یہ دقت نہ پیدا ہو۔

قرآن نے ہمیں بتایا ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ﴾ کہ مسلمان سب آپس میں بھائی ہیں۔ ان بھائیوں میں صلح کروانے کی کوشش کرو۔ بڑی صحیح اور سنجیدہ تعلیم ہے کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا۔ ہم سارے اللہ کی مخلوق ہیں اور بہ لحاظ مخلوق کے اور حضرت آدم علیہ السلام کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٤)

اولاد ہونے کے ایک تعلق ہے اور بحیثیت مومن کے ایک تعلق ہے۔ اگر قرآن کا یہ ارشاد صحیح ہے کہ ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ تو پیغمبر ﷺ بھی اس اخوت میں آتے ہیں اور چونکہ ہم نے ایمان سیکھا ان سے ہے، اس لیے سب سے بڑا مومن اگر دنیا میں ہے تو اپنے وقت میں پیغمبر ﷺ، اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پوری دنیا کے لیے ایمان اور دیانت کے داعی ہیں۔

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۸۵]

''رسول (ﷺ) اس (ہدایت) پر ایمان لائے ہیں جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کی گئی ہے اور سارے مومن بھی۔''

فرمایا: حضرت محمد رسول اللہ ﷺ خود بھی اس وحی پر ایمان لائے، جس وحی کی حضرت ﷺ نے دعوت دی۔ مومن بھی ایمان لائے تو ایمان کی اخوت دنیا میں موجود ہے، جو ایمان کا سب سے بڑا سرمایہ دار ہے، وہ سب سے بڑا ایمان دار ہے۔ دوسرے کی ترجمانی اگر آپ صحیح کرنے کی کوشش کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب ہوں گے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اختلافات کم ہوں گے، لیکن بدنصیبی یہی ہے کہ اس وقت تک ایسا ماحول پیدا نہیں ہوسکا کہ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوں اور ایک دوسرے کے خیالات کو اس کی زبان میں سمجھنے کی کوشش کریں، اس کے نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم ایسا کرسکیں تو میں سمجھتا ہوں ملت کی خدمت ہوگی، اسلام کی اس میں سربلندی ہوگی اور ملک کی اس میں آبرو ہوگی۔ لیکن محترم دور ایسا ہے کہ جس میں بظاہر میں دیکھتا ہوں کہ دو ہی راہیں ہیں، یا تو انسان مذہب سے بالکل الگ ہوجائے، ایک ایسی زندگی بسر کرے، جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، جیسے: سوشلسٹ کمیونسٹ اور اس قسم کے گروہ ہیں، جنھیں مذہب سے کوئی واسطہ اور تعلق ہی نہیں۔ شریعت اور مذہبی جھگڑوں میں آئیں گے ہی نہیں، لیکن یہ زندگی میرے نقطۂ نگاہ سے اور ہر آدمی کے نقطۂ نگاہ سے جس کا ایمان سے تعلق بنتا ہے، اچھی زندگی نہیں ہے، ہم اس زندگی کو صحیح زندگی نہیں سمجھتے۔ ہم بس سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی، اسلام کی خدمت اس میں زندگی گزرے، یہ اصل زندگی ہے اور اس میں رہ کر پھر ان اختلافات کو گوارا کر کے ہم ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کریں، یہ صحیح راہ ہے، جو ہمارے سلف نے ہمیں بتائی ہے۔

ائمۂ اربعہ کے اختلافات کی نوعیت:

آپ غور فرمائیں اس امت میں فہم وفراست، علم و دانش کے لحاظ سے اور وقت و ماحول میں صحیح کام کرنے کے لحاظ سے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے، جو ایک سنگلاخ زمین میں ایسے ماحول میں جہاں مختلف بدعی گروہوں کی منڈی تھی، وہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کے دشمن، وہاں اہلِ بیت کے دشمن، وہاں اعتزال اور جاہلیت اور اعتقادی بدعت کا مرکز؛ اللہ تعالیٰ نے وقت کے لحاظ سے ایک ایسے انسان کو وہاں پیدا کیا، جس نے واقعی بصیرت، روشنی، دانش اور فراست سے کام کیا، جو میں سمجھتا ہوں، اس وقت کا حصہ تھا (اللہ ان کی قبر کو نور سے بھرے)۔

اس زمانے کے لوگوں کو حضرت سے کئی مسئلوں پر اختلاف تھا، لیکن حضرتِ امام کے اس مقام کی رفعت، ان کے علم کا یہ رسوخ؛ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی انکار کرتا ہے تو وہ جاہل ہے یا احمق۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اپنے وقت کا نہایت ذکی ترین اور ذہین آدمی، جس کے متعلق جاحظ جیسا آدمی کہتا ہے کہ یہ مطلبی اس زبان سے گفتگو کرتا ہے، جو آسمان کی زبان ہے، یعنی اتنا ذہین آدمی ہے، ان کے مقام کی رفعت معلوم ہے، لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے خیالات میں بعض جگہ اختلاف ہے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اور طریق سے قرآن وسنت کو سمجھتے ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور طریق سے۔ اختلاف ہے، لیکن کسی کے متعلق کوئی بدگمانی، کوئی سوئے ظنی، کوئی بے ادبی موجود نہیں۔ اسی طرح امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ ہیں۔ یہ چاروں اپنے وقت میں یکتائے روزگار ہیں۔ اپنے اپنے لحاظ سے عزت، برتری، خلوص، دیانت، ایمان؛ یہ ان لوگوں سے ہم نے سیکھا۔ اس کے باوجود ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپس میں اختلاف ہے، پھر یہ اختلاف معمولی نہیں۔ بعض جگہ مسائل میں حلال وحرام کا اختلاف ہے۔ ایک بزرگ ایک چیز کو حلال فرماتے ہیں، ایک حرام۔ فتوے کی صورت میں کہتے ہیں، لیکن کوئی دوسرے کو حرام خور نہیں کہتا۔ یہ اور مقام ہے اور یہ اور مقام ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ارشد تلامذہ میں استاد اور شاگرد میں اختلاف ہے اور اسی قسم کے سنگین اختلافات ہیں، لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کے لیے بھی صحیح ادب، صحیح احترام موجود ہے۔ تو اس کا یہ معنی ہے کہ ایک دوسرے کو قریب سے سمجھا۔ اختلاف کی موجودگی میں بھی اس کے

موقف کو سمجھا کہ ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے۔ اس لیے اجتہاد میں ان کی بات نہیں مانی، لیکن اس کے خلاف بے ادبی کا کوئی لفظ نہیں کہا۔ ان بزرگ ائمہ یا ان کے اَتباع میں سے کوئی کسی کو کافر یا فاسق نہیں کہتا۔

مسائل میں اختلاف کرتے تو اس کا یہ معنی ہے کہ ایک دوسرے کو قریب سے سمجھنے کے بعد وہ دوسرے کی نیت، اس کے طریقۂ اجتہاد کو محسوس کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں بغض اور عداوت نہیں، اختلاف ہے۔ اس کے بعد بھی اس وقت تک کہ فرقہ بازی کا جمود نہیں سامنے آیا تھا، اس وقت تک مختلف گروہ اور ان ائمہ کو ماننے والے بزرگ ایک سٹیج پر کھڑے ہو کر اسلام کی خیر اندیشی کے لیے سوچتے۔ بوقتِ ضرورت ایک نے دوسرے کے مذہب پر، دوسرے نے اس کے مذہب پر فتویٰ دیا۔ یہ بغض، جو آج ہم میں موجود ہے اور کچھ دوست کھڑے ہوتے ہیں تو ان کو سوائے تکفیر کے مشغلہ ہی اور کوئی نہیں ہے، مَیں سمجھتا ہوں یہ بڑی نا اہل چیز ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ان کی زندگی میں آپ نے بارہا سنا کہ حکومت کے مقاصد نے ان کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ امام مالک، امام احمد اور امام شافعی رحمہم اللہ یہ وہ پاک باز لوگ ہیں کہ اپنے وقت میں بے نیاز ہو کر جس کو حق سمجھا، اس کی حمایت کی ہے۔ عوام کیا کرتے ہیں؟ حکومت کیا کہتی ہے؟ دونوں چیزیں نظر انداز کر دیں۔

علمائے حق اور علمائے سو میں بنیادی فرق:

مخصوص مقاصد اور علمی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر اس کا ساتھ دیں۔ سچائی کو دنیا کے سامنے پیش کریں، اس سے بے پروا ہو کر کہ عوام کیا کرتے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ حضرت مجدد الفِ ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ اسماعیل شہید، حضرت سید احمد شہید (رحمہم اللہ) یہ وہ پاکباز لوگ ہیں کہ جن لوگوں نے عوامی ذہن کو سوچا، ان کے سامنے عوام کی زندگی تھی، ان کی رسوم، عادات، شادی بیاہ؛ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ ان کو معلوم تھا، اس کو سمجھنے کے باوجود بھی ٹکرا گئے۔ کہا یہ بھی غلط ہے۔ عوام نے جو چاہا کہا۔

فارسی میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے قرآنِ عزیز کا ترجمہ کیا، عوام برافروختہ ہوئے، انھوں نے کہا کہ خدا کا کلام اور سمجھے شاہ ولی اللہ؟ یہ عوامی ذہن ہے، لیکن ولی اللہ بے نیاز تھا اس چیز سے کہ عوام خوش

ہیں یا ناخوش، انھوں نے جو کرنا تھا کیا اور بالکل اپنی قوتِ ایمان کے سہارے پر کیا، نہ دنیا سے نہ دنیا والوں سے کوئی چیز طلب کی۔

اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے جان دی عوام کی نصیحت کے لیے، ایک گروہ یہ ہے، دوسرا گروہ علما کا وہ ہے جو عوام سے اس طرح گفتگو کرتے ہیں کہ وہ سوچتے ہیں کہ عوام کیا کر رہے ہیں۔ وہ جو غلط کر رہے ہیں، اس کے لیے وہ دلیل تلاش کرتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے، تاکہ عوام خوش ہوں۔ میں اس کو عوامی ذہن سمجھتا ہوں، تو اس ذہن کے علماء جو آپ سے اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں، جو آپ کو خوش کرے، آپ نماز نہیں پڑھتے، وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوں گے تو وہ نماز کا ذکر نہیں کریں گے، کیوں کہ آپ کو تکلیف ہوگی، آپ تو بے نماز ہیں۔ اب آپ کہیں کہ نماز نہ پڑھنا بڑا جرم ہے، انسان کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو جتنے بے نماز ہیں، وہ مولوی پر ناراض ہوں گے، وہ بات وہاں سے شروع کرے گا، جس میں کوئی اختلافِ نصیحت نہیں، اس عوامی ذہن کے علماء، جو عوام کی رضا کو اپنے وعظ ونصیحت کا مرکز سمجھتے ہیں، ان لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کی زندگی اسلام کے لیے مفید زندگی نہیں ہے، عوام کو خوش کرنا یہ اسلام کے مقاصد سے نہیں ہے۔

اگر اسلام کا یہ مقصد ہوتا کہ عوام خوش رہیں تو حضرت محمد ﷺ عوام سے جنگ لیتے ہی نہیں، وہ وہی کرتے جو مکہ میں ہو رہا تھا، اسی کی حمایت کرتے، جو مکہ میں کیا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو ذہن کے علماء موجود ہیں، ایک وہ ذہن ہے کہ وہ نقائص کی نشاندہی، خرابیوں کی نشاندہی، بدعملیوں کی نشاندہی، انسانی کمزوریوں کا پتا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ غلط ہے، اسے چھوڑو۔ شادی، موت ہر مقام پر جتنی ہم نے غلطیاں اور لغو کیے ہیں، ایک ایک پر نقد کرتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے، ہماری مذہبی رسوم کو دیکھتے، وہ اس نگاہ سے دیکھتے کہ یہ رسوم اپنے مقام سے کہاں ہٹی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں، یہ بدعت ہے، یہ بدعت ہے۔ اب عوامی ذہن اس سے ناراض ہوتے ہیں۔ یہ میں نے عوامی ذہن کہا، یہ کچھ میری بھی غلطی ہے۔

اصلاح کی دعوت:

بدنصیبی یہ ہے کہ خواص میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے، جو اس ذہن سے متاثر ہے۔ پڑھے لکھے لوگ سرکاری عہدوں اور بڑی بڑی کرسیوں پر قابض، لیکن ذہن عوامی۔ وہ عوام کی چیزوں کو صحیح ثابت

کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس انداز میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں کہ گویا لوگ ان سے خوش ہوں۔ اس انداز کے اہلِ علم سے گزارش ہے کہ وہ اپنے موقف کو سوچیں، اپنے مقام کو سمجھیں اور وہ سوچنے کی کوشش کریں کہ اس دنیا میں اگر یہ راہ صحیح ہوتی تو علمائے حق عوام سے مخاصمت نہ کرتے۔

ائمۂ تجدید، یعنی وہ لوگ جن کو قدرت نے یہ توفیق بخشی کہ دنیا کی بیماریوں کو دیکھیں، پھر ان بیماریوں کا علاج اور مداوا کریں، اس قسم کے لوگ دنیا میں کم ہوئے، لیکن دنیا کی نظر میں قابلِ تعریف وہی ہیں۔ ایسا وقت جب کہ ملک میں یہ رواج ہے اور عوام اس انداز سے سوچتے تھے کہ جدھر کی ہوا اُدھر کو چلو، زمانے کا جو رنگ ہے، اس رنگ میں رنگ جانا چاہیے۔ بادشاہ سلامت کے دربار میں جائیں تو بادشاہ کو سجدہ کریں، سب ہو رہا تھا۔ مغل بادشاہ بیٹھ کر سجدے کرواتے تھے۔ مجرے ان کے سامنے ہوتے تھے۔ حضرت مجدد الفِ ثانی نے اس رسم سے مقابلہ کیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ بادشاہ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ایک مسلمان ان کے سامنے جھکے۔ اپنے وقت میں بادشاہ سے لڑ گئے اور اس تمام معاشرے سے لڑ پڑے، جو اس برائی میں بادشاہ کو تنبیہ نہیں کرتے تھے اور بادشاہ کو خوش کرتے تھے، آج ان کا نام مجدد الفِ ثانی ہے۔ وہ حضرتِ مجدد ہیں۔ اس لیے میں اس عوامی ذہن کے علماء سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے موقف پر اب غور کریں۔ عوام کو خوش کرنا یہ مقصد نہیں ہے، بلکہ دنیا میں عوام کی غلطیوں کی نشان دہی اصل مقصد ہے۔

اوامر ونواہی کی حقیقت:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

[آل عمران: ۱۱۰]

”تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔“

اگر یہ عوام کو خوش کرنا مقصد ہوتا تو اس امت کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہودی یہ کام کر رہے تھے۔ عیسائی یہ کام کر رہے تھے۔ مشرکینِ عرب یہ کر رہے تھے کہ جو لوگ کر رہے ہیں، ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ بت پرستی اس لیے رائج ہوئی، حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا اسی لیے رائج

ہوا۔ عزیر علیہ السلام کو ''ابن اللہ'' کہنے کی اس لیے عادت پڑی کہ عوام اس کے ساتھ ٹکرانا نہیں چاہتے تھے۔ جب لوگوں نے کہا تو علماء نے کہا ٹھیک ہے۔ فرمایا اب ضرورت محسوس ہوئی، ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ ﴾ ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ امر بالمعروف کا کیا مطلب ہے کہ عرف اور سچائی بھلائی کی تلقین دنیا کو کرے۔ اس کے لیے ایک جماعت موجود ہونی چاہیے۔ جب وہ دنیا میں دیکھے کہ اس وقت ضرورت ہے کہ لوگوں کی راہنمائی کی جائے نیک کاموں میں، وہ میدان میں اُترے اور نیکی کی طرف راہنمائی کرے۔

﴿ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ جب وہ دیکھے کہ دنیا بدی کی طرف جا رہی ہے تو برائی سے روکنے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اس وقت تک لوگوں کو نہیں چھوڑیں، جب تک برائی کو مٹا نہ دیں، تو گویا اس امت کی نصیحت، دنیا میں اسلام کا وجود، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، آپ کے ساتھ ایک ایسی جماعت جس نے اسلام کے پھریرے کو اُٹھایا اور سات سمندروں کو چیرتی اور پہاڑوں کو روندتی ہوئی چلی گئی، اس جماعت کو پیدا کرنے کی ضرورت کیا تھی؟

﴿ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ جس کا دوسرا معنی ہے عوام سے ٹکر کہ جو لوگوں میں برائی ہے، ان برائیوں کا قلع قمع کرنا اور جو نیکی ہے اس کی طرف دعوت۔ یہ دو کام اگر امت نہیں کرتی تو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جو نیک عادات سے امت میں مفقود ہو گی اور لوگ اسے چھوڑیں گے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ لوگ نیکی کا حکم چھوڑ دیں گے۔ برائی سے روکنا چھوڑ دیں گے۔ ذہن یہ ہوگا کہ میاں ہمیں کیا مصیبت ہے۔

عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود [1]

کوئی جو چاہے، کرے، آپ کو کیا؟ یہ عام ذہن ہے اس وقت دنیا میں۔ جو ہوندا اے سب ٹھیک اے۔ یہ ذہن اسلامی ذہن نہیں۔ مجھے اور آپ سب کو یہ کوشش کرنا چاہیے، اچھے لفظوں میں۔ میرا یہ قطعی مقصد نہیں کہ آپ لڑیں، قطعی مقصد نہیں کہ آپ لوگوں کو گالیاں دیں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ اچھے سے اچھے طریق پر بہتر سے بہتر لفظوں میں اگر برائی سے روک سکتے ہیں تو روکیں۔

---

[1] ''عیسیٰ اپنے دین پر اور موسیٰ اپنے دین پر۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف رخصت کیا اور فرمایا کہ دیکھو علی! تم جا رہے ہو۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ تم وہاں سے سرخ اونٹ اور وہاں کا سونا اور دولت جمع کر کے لاؤ۔ اگر تیرے سبق سے ایک آدمی کو کلمۂ حق معلوم ہو کر ہدایت آ جائے۔ فرمایا: مجھے اس سے بہت زیادہ پسند ہے کہ تم اونٹ اکٹھے کر کے لاؤ۔[1] گویا دنیا کی راہنمائی اور سچائی کی طرف دعوت اور عوام کی آواز کو راستی اور صلاحیت کی طرف لانا یہ اصل مقصد ہے انبیاء علیہم السلام کا۔

علماء کی جاہلانہ روش:

عوام کو خوش کرنے والے علماء یقین فرمالیں کہ ان کی روش ائمہ کی روش نہیں ہے، ان کی روش اہلِ تجدید کی روش نہیں ہے، وہ دنیا کے جاہلوں میں سے ایک جاہل ہیں کہ جہلاء کا ساتھ دے رہے ہیں۔ میرے یہ الفاظ سخت ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں اس سے زیادہ بہتر لفظوں میں ان کی پوزیشن کو واضح نہیں کر سکتا کہ وہ جہلاء کی طرح اپنے علم کو جہلاء کے ساتھ ملا رہے ہیں۔ جہلاء ایک بدعت کرتے ہیں، میں اس کے جواز کے دلائل تلاش کرتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے۔ جہلاء ایک شرک کی بات کرتے ہیں، میں اس شرک کے جواز کے لیے دلائل تلاش کرتا ہوں۔ مجھ میں اور جہلاء میں کیا فرق ہے؟ وہی میں نے کیا، جو جہلاء کر رہے ہیں۔ اسی لیے گزارش کی ابتداء میں جو آیت میں نے پڑھی ہے، اس میں ایک اختلاف کا حل ہے۔

حضرت امام احمد رحمہ اللہ کے زمانے میں اعتقادی بدعت کا بڑا زور تھا تو کسی نے ان سے عرض کی کہ حضرت حق اور باطل میں سچ اور جھوٹ میں امتیاز (فرق) کیسے ہے؟ آپ بھی قرآن اور حدیث سے سناتے ہیں۔ جہمیہ اور معتزلہ وہ بھی قرآن اور حدیث پڑھتے ہیں۔ تو حضرتِ امام نے ایک فرق بتایا کہ "اَلْفَرْقُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ يَوْمُ الصَّلَاةِ" فرمایا کہ جنازے کے دن آپ کو فرق معلوم ہوگا کہ ان کی موت پر لوگ ہنسیں گے اور ایک اہلِ سنت اور امامِ حدیث کی موت پر لوگ روئیں گے، وہ سامنے نہیں ہوگا۔ لوگ اس پر افسوس کریں گے، یہ بھی ایک راہ ہے۔ واقعی ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ مرتا ہے، لوگ ہنستے ہیں۔ امام احمد کا انتقال ہوتا ہے تو یہودیوں کے گھر میں ماتم کی صف بچھنے کے لیے کافی صفیں ہوتی ہیں۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٦)

حق کی علامت:

یہ بھی ایک فرق ہے، ایک یہ بھی فرق ہے، جیسے میں گزارش کر رہا ہوں کہ ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ﴾ کہ آپ مختلف گروہوں میں جب قرآن تقسیم ہو چکا ہو، سب قرآن پڑھ رہے ہوں، سب حدیث سے بیان کریں تو آپ میں اُلجھن پیدا ہوگی کہ کون سچا ہے؟

اس میں ایک صورتِ تصفیہ یہ بھی بتائی ہے کہ دیکھو اگر میں آپ کے سامنے کھڑا ہو کر اپنی دعوت دیتا ہوں کہ مجھے مانو، میری بیعت کرو، میری پیروی اور مریدی کو چلاؤ تو یہ اللہ کی طرف دعوت نہیں۔ فرمایا: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا﴾ دنیا میں سب سے بہترین شخص وہ ہے کہ دعوت الی اللہ اپنی ذات کے لیے نہیں، اللہ کے لیے دعوت دیتا ہے۔ وہ دنیا کو خدا کی طرف بلاتا ہے۔ اس کا اپنا کوئی مقصد اس میں نہیں ہے۔

حضرت محمد ﷺ آئے، وہی رفعت، برتری اور یہ معلوم کہ آپ سے بڑا آدمی دنیا میں کوئی دوسرا نہیں۔ لیکن اپنی طرف دعوت بلحاظ محمد ﷺ نہیں دی، بلحاظِ رسول دعوت دی ہے۔ ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ فرمایا: رسول کی اطاعت کرو، اس کا معنی کیا ہے کہ میرے پاس وہ پیغام ہے، جو آسمان سے مجھے خدا نے دیا۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے اور تمام اہلِ سنت نے صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو ان کی ذات کے لحاظ سے، ان کے جسم کے لحاظ سے قبول نہیں کیا، ہم نے آنحضرت ﷺ کو ان کی رسالت کے لحاظ سے قبول کیا ہے کہ جو کچھ فرماتے ہیں، یہ خدا کا فرمان ہے۔ اس لیے ہم نے جہاں خدا کے براہِ راست فرمان قرآن کو قبول کیا، ٹھیک اسی طرح اس پیغام کو جو سنت کی صورت میں محمد رسول اللہ ﷺ قرآن کی تشریح میں لائے، اسے بھی قبول کیا، ہم نے جس طرح قرآن کے انکار کو کفر سمجھا، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کے انکار کو بھی کفر سمجھا۔ اس لیے کہ وہ بحیثیتِ رسول آئے۔

بہترین دعوت...دعوت الی اللہ!

﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ [النساء: ۵۹]

”تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تم باہم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔“

فرمایا کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت اور رسول کے ماننے والے ﴿اُولِی الْاَمْرِ﴾ تم میں سے مسلمان بادشاہ ان کی اطاعت کرو۔ ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ﴾ اگر تم میں اور بادشاہ سلامت میں اختلاف ہے، حکومتِ وقت اور رعایا میں کوئی اختلاف ہے تو فرمایا کہ دونوں مسلمان ﴿فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ﴾ محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھو کہ حضرت کا حکم کیا ہے تو اس کا یہ معنی ہے کہ قرآن اور اس کے ساتھ سنت، یعنی آنحضرت ﷺ کا فرمان وہ بحیثیت ”الرسول“ ہے۔

اسی لیے قرآن نے ایک مقام پر نہیں، کئی جگہ ”الرسول“ کی اطاعت کو فرض قرار دیا اور یہی میں سمجھتا ہوں کہ مسلکِ اہلِ حدیث اور ائمۂ سنت کے اعتقادات کی اساس اور بنیاد ہے تو ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ﴾ گویا آنحضرت ﷺ نے اللہ کی طرف دعوت دی اور یہی اصل دعوت ہے۔

اب ایک بزرگ آتے ہیں، آپ کے سامنے وہ تقریر کرنے کے بعد آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ میری بیعت کرو، آپ کو ایک معیارِ حق ہاتھ آ گیا کہ یہ اپنے لیے کہہ رہے ہیں، لہٰذا وہ ”دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ“ نہیں ہیں۔ اس پر اس معنی سے غور کریں۔

ایک طبیب اپنی دکان پر بیٹھتا ہے، وہ آپ کو دعوت دیتا ہے کہ میری طرف آؤ، اس کا مقام بحیثیت الرسول نہیں۔ بحیثیت طبیب ہے کہ آپ علاج کے لیے اس کے پاس جاتے ہیں۔ ایک انجینئر جو اپنے فن کی طرف آپ کو دعوت دیتا ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ یہ دعوتیں غلط ہیں، اپنی حد تک تو ٹھیک ہیں، وہ طب کے لیے، وہ اپنے کاروبار کے لیے، ہر دکان دار اپنی دکان کی دعوت دیتا ہے، لیکن ﴿اَحْسَنُ قَوْلًا﴾ جس کو قرآن فرماتا ہے کہ یہ سب سے بہتر چیز اور اچھی بات ہے، وہ دعوت الی اللہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مختلف گروہوں اور فرقوں میں دیکھیے، جہاں پر شخصی دعوتیں اپنے مقاصد کے

لیے ہوں، آپ اس کو اس معنی سے جانچیں۔ آپ کو وہ پسند آئے، قبول کریں، نہ پسند آئے نہ قبول کریں، لیکن ایک معیار کی چیز جو ہے سچائی، وہ اس جماعت میں ہوگی "مَنْ دَعَا إِلَى اللّٰهِ" کہ وہ اللہ کی طرف دعوت دے۔ ﴿ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ ان کی زندگی میں عملِ صالح موجود ہو۔ ﴿ وَقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ اور فرمایا: خدا کے سامنے تسلیم اور امتیاز اس کو اپنا شیوا بنائے، خدا کے احکام کو قبول کرے، دنیا میں ﴿ اَحْسَنُ قَوْلًا ﴾ سب سے بہترین قول اس شخص کا ہے۔

اب محترم میں گزارش کروں اس خلفشار اور اختلاف کی زندگی میں جو اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اس مشکل میں جس میں مَیں آپ مبتلا ہیں، اس جماعتی اور حربی بحث میں جو دنیا میں موجود ہے۔ وہابی، حنفی، چکڑالوی، دیوبندی کتنے نام ہیں، جن پر مختلف جماعتیں دعوت دے رہی ہیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ اس معنی سے آپ ہر جماعت پر غور کریں اور اس انداز سے سوچیں کہ ﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ ﴾ کہ ان سب میں سے اساسی اور بنیادی طور پر خدا کی طرف دعوت کون دے رہا ہے؟

اس لحاظ سے میں گزارش کروں گا کہ دنیا میں ہمیشہ ہی لوگوں نے حق کی دعوت دی اور حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنَ النَّاسِ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ...»[1]

فرمایا: ایسی جماعت دنیا میں ہمیشہ رہے گی، یہ ناپید نہیں ہوسکتی۔ فرمایا: "ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ" وہ سچائی کے غلبے کے ضامن ہیں۔ "لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ..." ان کو کوئی شخص ذلیل کرنا چاہے، ان کو ذلیل نہیں کرسکتا، ان کی عزت کو پامال کرنا یہ انسانوں کے لیے ناممکن ہے۔ اپنے وقت میں فرعون نے پوری کوشش کی کہ موسیٰ علیہ السلام کی آواز دبے اور دنیا کی نگاہ میں موسیٰ گرے، لیکن آج فرعون، اس کی تاریخ، موسیٰ علیہ السلام اور اس کی تاریخ موجود ہے۔ آپ فرمائیں کہ نیک نام کون ہے اور بدنام کون؟

نمرود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں کی ایک دعوت ہے، وہ چاہتا ہے کہ دنیا میرا ساتھ دے اور واقعی دنیا نمرود کے ساتھ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام لڑ رہے ہیں، بہت تھوڑے قلیل آدمی ہیں۔ اپنے گھر کے آدمی ساتھ نہیں ہیں، لیکن ہے دعوت الی اللہ، ذاتِ ابراہیم کے لیے کوئی دعوت نہیں، اللہ کے لیے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠)

دعوت ہے۔ وقت گزر گیا۔ نمرود بھی آپ کے سامنے نہیں، ابراہیم علیہ السلام بھی آپ کے سامنے نہیں۔ علیہ وعلیٰ نبینا الصلاۃ والسلام. آپ فرمائیں کہ نیک نام کون ہے اور بدنام کون؟

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مخالفین کی جماعت ہے، جن کی قوت اتنی قوت کہ مجبور کیا کہ وطن ترک کر کے مدینے چلے جائیں۔ پھر مدینے میں نفاق نے آخری وقت تک تصادم اور ٹکر لی ہے۔ غزوۂ تبوک 9 ہجری میں حضرت جاتے ہیں، غزوۂ تبوک میں جانے کے بعد مسجد ضرار مدینے میں بن گئی۔ اس کا معنی ہے کہ سنہ 10ھ کو تو حضرت خود رخصت ہوئے تو گویا آخر 9 ہجری تک کفر کا تصادم رہا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے، لیکن ان کی دعوت کیا تھی: "دعا إلى الله" آج عبداللہ بن ابی جا چکا، ابوجہل جا چکا، ابولہب جا چکا۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی ہمارے سامنے نہیں ہیں، لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ نیک نام کون ہے اور بدنام کون ہے؟ "من دعا إلى الله" جس نے اللہ کے لیے دعوت دی، وہ آج سرخرو اور نیک نام ہے اور ہزاروں نہیں کروڑوں کی زبانیں اس کے لیے درود پڑھتی ہیں اور کروڑوں زبانیں اس کے کلمۂ توحید کو پڑھتی ہیں۔

یہ ایک فرق ہے، وہاں دعوت شخصی تھی۔ یہاں دعوت اللہ کے لیے ہے تو اس فرق میں اگر جماعتی تصادم میں آپ سوچنا چاہیں تو میرے نزدیک قرآن کا یہ ایک اصول ہے کہ ہر دعوت کو آپ دیکھیں، جہاں دعوت میں اپنی ذات کے لیے دے رہا ہوں، اسماعیل کے لیے، اسے نکال دو، بے کار آدمی ہے۔ دعوت الی اللہ نہیں ہے۔

اس ضمن میں محترم ان لوگوں نے جن کو کتاب وسنت سے شرف تھا، انھوں نے کیا کیا کہ دعوت الی اللہ کے لیے زمین کو ہموار کیا، کیسے ہموار کیا؟ حضرات اب آپ سوچیے کہ جو کچھ مکہ میں ہو رہا تھا، اس وقت جبکہ حضرت محمد ﷺ ہیں، اس وقت کیا کیا کہ لات کی قبر طائف میں پج رہی تھی۔ وہ بت خود حرم بیت اللہ میں پج رہے تھے۔ انسان کی پرستش، جنوں کی پرستش، غیر اللہ سے ڈر، مخلوق کے سامنے سجدوں کا کرنا اور جھکنا۔ غیر اللہ کی عبادت یہ موجود تھی۔ اگر یہ عوام کی روش صحیح تھی تو آنحضرت ﷺ کا آنا بے سود تھا۔ آنحضرت ﷺ تو یہ چیز نہیں کہتے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ حضرت ﷺ نے ان سب کی دعوت کو چھوڑ کر اللہ کی طرف دعوت دی۔

فرق ایک پیدا ہوا ہے، اب میرے لیے کوئی دقت نہیں، میں ابوجہل کو غلط سمجھتا ہوں۔ ابولہب

کو غلط سمجھتا ہوں۔ اس تمام گروہ کو جو بدر سے لے کر تبوک تک ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ سے لڑے، میں سب کو غلط اور جھوٹا سمجھتا ہوں، اس لیے کہ ان کی دعوت اپنی ذات کے لیے تھی۔ اپنی قوم کے لیے تھی، محمد ﷺ کی دعوت اللہ کے لیے تھی۔ آپ نے ابوجہل کا وہ خطبہ سنا، جو اس نے بدر کی لڑائی شروع ہونے سے پہلے دنیا کے سامنے اپنی پوزیشن کو واضح کرنے کے لیے دیا، شاید آج کی اصطلاح میں اسے وائٹ پیپر کہتے ہیں، اس نے اپنا عندیہ بتایا کہ ہم اس مصیبت میں کیوں پھنسے، اس نے دو چیزیں بتائیں کہ "إِنَّ مُحَمَّداً شَتَّتَ أَمْرَ الْعَرَبِ..." کہا: ہم اس لیے لڑ رہے ہیں کہ حضرت ﷺ نے عرب میں تفریق پیدا کی ہے۔ یہ وہ ٹھیک کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے واقعی تفریق پیدا کی۔ انھوں نے عرب میں سے اہلِ کفر کو اپنا ساتھی نہیں رکھا۔

دوسری بات کی: حضرت نے آباء کے دین کو جو سب لوگوں کا پرانا آرہا تھا، اسے ترک کر کے ایک نیا دین پیش کیا۔ کیا معنی کہ عوام کی دعوت، عوام کے اندازِ فکر، جس طرح عوام سوچتے تھے، اس اندازِ فکر کو سردارِ عالم نے بدلا۔ یہ محترم وہی آواز ہے، جو آپ کو کہا جا رہا ہے اور آج ہماری قیادت بڑی ہائی اتھارٹی کے لوگ ہمیں یہ فرماتے ہیں کہ اسلام کو عوام کا ساتھ، لوگوں کا ساتھ، زمانے کا ساتھ دینا چاہیے۔ اگر یہ ساتھ نہ دیا گیا تو کہا کہ اسلام مٹ جائے گا اور دنیا میں یہ فیل ہو جائے گا۔ یہ کیا کہتے ہیں؟ وہاں یہ سوچا کہ حق اور صحیح بات کیا ہے۔ تو ان فقراء نے بالکل اس روش پر جیسے آنحضرت ﷺ کے زمانے میں عوام کی ایک آواز تھی اور ایک آنحضرت ﷺ کی آواز تھی۔ وہ آواز عوام کی عوام کے لیے تھی۔ اپنے مفاد کے لیے تھی، اپنے آباء واجداد کے لیے تھی، اپنے قومی مفاد کے لیے تھی، جس کو وہ قوم سمجھتے تھے، حضرت محمد ﷺ کی دعوت ان سب سے مختلف تھی۔ آپ کی نظر میں قوم بت تھی، آپ کی نظر میں بادشاہت کوئی چیز نہیں تھی۔ آپ کی نظر میں ایک ہی چیز تھی کہ «مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا...»[1]

حق کی آواز بلند ہو اور دنیا خدا کی طرف آئے، یہ ایک آواز تھی، جس پر آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو جمع کیا۔ یہی ہے: ﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ ﴾ کہ اللہ کے لیے دعوت دی۔ کوئی شخصی، کوئی ملی، کسی بت کے لیے کوئی دعوت نہیں دی۔ اب آپ سوچیں کہ اگر وہ عوامی مسلک ٹھیک تھا تو وہ عرب کر رہے تھے، ان میں اتحاد اور وحدت تھی، وہ شرک پر متحد تھے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٤)

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾
[البقرة: ۲۱۳]

''لوگ (پہلے) ایک ہی امت تھے (پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے) تو اللہ نے نبی بھیجے، خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے۔''

فرمایا: لوگ کفر پر جمع تھے، اللہ نے پیغمبروں کو بھیج کر ان میں سے نیک لوگوں کو علاحدہ کر دیا، تفریق پیدا کی، اس تفریق کو پسند کیا اور یہ وحدت! وحدت صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس میں دعوت الی اللہ نہیں۔

اب آگے بڑھیے! اس دور میں جس میں ہم گزر رہے ہیں۔ آج سے تقریباً دو سو سال پہلے دسویں صدی سے شروع ہو کر قریب قریب اس دعوت الی اللہ کی داغ بیل ڈالی اور حضرت شاہ ولی اللہ اس دعوت کے سب سے اہم داعی ہیں۔ اب وہاں کیا ہے کہ دنیا کے رسوم و عادات، ان سے تخالف ہے۔ گھروں کے رسم و رواج اس پر نشان دہی ہے کہ یہ غلط ہے۔ لڑکیاں بیوہ ہوتی ہیں، وہاں کی عام عادت یہ ہے کہ اب دوبارہ نکاح نہیں ہوتا، لیکن کچھ پاکباز لوگ ہیں کہ عوام کی روش کے خلاف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ ہے کہ یہ ہونا چاہیے۔

لڑکیوں کے لیے حالات پر رحم اور ان کی ضروریاتِ زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک عمر اس چیز کا تقاضا کرتی ہے، یہ تعلق قائم رہنا چاہیے۔ وہاں حضرت کیا ہے کہ قبروں کے سامنے لوگ سجدے کرتے ہیں۔ اگر یہ روش صحیح ہے جو عوام کر رہے ہیں۔ آپ کے شہر میں حضرت ہجویری رحمہ اللہ کا مزار ہے۔ حضرت شاہ محمد غوث کا مزار ہے۔ آپ دیکھیے کہ وہاں سجدے ہوتے ہیں یا نہیں؟

53ء کی تحریک میں جیل میں آپ کے لاہور کے بڑے بزرگ موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سجدہ نہیں ہے۔ یہ تو زمین بوسی ہے، یہ خوب نقطہ تھا۔ انھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ آپ لوگ غلط سمجھتے ہیں، یہ سجدہ نہیں۔ سجدہ تو وہ ہے جس میں وضو ہو، سجدہ وہ ہے کہ جس میں تسبیح پڑھی جائے۔ ہم نہ وضو کرتے ہیں، وہ سجدہ قبر پر بے وضو ہی کرتے ہیں اور نہ اس میں تسبیح پڑھتے ہیں۔ بات خوب تھی، میں نے عرض کیا کہ حضور قرآن نے جن کو مشرک کہا ہے، وہ بتوں کے سامنے وضو کر کے سجدہ کرتے تھے؟



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہدایت کا اختیار اور توفیقِ ایزدی

﴿قُلۡ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًاۢ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡ‌ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيۡرًاۢ بَصِيۡرًا ۝ وَمَنۡ
يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ‌ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِهٖ‌ ؕ وَنَحۡشُرُهُمۡ
يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوۡهِهِمۡ عُمۡيًا وَّبُكۡمًا وَّصُمًّا‌ ؕ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَـنَّمُ‌ ؕ كُلَّمَا خَبَتۡ
زِدۡنٰهُمۡ سَعِيۡرًا‏ ۝ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا
وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا جَدِيۡدًا‏ ۝ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ وَجَعَلَ لَهُمۡ اَجَلًا لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوۡنَ
اِلَّا كُفُوۡرًا ۝﴾ [بني إسرائيل: ٩٦-٩٩]

"کہہ دیجیے: میرے اور تمھارے درمیان اللہ (بطور) گواہ کافی ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر اور (انھیں) خوب دیکھنے والا ہے۔ اور جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت یافتہ ہے، اور جسے وہ گمراہ کرے تو آپ ان کے لیے اس (اللہ) کے سوا کوئی دوست ہرگز نہ پائیں گے اور ہم انھیں یومِ قیامت چہرے کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب بھی وہ بجھنے لگے گی تو ہم ان کے لیے اور بھڑکا دیں گے۔ یہ ان کی سزا ہے، کیونکہ انھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا: کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا یقیناً ہم دوبارہ از سرِ نو پیدا کر کے اٹھائے جانے والے ہیں؟ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک جس اللہ نے آسمان اور زمین تخلیق کیے، وہ اس پر قادر ہے کہ ان جیسے پھر تخلیق کر دے، اور اس (اللہ) نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے جس میں کوئی شک نہیں، پھر ظالموں نے انکار کیا مگر کفر کرنے سے (انکار نہ کیا)۔"

عوام کا رویہ:

اس دنیا میں انبیائے کرام اعلیٰ صفات کے مالک اور مکمل نمونہ ہیں اور انہیں کی اِتباع میں خیر و رُشد ہوسکتی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ تمام انسانوں کو ہر معاملے میں انبیاء کی پیروی کرنی چاہیے اور جس دعوت کی طرف وہ بلاتے ہیں، اس کو قبول کرنا چاہیے، جو ہدایات اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں، ان کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنانا چاہیے، لیکن تمام انبیائے کرام کو جھٹلایا گیا اور اُن کی پیش کردہ ہدایت و رشد کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے لوگوں نے ٹھکرایا۔

انکارِ رسالت کی ایک وجہ:

کفار اپنے انکار کی جو وجوہ پیش کرتے رہے ہیں، اُن میں سے ایک سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نبی ایک فوق البشر مخلوق ہونا چاہیے اور نبوت کا مدعی، چوں کہ ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے، اس لیے ہم ایک انسان کو رسول و نبی تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

قانونِ قدرت:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ایک اصول بیان کر دیا ہے کہ انسانوں کے لیے ایک انسان ہی رسول ہونا چاہیے، کیوں کہ انسان کے لیے ایک انسان ہی کی زندگی نمونہ اور قابلِ اتباع ہوسکتی ہے۔ ایک فرشتے کی زندگی اور عادات انسانوں کے لیے ہرگز قابلِ اتباع نہیں ہوسکتیں، کیوں کہ فرشتے کی قوتیں اور فطرت انسان سے مختلف ہے اور جو کام ایک فرشتہ بڑی آسانی سے کرسکتا ہے، انسان وہی کام بڑی تکلیف اور مشقت کے باوجود نہیں کرسکتا۔ فرمایا:

﴿لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَٰٓئِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُولًا ﴿٩٥﴾﴾ [بني إسرائيل: ٩٥]

”اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو یہاں مطمئن ہوکر چلتے پھرتے تو ہم ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر نازل کرتے۔“

لیکن چونکہ فرشتے یہاں آباد نہیں ہیں، بلکہ انسان آباد ہیں تو ظاہر بات ہے کہ انسانوں کی راہنمائی و ہدایت کے لیے فرشتہ نہیں، بلکہ انسان ہی موزوں ہوسکتا ہے۔ انسانوں میں ہر طرح کے

افراد ہیں؛ ناکارہ اور گھٹیا قسم کے انسان بھی ہیں اور پسندیدہ اخلاق و اعمال کے مالک بھی۔ جب رسولِ اکرم ﷺ کو بشر کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ وہ بھی ہماری طرح گناہ گار تھے، بلکہ وہ تو ان تمام عیوب اور نقائص سے پاک تھے۔ بشر ہونا کسی بھی رسول کی کسرِ شان نہیں ہے، بلکہ انسان ہو کر تمام عیوب سے پاک ہونا بہت بڑی شان اور اللہ کی عنایت ہے۔

محنت اور کام کرنا انسان کا کام ہے اور نتائج و ثمرات اس کے بس کی بات نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ آپ ﷺ کی تبلیغ سے زیادہ پُر اثر اور جامع تبلیغ اور کسی کی نہیں ہوسکتی، لیکن کس کو علم نہیں ہے کہ آخر وقت تک منکرین موجود رہے۔ ہر روز تلقین سننے والے منافقین باقی رہے۔ مشرکین کی ایک بہت بڑی تعداد نے ہدایت کو قبول نہ کیا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا ہے: ﴿ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ﴾.

اللہ کی گواہی:

رسول اللہ ﷺ نے تمام قبائل کو دعوتِ اسلام دی اور عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔ تمام عرب اکابرین اور عجمی بادشاہوں کو بھی اسلام کی طرف بلایا اور اس معاملے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وفات سے اسّی روز پہلے عرفات کے میدان میں ایک جامع اعلان فرمایا، جس میں جاہلیت کی رسوم کو کچلنے، اونچ نیچ کو ختم کرنے، انسانی مساوات کو قائم کرنے، غلاموں کے حقوق اور عورتوں کے حقوق کے علاوہ دیگر مختلف امور کی تلقین کی۔ اس کے بعد آپ نے مخاطبین سے پوچھا کہ کیا میں نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا ہے؟ انھوں نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ اس موقع پر بھی آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ ہی کو گواہ بنایا اور کہا: اے اللہ! گواہ رہنا۔[1]

رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی پوری زندگی اس کام میں صَرف کی اور اس پر اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرا دیا، کیوں کہ انسان کا علم اور خبر ناقص ہے اور اللہ تعالیٰ پوری طرح خبیر و بصیر ہیں۔ انسانی علم اور خدائی علم کا فرق ایک مثال سے واضح کرتے ہوئے فرمایا: انسان سورج کو دیکھ کر اس کی چوڑائی کا ایک اندازہ کرتا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ سورج اندازے سے کروڑوں گنا بڑا ہے۔

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۷۴۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۱۸)

ہدایت کا ذریعہ:

انبیاء، آسمانی کتب، نیک ہستیاں؛ یہ سب ہدایت کے اسباب و ذرائع ہیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق کسی کے شاملِ حال نہ ہو تو وہ ہدایت نہیں پا سکتا، جس طرح رات کے وقت آنکھوں کی بصارت سے کام لینے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح تمام وسائل کے ساتھ ساتھ توفیقِ الٰہی کی ضرورت ہے، اگر یہ میسر نہ ہو تو یہ تمام ذرائع بے کارِ محض ہوتے ہیں، جیسا کہ کہا گیا ہے: ﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ﴾.

تبلیغ کرنے والے رسول اللہ ﷺ تھے، لیکن جن کو یہ روشنی نصیب نہ ہوئی، وہ ایمان نہ لائے۔ حق کو قبول کرنے میں ہر آدمی کی بصیرت اور اُس کا فہم مددگار ہوتا ہے، لیکن ہر آدمی کے معاملے میں یہ یکساں نہیں ہوتا۔ ابوجہل اور ابولہب کو تو اُن کے فہم و بصیرت نے انکار و کفر کی راہ دکھائی، لیکن حکیم ضماد کے معاملے میں اس کا اثر الٹا ہوا۔ یہ صاحب کرنے تو جنون کا علاج جاتے ہیں، لیکن خطبۂ مسنونہ کو تین مرتبہ سننے کے بعد مسلمان ہو جاتے ہیں۔[1] اندھیرے میں آنکھوں سے کام لینے کے لیے جس روشنی کی ضرورت تھی، وہ اُن کو میسر آ گئی، لیکن یہی خطبہ دوسرے کفار کئی مرتبہ سُن چکے تھے، لیکن ان پر اس سے اثر الٹا ہوا۔ ہدایت و اصلاح کے اس معاملے میں کسی طرح کا کوئی دوست کام نہیں آ سکتا۔

﴿فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ﴾: کارسازی کو اس معاملے میں بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے برائی کو دیکھا، لیکن زبان نہ کھولی۔ دنیا کے تجربات سے فائدہ نہ اُٹھایا اور کانوں سے ہدایت نہ سنی۔ حق پر غور کرتے، تبھی ایمان نصیب ہوتا۔ ایسا نہ کرنے کا انجام ظاہر ہے کہ اُن کے لیے سقر مقرر ہے۔ مجھے اور آپ سب حضرات کو چاہیے کہ حق کو حق جانیں اور اس پر عمل پیرا ہوں، باطل کو باطل سمجھیں اور اس سے بچیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.[2]



---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸٦۸)

[2] سہ روزہ ''منہاج'' لاہور (یکم مارچ 1958ء) مرتب: جناب ابوعزیز عبدالواحد صاحب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ایمان بالآخرۃ کے فوائد وثمرات

﴿ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا جَدِيۡدًا ۞ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ وَجَعَلَ لَهُمۡ اَجَلًا لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوۡنَ اِلَّا كُفُوۡرًا ۞ قُلۡ لَّوۡ اَنۡتُمۡ تَمۡلِكُوۡنَ خَزَآئِنَ رَحۡمَةِ رَبِّىۡۤ اِذًا لَّاَمۡسَكۡتُمۡ خَشۡيَةَ الۡاِنۡفَاقِ ؕ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا ۞﴾ [بني إسرائيل: ٩٨-١٠٠]

''یہ ان کی سزا ہے، کیونکہ انھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا: کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا یقیناً ہم دوبارہ ازسرِنو پیدا کر کے اٹھائے جانے والے ہیں؟ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک جس اللہ نے آسمان اور زمین تخلیق کیے، وہ اس پر قادر ہے کہ ان جیسے پھر تخلیق کر دے، اور اس (اللہ) نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے جس میں کوئی شک نہیں، پھر ظالموں نے انکار کیا مگر کفر کرنے سے (انکار نہ کیا)۔ کہہ دیجیے: اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو اس وقت تم انھیں خرچ ہو جانے کے ڈر سے ضرور روک لیتے اور انسان نہایت ہی بخیل ہے۔''

کفار کا انجام بد:

اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور جسے وہ گمراہ کر دیں تو کوئی نہیں جو اس کو ہدایت دے۔ گمراہوں کو قیامت کے دن اندھا گونگا اور بہرہ کر کے سر کے بل چلایا جائے گا۔ ایسا کیوں کیا جائے گا؟ اس لیے کہ یہ لوگ سیدھا راستہ اختیار کر کے ہدایت قبول کرنے کے بجائے الٹا چلے اور اپنے لیے ضلالت کو پسند کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آنکھیں دی تھی، لیکن انھوں نے حقائق سے

آنکھیں بند کرلیں، ان کو زبان دی گئی تھی کہ اس سے اپنے خالق کی حمد وثنا کریں، لیکن انھوں نے اس کا غلط استعمال کیا، ان کو کان دیے گئے تھے کہ کلامِ الٰہی کو سنیں، لیکن انھوں نے گمراہی کی باتیں ہی سنیں، گویا تمام قوتوں کا الٹا استعمال کیا، اس لیے قیامت کے روز ان کو بھی سر کے بل، یعنی الٹا ہی چلایا جائے گا اور دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔

اس سزا کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، حق کو ماننے کے بجائے آخرت کا انکار کیا، بلکہ الٹا سوال کیا:

﴿ ءَاِذَا كُنَّا عِظٰمًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٩]

''کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ از سرِ نو پیدا کر کے اُٹھائے جانے والے ہیں؟''

انکارِ آخرت کے مفاسد:

انسانی زندگی پر دوبارہ زندہ ہونے اور آخرت کے اس تصور کا بڑا اثر ہے، جس آدمی کو اس پر یقین نہیں ہے وہ جو چاہے کرسکتا ہے، دین سے جس قدر چاہے لڑائی کرے، بے ایمانی اور باطل کو جتنا چاہے اپنا لے، لوگوں کا مال کھانے میں ذرا برابر شرم اور تکلیف محسوس نہ کرے۔ آخرت پر یقین کا نہ ہونا تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ حکومتیں قتل کرتی ہیں، امراء فساد کرتے اور کراتے ہیں، علماء جھوٹ بولتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

یہ سب اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ آخرت کی باز پرس کا خیال نہیں ہوتا اور زندگی بعد از موت کا تصور یا تو ذہن سے ختم ہوجاتا ہے یا مدہم پڑ جاتا ہے۔ کفار نے بھی اسی وجہ سے معاد کا انکار کیا اور کہا کہ بوسیدہ ہڈیوں اور مٹی کو ہرگز زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٩]

''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک جس اللہ نے آسمان اور زمین تخلیق کیے، وہ اس پر قادر ہے کہ ان جیسے پھر تخلیق کر دے، اور اس (اللہ) نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے جس میں کوئی شک نہیں، پھر ظالموں نے انکار کیا مگر کفر کرنے سے (انکار نہ کیا)۔''

ایک واقعہ:

ایک شخص قریب المرگ تھا، جب اس نے اپنے اعمال پر نظر کی تو اس نے سمجھا کہ زندگی بالکل اکارت گنوا دی۔ کوئی اچھا کام نہ کیا، اب عذاب سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ آخرت اور دربارِ الٰہی کی باز پرس کا خوف اس کے دل پر محیط ہوگیا۔ اس نے اپنے لڑکوں کو بلایا اور وصیت کی کہ میری لاش کو جلا دینا اور راکھ کے ایک حصے کو ہوا میں اُڑا دینا اور دوسرے کو دریا میں بہا دینا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی کو اس کی راکھ جمع کرنے کا حکم دیا اور اس کو زندہ کیا۔ سوال کیا گیا کہ ایسا کیوں کیا ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ تمام زندگی تو کوئی نیک عمل نہ کیا، اس لیے اپنے تباہ ہونے کا پورا یقین تھا اور یہ کام اسی خوف کی وجہ سے کیا ہے کہ عذاب سے بچ جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا اور کہا کہ تمھارا یہ خوف اور ڈر تمھاری بخشش کی وجہ بنا ہے۔[1]

برائی کرتے وقت ہمارے ذہن میں خدا تعالیٰ کا ڈر اور آخرت کا تصور نہیں ہوتا۔ اگر یہ یقین ہو کہ اس دنیا کا کوئی خدا ہے اور مر کر دوبارہ زندہ ہونا ہے اور ہر چیز کا حساب بھی دینا ہے تو پھر برا کام کس طرح ہوسکتا ہے؟

کفار کی ہٹ دھرمی:

زندگی بعد از موت کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔ آخرت کے بے شمار نشانات ہیں، لیکن اس کے باوجود کفار نے اس کو ماننے سے انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ آسمان و زمین کی پیدایش کی طرف اشارہ کر کے ان کو ذہن نشین کرایا ہے کہ جو ہستی ایسی چیزیں بنا سکتی ہے، وہ انسان کو موت کے بعد دوبارہ زندہ بھی کر سکتی ہے۔

مال و دولت کی کثرت انسان میں سرکشی پیدا کر دیتی ہے۔ ﴿ اِنَّ الْاِنْسٰنَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴾[العلق: ٦۔ ٧] ”انسان تو یقیناً البتہ سرکشی کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ خود کو بے پروا سمجھتا ہے۔“ اس کی بہتات فواحش کا باعث بنتی ہے اور گناہ میں دلیر بنا دیتی ہے۔ انسان کو اگر مال و دولت کے خزانے مل جائیں تو انسان ان کو روک لیتا ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے: ﴿ لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ ﴾[الإسراء: ١٠٠]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١٥٧)

اگر تم کو تمام خزانوں کا مالک بنا دیا جائے تو تم ان کو محفوظ کرنے کے لیے روک لو۔ اس طرح دوسروں کے لیے زندگی دوبھر کر دو۔

مال و دولت سے بے رغبتی:

پیغمبر دنیا کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کی سخاوت کی مثال ہوا کی سی ہے، جو ہر وقت چلتی ہے۔[1]

آپ کے پاس متعدد مرتبہ بے حساب مال و دولت آیا، لیکن آپ نے فوراً تقسیم کر دیا۔ ایک مرتبہ آپ بیمار ہوئے۔ سر مبارک عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے زانو پر تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ فلاں سونا تقسیم کیا جا چکا ہے یا نہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ نہیں، تو اسی وقت آپ ﷺ نے کہا کہ میرا سر تکیے پر رکھ دو اور جا کر سونا تقسیم کر دو۔[2] انسان کو پورا علم ہوتا ہے کہ یہ خرچ کرنے کا موقع ہے، لیکن خرچ نہیں کرتا۔ محتاج اور مستحق موجود ہوتا ہے اور مال داروں کو اس کا بھی علم ہوتا ہے، لیکن مال و دولت کو روکنے والے ان کی پروا نہیں کرتے۔

خدا سے دعا ہے کہ ہمیں ایسے مال سے بچائے، جو ہمارے لیے آخرت میں رسوا کن ثابت ہو اور آرزو ہے کہ ہم سب کو عملِ صالح کی توفیق عطا کرے۔[3]



[1] دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٠٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٠٨)

[3] سہ روزہ ''منہاج'' لاہور (25/ مارچ 1958ء) ترتیب: مولانا عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکرِ آخرت

﴿وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿95﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿96﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾

[الأنبياء: ٩٥_٩٧]

”اور ہر بستی جسے ہم نے ہلاک کیا ہے، اس پر لازم ہے کہ بلاشبہ وہ (اس کے باشندے دنیا کی طرف) نہیں لوٹیں گے۔ حتی کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے تیزی سے (دوڑتے) آئیں گے۔ اور سچا وعدہ (یومِ قیامت) قریب آ پہنچے گا، تب کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، (اور وہ کہیں گے:) ہائے ہماری کم بختی! ہم اس (وعدے) سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم ہی ظالم تھے۔“

کفار کی دو غلط فہمیاں:

حضرت محمد ﷺ کے مخالفین دو بڑی غلطیوں میں مبتلا تھے:

1. ایک خدا کے متعلق غلط تصور۔
2. آخرت سے انکار۔

یہ لوگ دنیوی مقاصد کے حصول کے لیے سامنے رکھے ہوئے مجسم بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ کسی برائی میں پھنس کر نکلنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ مصلح ان میں بھی پیدا ہوتے رہے۔ ابن ابی کبشہ اور زید بن عمرو بن نفیل جیسے موحدین نے اپنی قوم کی بہت اصلاح چاہی، لیکن بت پرستی کے بھنور میں پھنسی ہوئی قوم کو کنارے پر لے آنا، ان کی طاقت سے باہر تھا۔ یہ بات ان کے دل و دماغ میں جڑ

پکڑ چکی تھی کہ جب ہمارے آباء واجداد کا یہی مذہب تھا اور ہمارے بھائی اسی راہ کے پیرو ہیں تو ہم اپنی غلطی کیوں تسلیم کر لیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم مرکر دوبارہ جی اٹھیں گے اور پھر ایک خدا کے سامنے پیش ہوں گے؟

﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴾ [قٓ: ۳]

''کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو کیا دوبارہ اُٹھائے جائیں گے؟) یہ واپسی تو (عقل سے) بہت بعید ہے۔''

گناہ سے چھٹکارا بہت مشکل ہے:

ٹھیک اسی طرح جس طرح آج ہماری حالت ہے۔ جو کوئی کسی گناہ میں الجھا ہوا ہے، اسے وہاں سے نکلنا گوارا نہیں؛ تُجار ہوں یا ملازمت پیشہ، اہلِ زراعت ہوں یا اصحابِ صنعت وحرفت، سیاسی لیڈر ہوں یا ملکی حکام، چند ایک کے سوا ہر کسی کو بددیانتی کا ایسا چسکا لگا ہوا ہے، جو چھوٹنے والا نہیں۔ طبقۂ علماء بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ منبر ومحراب میں اثر نہ رہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ علماء کو جن بیماریوں کا علاج ہونا چاہیے، وہ خود ان کے مریض ہو گئے۔ پھر کوئی بھی تو ایسا نہیں جو اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنا چاہتا ہو۔ ہر ایک یہی سوچ کر اپنے دل کو جھوٹی تسلی دے لیتا ہے کہ میں اس وادی میں کوئی تنہا تھوڑا ہوں، فلاں فلاں بھی تو شریک ہیں۔ یعنی گناہ، گناہ کی دلیل بن چکا ہے اور جھوٹ، جھوٹ کے لیے تائید!

باپ دادا کی تقلید تباہی کا راستہ:

یاد رہے! کفارِ عرب کو بھی باپ دادوں کی تقلید ہی نے مارا تھا، جب وہ زید بن عمرو بن نفیل جیسے مصلحین کو خاطر میں نہ لائے تو خداوندِ کریم نے پیغمبر بھیج کر ان کی کایا پلٹ دی۔ نبی اکرم ﷺ نے تشریف لا کر ان کے سوچنے کا انداز ہی بدل دیا، انھیں بتایا کہ خدا ایک عظیم ہستی کا نام ہے اور اس نے انصاف کو بروئے کار لانے کے لیے جزا وسزا کا ایک دن متعین کر رکھا ہے، جسے قیامت یا آخرت کہتے ہیں۔ یہیں سے پیغمبر کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ قوم جو کسی شمار وقطار میں نہ تھی، جب خدا کے صحیح تصور کو پا گئی، اس سے قیامت کا مفہوم اخذ کر لیا اور اس پیغمبر کے نقشِ قدم پر چلنے لگی جو ان حقائق

کی تعلیم و تربیت دیتا تھا تو اس کی صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ وہ دنیا میں درندوں کی طرح نہیں، انسانوں کی طرح جینے لگے اور ہم عصروں کو دشمن اور رقیب سمجھنے کے بجائے دوست اور بھائی سمجھنا شروع کر دیا۔

تین بہترین صفات:

بات یہ ہے کہ ایک آدمی اگر خدا کا بندہ، پیغمبر کا فدائی اور آخرت سے لرزاں و ترساں ہے تو طمع اس کے دل میں جگہ نہیں پا سکتی، جب کہ یہی (طمع) تمام مفاسد اور شرارتوں کی جڑ ہے، ورنہ ان تین بنیادی چیزوں میں سے کسی ایک سے بھی غفلت کی جائے تو دل شیطانی وسوسوں کی آماجگاہ بن کر رہ جاتا ہے۔ سکون اور اطمینان کی دولت چھن جاتی ہے اور انسان دنیوی اغراض کا شکار ہو کر انسان نہیں رہتا، کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ اور اگر راسخ العقیدگی سے ان اصولِ ثلاثہ کو اپنا لیا جائے تو طبیعت میں ایک شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ یقین جانیے جس دل میں خدا کا ڈر، آخرت کی یاد اور پیغمبر ﷺ کی محبت موجزن ہو، اسے دنیا سے استغنائے کامل حاصل ہو جاتا ہے۔ اس میں وہ ذلیل و خسیس خواہشیں نشوونما نہیں پاتیں، جن کی بدولت انسان جابجا ذلت اور کمینگی کا مظاہرہ کرتا ہوا پایا جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کو ان صفات کا حامل حاکم نصیب ہو جائے تو پھر اس کی خوش قسمتی میں کلام نہیں۔

ایک واقعہ:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بنو امیہ کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو دماغی چالوں کے ذریعے نہیں، اپنے درویشانہ مزاج اور فرشتگانہ سیرت کی وجہ سے سنبھال لیا تھا۔ آپ کی زندگی کا ایک ہی واقعہ ان کی قلبی دنیا پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے:

عید نزدیک آ گئی تھی، لوگ اس کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بچے ماں کے پاس روتے ہوئے آئے اور نئے کپڑے سلوانے کی خواہش ظاہر کی۔ والدہ متاثر ہوئیں، اتنے میں حضرت عمر رحمہ اللہ بھی تشریف لے آئے اور معصوم بچوں کی ننھی ننھی درخواست اور اپنی مجبوری کے پیشِ نظر آنسو بہا دیے۔ کچھ سوچ کر خلیفۂ وقت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ناظمِ مالیات کو چٹھی لکھی کہ مجھے ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی دے دی جائے۔ وہاں سے جواب آیا: کیا آپ ضمانت دیتے ہیں کہ ایک ماہ تک مزید زندہ رہ سکیں گے؟ جواب معقول تھا، خلیفۂ وقت بھی خاموش ہو گئے اور اہل و عیال بھی چپ۔

خلیفۂ اسلام کے نام فنانشل سیکرٹری کے اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے دوسروں کو بھی اسی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ جب خازن کی دیانت داری اور جرأت کا یہ حال ہے تو عمرِ ثانی رحمہ اللہ کے تقوے کا کیا عالم ہوگا؟ یہ سب نتیجہ تھا اخروی عدالت کو پیشِ نظر رکھنے کا، لیکن جن دماغوں پر صرف دنیا سوار رہتی ہے، وہ جائز و ناجائز کی پروا نہیں کرتے، انھیں حلال و حرام کی تمیز سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

یوں تو ہر کسی کو ملّی خدمت اور قومی اصلاح کا نعرہ لگاتے دیکھا جاتا ہے، لیکن صحیح معنوں میں بنی نوعِ انسان کو صرف وہ شخص سنوار سکتا ہے جو دنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کو ہیچ سمجھتے ہوئے پبلک کی تکلیف کو اپنی تکلیف تصور کرے۔

کامیابی کا راز:

رسولِ کریم ﷺ اپنی مقدس تحریک میں کیوں کامیاب ہوئے؟ اس ایثار پیشہ پیغمبر نے سارے جہان کی مصیبتیں اپنے سر مول لے لی تھیں۔ آپ نے انھیں ہر طرح کی تکلیفوں اور اخلاقی اور روحانی بیماریوں سے نجات دلانا اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ آپ نے بندۂ درہم و دینار نہیں، بلکہ بندۂ خدا بن کر قوم کو اللہ العلمین کی بندگی کا وعظ کیا۔ آپ نے اس زندگی کو مستقل سمجھتے ہوئے خود کو دنیوی کاموں کے لیے وقف نہیں کیا، بلکہ اسے عارضی سفر اور عبوری دور پر محمول کرتے ہوئے سفرِ آخرت کی تیاری کی اور اپنی امت کو بھی تلاشِ آخرت کی تلقین کی۔ فرمایا:

«اَلْمُؤْمِنُ كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ»[1]

”مومن کی مثال ایک سوار کی طرح ہے، جو درخت کے سائے میں چند گھڑیاں بیٹھا اور آگے چل دیا۔“

آخرت سے غفلت کیوں؟

واقعی سوچنے کی بات ہے، اگر ہمارا اخروی زندگی پر ایمان ہے تو بلبلۂ آب کی مانند اس بے حقیقت زندگی کے لیے کیوں اتنی جان کھپاتے ہیں؟ حیاتِ اخروی کے لیے کیوں نہ کچھ کیا جائے، جو دائمی بھی ہے اور پائیدار بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا ہی سرے سے حماقت ہے۔ یہ

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٧٧) ولفظه: «مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ»

وقت ہمارے لیے غنیمت ہے، اسے رائیگاں نہیں جانے دینا چاہیے، یہ لوٹ کر دوبارہ ہاتھ نہیں آتا۔

دنیا میں کسی کا مر کر جینا قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ مرے ہوئے لوگ قیامت سے پہلے اٹھ نہیں سکتے۔ بعد میں دستِ تاسف ملنے کے بجائے ہمیں ابھی سے وقت کی نزاکت کا احساس کرنا چاہیے۔ قیامت تو خیر قیامت ہوگی، دنیا میں بھی جب کسی کی اجل آجاتی ہے تو واپسی محال ہوتی ہے۔

قومِ عاد نے اپنے پیغمبر ''ہود'' علیہ السلام کی بات نہ مانی اور چیلنج کیا: ﴿ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ الصَّٰدِقِينَ ﴾ [الأحقاف: ٢٢] ''چناں چہ اگر تو سچوں میں سے ہے تو ہمارے پاس وہ (عذاب) لے آ جس کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے۔'' ایک روز انھوں نے اپنی بستی کی طرف غبار سا آتے دیکھا تو کہنے لگے: بادل آیا ہے، بارش ہوگی۔ فرمایا: ﴿ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم بِهِۦ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ [الأحقاف: ٢٤] ''بلکہ یہ تو وہ (عذاب) ہے جسے تم جلدی طلب کرتے تھے۔ (یہ) آندھی ہے، اس میں نہایت دردناک عذاب ہے۔'' اور انھیں صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا گیا۔

رات کو سوتے وقت گزشتہ دن پر تفصیلی نگاہ ڈال لیا کرو کہ آج کیا کھویا اور کیا پایا۔ اس سے مقصود اپنی اصلاح ہے۔ ہمیں کسی حالت میں بھی خدا کی عدالت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ آج جن سچائیوں کو بے پروائی سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، روزِ قیامت جب غفلت شعار لوگ بہ چشمِ خود انھیں ملاحظہ کریں گے تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، گویا (آنکھیں) پتھرا گئی ہوں۔

گناہ پر جرأت کا سبب:

آنکھوں کا جھپکنا بھی ایک نعمت ہے، اس میں حسن پایا جاتا ہے، ٹھنڈک ملتی ہے اور سکون بھی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس روز شدتِ وحشت اور کثرتِ غم و اندوہ سے آنکھیں ٹکٹکی لگ جائیں گی اور پلکیں جھپکیں گی نہ پتلیاں ہی ناچیں گی۔ لیکن یہ معاملہ بعد از وقت ہوگا۔ اگر دنیا ہی میں خدا کی باتوں پر یقین کر لیا ہوتا تو عاقبت کی پشیمانی سے نجات مل جاتی۔ ہم لوگ زیادہ تر گناہوں پر جرأت ہی اس وقت کرتے ہیں، جب موت اور قیامت کا مہیب تصور ہمارے دماغ سے نکل جاتا ہے۔

نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

«أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ، يَعْنِي: اَلْمَوْتَ» ①

''یعنی اس موت کو یاد کیا کرو جو تمام مزے اور لذتیں مٹا دیتی ہے۔''

افسوس ناک حالت:

لیکن تعجب ہے، میت پاس پڑی ہوتی ہے اور ہم اپنی باتوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ ایک صحابی کہتے ہیں حضور ﷺ کے زمانے میں جنازے کے وقت ہماری یہ حالت ہوتی: « كَأَنَّ عَلٰى رُؤُسِنَا الطَّيْرَ» ②

''گویا ہمارے سروں پر پرندے (بیٹھے) ہوں۔''

ہمیں ابھی سے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، تاکہ کل ہمیں بھی یہ نہ کہنا پڑے: ﴿ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩٧] ''ہائے ہماری کم بختی! ہم اس (وعدے) سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم ہی ظالم تھے۔''

ظلم کہتے ہیں: کسی چیز کے بے محل تصرف کو۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہماری زندگی، جو صرف خدا کے لیے ہے، اسے مستقل سمجھ کر فقط اپنے ذاتی کام میں لایا جائے؟ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ توحید اور نبوت کو صحیح مانے بغیر ہماری دنیا سنور سکتی ہے نہ آخرت۔ خدا ہمیں نیکی کی توفیق دے۔ آمین ③



① سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٠٧) صحيح ابن حبان (٢٩٩٢)

② سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٠١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٤٩)

③ خطبہ بتاریخ 8 مارچ 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (29 مارچ 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شرک کا ایک پہلو

﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿98﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿99﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿100﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿101﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿102﴾﴾

[الأنبیاء: ۹۸-۱۰۲]

’’بے شک تم اور جن کی اللہ کے سوا تم عبادت کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں، تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔ اگر یہ (واقعی) معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور وہ سب ہمیشہ اس (جہنم) میں رہیں گے۔ اس میں ان کے لیے چیخنا چلانا ہو گا اور وہ اس میں (کچھ) نہ سن پائیں گے۔ بے شک جن لوگوں کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی نیکی اور بھلائی مقدر ہو چکی ہو، وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ اس کی آہٹ (بھی) نہ سنیں گے اور وہ ان (نعمتوں) میں ہمیشہ رہیں گے جو ان کے دل چاہیں گے۔‘‘

بت پرستی کا سبب:

عرب میں بت پرستی کا رواج عام تھا۔ وہ لوگ اتنے احمق اور گئے گزرے نہیں تھے کہ ان پتھر کی مورتیوں کو حقیقی خدا تصور کر لیتے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انبیاء اور صلحاء کی ارواحِ مقدسہ ان میں حلول کیے ہوئے ہیں۔ خدا تعالیٰ سے براہِ راست ان کا گہرا تعلق ہے، ان کی کوئی بات رد نہیں کی جاتی اور ان کی سفارش کے بغیر خدا کسی کی نہیں سنتا۔ جیسے فرمایا:

﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ [یونس: ۱۸]

”اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں نہ نقصان دیتی ہے اور نہ نفع دیتی ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔“

دوسرے مقام پر ان کی بابت یوں کہا:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر: ۳]

”ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں۔“

اس کے باوجود اسلام نے اس حرکت کو ”شرک“ اور اس کے مرتکب کو ”مشرک“ کہا ہے۔

قبر پرستی:

آج کل قبر پرستی کا جو مفہوم ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، وہ اس سے کچھ مختلف نہیں۔ ہمارے کمزور عقیدے کے بھائی بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اس قبر میں فلاں بزرگ سمائے ہوئے ہیں، خدا کے ہاں ان کی بڑی پہنچ ہے، ان کی وساطت اور وسیلے سے مانگی ہوئی دعائیں بارگاہِ الٰہی میں وزن اور دباؤ رکھتی ہیں اور انہی کی طفیل خدا مخلوق پر رحم کرتا ہے۔ اس پُر از وہم نظریے کے تحت، قبروں کے پجاری وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو شاید بت پرستوں سے بھی نہ ہو سکا ہو گا۔ انتہا یہ ہے کہ مزاروں کے آس پاس اُگے ہوئے درختوں کو بھی بزرگ کی ہمسائیگی کے اثر سے مقدس سمجھ کر ”کرنی والا“ فرض کر لیا جاتا ہے اور ان سے مرادیں وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ تعویذ اور دھاگے اکثر آپ نے درختوں کی شاخوں سے لٹکے دیکھے ہوں گے۔

وسیلہ:

درمیانی واسطے خدا اور بندے کے درمیان وسیلہ نہیں، بلکہ رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اللہ حقیقی کی طرف راہ نہیں دکھاتے، بلکہ سرِ راہ خود اپنی الوہیت کا اعلان ہو جاتے ہیں۔ اہلِ شرک سے خدا نے کہا: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ [الأنبیاء: ۹۸] ”بے شک تم اور جن کی اللہ کے سوا تم عبادت کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں۔“ ان کے معبود کیا تھے؟ تراشیدہ پتھر تھے۔ دوسری جگہ صاف فرمایا: ﴿ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ [البقرۃ: ۲٤] ”جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔“ بھلا پتھروں کو عذاب دینے سے فائدہ؟ ان میں تو احساس ہی نہیں، انھیں سارا دن بھٹی

میں تپاتے رہیے، کوئی تکلیف محسوس ہوگی؟

درخت جو نامی[1] ہونے کی وجہ سے حیوانات سے ایک گُونہ مناسبت رکھتے ہیں، وہ بھی جل کر کوئلہ اور کوئلے سے راکھ ہو جائیں گے، لیکن مجال ہے کوئی ٹیس پہنچ جائے۔ بات یہ ہے، ان بے حس بتوں کو تکلیف ہو یا نہ ہو، انھیں بے یار و مددگار آگ میں دہکتے پا کر ان کافروں کو ضرور تکلیف ہوگی، جو کل تک انھیں ذریعۂ نجات سمجھتے رہے ہوں گے، ان کے منہ سے بے ساختہ نکلے گا: ﴿ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِـهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ﴾ [الأنبیاء: ۹۹] ''اگر یہ (واقعی) معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے۔''

پوجا کی خواہش:

یہ اتفاق کی بات ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مشرکین بتوں کو پوجتے تھے اور ان کے متعلق کہہ دیا گیا: پتھر بھی آگ کا ایندھن بنیں گے اور ہر معبودِ باطل کا حشر یہی ہوگا۔ دورِ حاضر کے ناسمجھ بھائیوں کو سراسر غلط فہمی لگی ہے کہ ''شرک کے زمرے میں صرف بت پرستی ہی آتی ہے۔ بتوں کے علاوہ اگر کسی بزرگ میں خفیہ طاقتیں تسلیم کرتے ہوئے اس کے حضور سرِ تسلیم و نیاز خم کر دیا جائے تو یہ شرک نہیں ہے اور نہ اس سے اس شخصیت پر کوئی دھبا ہی آتا ہے، جس سے یہ معاملہ کیا جائے، ورنہ حضرت عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام کی تو صاف پرستش کی گئی ہے، پھر بھی وہ بری الذمہ قرار پائیں گے۔''

بات یہ ہے، اس آیت نے تو پہلے ہی ایسے لوگوں کو مستثنیٰ قرار دے دیا ہے، کیوں کہ ﴿ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ میں ﴿ مَا ﴾ غیر ذوی العقول کے لیے ہے، لیکن آگے اس طرح وضاحت ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴾ [الأنبیاء: ۱۰۱] ''بے شک جن لوگوں کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی نیکی اور بھلائی مقدر ہو چکی ہوگی، وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔'' ﴿ حُسْنٰى ﴾ سے مراد توحید، سنت کی پیروی، حسنِ عمل، حسنِ اخلاق اور ہر اچھی بات ہوسکتی ہے۔

گذشتہ زمانے کے انبیاء، صلحاء اور اتقیاء جن کی زندگیاں حسنِ عمل کی بہترین مظاہر تھیں، ان کی خواہ کتنی بھی عبادت کی گئی ہو، آگ کی آہٹ تک نہیں سن پائیں گے۔ اس سے یہ پتا چلا کہ یہ وعدہ

---

[1] نشوونما پانے والا۔

ان کے لیے نہیں جو اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اپنی جگہ خواہ کوئی کتنا بھی بڑا ہوتا رہے، اگر پجنے کی خواہش رکھتا ہو تو اسے وارِدِ جہنم ہونے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ رہا یہ سوال کہ ﴿ مَا ﴾ غیر ذوی العقول کے لیے ہے تو گزارش ہے کہ ایسے لوگ اس قابل ہی کب ہیں کہ انھیں ذوی العقول میں شمار کیا جائے!

وہ بری الذّمہ تھے:

حضرت علی ہجویری لاہوری رحمہ اللہ اور جناب بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمہ اللہ کے لٹریچر سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ ان کی زندگیاں مقدس اور شرک و بدعت سے بے داغ تھیں۔ یہ فرشتہ سیرت لوگ اس پوجا پاٹ کی مطلق خواہش نہیں رکھتے تھے، جو آج ان کے مزاروں پر اپنی دکانداری چمکانے کے لیے عقیدت و احترام کے نام پر ہو رہی ہے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جس فوج کے ساتھ یزید نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا، اس میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ طویل محاصرے کے بعد قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ لشکر واپس ہونے لگا تو ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیمار پڑ گئے۔ وصیت فرمائی کہ مجھے قسطنطنیہ کے قریب ترین دفن کیا جائے۔ فوت ہو گئے تو یزید نے عیسائیوں کی مرضی کے خلاف انھیں شہر کی فصیل کے نیچے سپردِ خاک کیا۔[1]

اگر آپ کو پرستش کی خواہش ہوتی تو مسیحی ایریا کے بجائے کسی اسلامی علاقے میں دفن ہونے کو ترجیح دیتے، جہاں ان کے معتقدین بھی بکثرت موجود تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس پر قبہ تعمیر کیا جائے گا اور پوجا ہونے لگے گی۔ ایسی ہستیاں واقعی پرستاروں کی عبادت سے بری ہوتی ہیں۔

لیکن جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی ہڈیاں ان کی اولاد کے لیے سامانِ خور و نوش بنیں، قبہ بنایا جائے، چڑھاوے چڑھائے جائیں اور نذریں مانی جائیں، یعنی دوسرے لفظوں میں وہ خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان حائل ہو جائیں، وہ یقین کر لیں کہ ان کا انجام ﴿ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ سے الگ نہیں ہوگا۔

استقبال کے لیے کھڑا ہونا:

عبادت تو بڑی بات ہے، کسی کے دل میں اتنی بھی آرزو ہو کہ اس کی آمد پر اہلِ مجلس اٹھ کر

[1] دیکھیں: فتح الباري (١٠٣/٦)

استقبال کیا کریں تو اس کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَاماً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» [1]

''جو پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کی خاطر اٹھیں، وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے۔''

اگر کوئی دور یا دیر سے آئے اور لوگ از خود ملنے کے لیے بے تابی سے اٹھ کر کھڑے ہوں تو کوئی حرج نہیں، لیکن ہر آمدورفت کے موقع پر اٹھک بیٹھک کا رواج، جیسا کہ اہلِ فارس اپنے بادشاہوں کی تعظیم کے لیے کیا کرتے تھے، بالکل ممنوع ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں کہ وہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ایسا کیا کرتے ہوں۔

ایک یہ پیر و مرشد ہیں، جن کی دلی خواہش، بلکہ درِ پردہ حکم ہوتا ہے کہ ان کی آمد پر ان کے مرید اٹھ کر تعظیم بجالایا کریں۔ شاید یہ اپنا مقام رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلند تر سمجھتے ہیں (العیاذ باللہ)۔

غلط قسم کے پیروں اور اندھے عقیدت مندوں کی بابت ارشاد فرمایا: ﴿ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ﴾ [الأنبياء: ١٠٠] ''اس میں ان کے لیے چیخنا چلانا ہوگا اور وہ اس میں (کچھ) نہ سن پائیں گے۔''

نیک لوگوں کے متعلق خوش خبری دی: ﴿ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ ﴾ یعنی اہلِ جنت کو منہ مانگی مراد ملے گی۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے دنیا میں رہ کر شیطان سے مڈبھیڑ ہونے کے باوجود حسنِ کردار کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ یہ لوگ جیسے خود نیک اور پارسا ہوں گے، ان کی خواہشیں بھی معصوم اور قابلِ داد ہوں گی۔

خدا ہمیں سوچنے سمجھنے کی توفیق دے۔ آمین [2]



[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٢٩)

[2] خطبہ بتاریخ 15 مارچ 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (5 اپریل 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حکومت کے وارث کون؟

﴿ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۚ كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهٗ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿104﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿105﴾ ﴾ [الأنبياء: ١٠٤-١٠٥]

”جس دن ہم آسمان کو لکھے ہوئے کاغذ کے لپیٹنے کی طرح لپیٹ دیں گے، جس طرح ہم نے پہلی تخلیق کی ابتداء کی تھی، اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ (یہ) وعدہ ہمارے ذمے ہے، بے شک ہم اسے (پورا) کرنے والے ہیں۔ اور بلاشبہ ہم زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ بے شک میرے صالح بندے زمین کے وارث ہوں گے۔“

ربطِ آیات:

دو طرح کے لوگوں کا ذکر ہوا تھا: ایک وہ جو جہنم کا ایندھن بنیں گے، دوسرے وہ جنھیں بہشتِ بریں میں ہمیشہ کی زندگی عطا ہوگی۔ یہ اچھا یا برا انجام ہوگا، ہر کسی کے اعمال کا۔ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء۔ یہ اسی روزِ آخر کے آغاز کا بیان ہے، فرمایا: جس دن ہم آسمان کو لپیٹیں گے، جیسے ایک بہت بڑی کتاب (طومار، دفتر) لکھے ہوئے اوراق کو لپیٹ لیتی ہے۔

”طَيّ“ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

1. ”لپیٹنا“ جس طرح کاغذ یا کپڑا وغیرہ تہہ کیا جاتا ہے۔
2. ”ختم کرنا“ کسی خاندان کا بڑا آدمی فوت ہو جائے یا زیادہ تعداد میں موتیں واقع ہو جائیں تو کہتے ہیں: ان کی صف لپیٹ لی گئی۔

اس جگہ یہی دوسرا مفہوم مراد ہے۔ روزِ قیامت زمین و آسمان و مافیہما کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ پوری کائنات لپیٹ کر رکھ دی جائے گی اور سب کچھ ملیا میٹ ہو گا۔ گویا کچھ تھا ہی نہیں۔

سلسلۂ نشر:

ذرا دورِ ماضی کی طرف نظر دوڑایئے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب آدم وحوا کسی نامعلوم گوشے میں نظر آرہے تھے، پھر کیا ہوا؟ ﴿ وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ﴾[النساء:۱] خدا نے آدم وحوا کے ذریعے سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا، حتیٰ کہ اولادِ آدم نے ربعِ مسکون کو بھر دیا۔ ہر صاحبِ نسل اپنی جگہ ایک آدم ہوتا ہے، جیسے مسئلۂ رہایش، تلاشِ روزگار یا باہم نبھ نہ سکنے کی وجہ سے بہو بیٹا، باپ سے جدا ہو کر الگ گھر بسا لیتے ہیں اور ایک نئے خاندان کی بنیاد بندھتی ہے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی بے شمار اولاد نے گروہ در گروہ مختلف خطہ ہائے زمین کو اپنے وجود سے آباد کر دیا تو کئی قومیں معرضِ وجود میں آ گئیں۔ کئی مذاہب رونما ہوئے، ان گنت زبانیں بولی گئیں، لاتعداد رواج اور تہذیبیں اختیار کی گئیں اور متعدد قسم کے نظام ہائے دنیا ظہور میں آئے۔ یہ سب سلسلہ ہے نشر کا، کہ کائنات کے اوراق بکھرتے چلے گئے اور جہان ایک کھلی کتاب بن گیا۔

خدا رزّاق ہے:

خدا کی رزاقیت ملاحظہ ہو، جو کبھی چند ایک کے لیے روٹی کا سامان کیا کرتا تھا، اب اربوں انسانوں اور دیگر بے شمار مخلوقات کو کھلائے جا رہا ہے اور وہاں کوئی فرق نہیں۔ روزی کا جھگڑا آج ہی درپیش نہیں ہوا، انسان ہمیشہ ہی اس مسئلے پر سوچتا آیا ہے۔ شاید ہم نظامِ قدرت پر غور نہیں کرتے۔ جوں جوں آبادیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا، قدرت کے خزانوں میں وسعت آتی گئی۔ زمین اپنے خزانے اگلتی جا رہی ہے اور ضروریاتِ زندگی فراہم ہو رہی ہیں۔ قدرتی اسباب اور بنی نوعِ انسان کی جدوجہد نے زمین سے کیا کچھ برآمد کر ڈالا۔ اتنا کچھ نکل آنے پر بھی یہ زمین اور یہ آسمان بانجھ نہیں ہو سکے، وہ برابر مصروفِ نشر ہیں۔

کائنات میں تنوع:

پھر نشر کا تعلق صرف پھیلاؤ ہی سے نہیں، ہمیں خدا کی مخلوق میں ایک تنوع بھی محسوس ہوتا ہے۔ نیرنگیِ قدرت ہر چیز میں نمایاں ہے، انسان بھی اس سے مبرّا نہیں۔ یہ غریب اور امیر، یہ مزدور اور سرمایہ دار، یہ کسان اور زمین دار، یہ رعایا اور بادشاہ؛ سب قدرت کی رنگینیاں ہیں۔

عدل کا حکم اسی لیے ہے کہ نچلی سطح کے لوگوں پر ظلم کر کے کوئی طبقہ اپنی برتری کا غلط فائدہ نہ اٹھائے۔ انبیاء کے خاندان بھی عزت پاتے ہیں، لیکن ان کی عزت ان میں پیدا ہونے والے پیغمبر کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ ایک پیغمبر نہ صرف اپنی قوم کے لیے باعثِ قدر و منزلت ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات مسکنِ نبوی کو بھی ایک امتیازی شان حاصل ہو جاتی ہے۔ ہمارے لیے خاندانی برتری موجبِ فخر و مباہات ہوتی ہے، لیکن اس کے برعکس انبیاء کی شخصیت ان کی آل کے لیے باعثِ افتخار ہوتی ہے ؎

لَا بِقَوْمِي شَرُفْتُ بَلْ شَرُفُوْا بِيْ
وَبِنَفْسِيْ فَخَرْتُ، لَا بِجُدُوْدِي [1]

''میں اپنی قوم کی وجہ سے باعزت نہیں ٹھہرا، بلکہ میری قوم میری وجہ سے باعزت بنی۔ میں اپنے حسب و نسب پر فخر کرنے کے بجائے اپنے اوپر (اپنے کارناموں پر ہی) فخر محسوس کرتا ہوں۔''

سو جب خاندانِ نبوت کسی پر ذاتی فوقیت جتانے کا مجاز نہیں تو کسی اور کو غلط طور پر اپنی برتری ظاہر کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ بہر حال جو کچھ بھی ہوگا، قیامت کے دن یہ نشر پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور ہر قسم کا موجودہ نظام ختم ہوگا۔ فرمایا:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [إبراهيم: ٤٨]

''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی، اور لوگ اللہ، واحد، قہر والے کے سامنے (پیش) ہوں گے۔''

دوسری پیدایش:

صفِ دنیا لپٹ جانے کے بعد کائنات ہمیشہ کے لیے معدوم ہو کر نہیں رہ جائے گی۔ ایک نیا عالم وجود میں آئے گا۔ خداوند تعالیٰ کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں، وہ اس پر قادر ہے۔ وہ اگر ایک دفعہ پیدا کر سکتا ہے تو دوبارہ اس کے لیے کیا محال ہے؟ کسی شے کی از سرِ نو تخلیق واقعی آسان نہیں، لیکن اس نے وجود کو بعد از عدم پیدا کر کے دکھلا دیا ہے۔ پھر اس کے لیے اعادۂ تجدید کیا مشکل ہے؟

[1] ديوان المتنبي (ص: ٢١)

فرمایا: ﴿ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ﴾ [الأنبیاء: ١٠٤] ''جس طرح ہم نے پہلی تخلیق کی ابتداء کی تھی، اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴾ [طٰهٰ: ٥٥]

''ہم نے تمھیں اسی (زمین) سے پیدا کیا اور اسی میں تمھیں لوٹائیں گے اور اسی میں سے تمھیں ایک بار پھر نکالیں گے۔''

اہلِ کفر کو خدا کی اس قدرت پر شبہہ تھا۔ وہ اس بات کو خلافِ عقل جانتے تھے کہ یہ عالم فنا ہو کر دوبارہ وجود میں آئے گا:

﴿ ءَاِذَا كُنَّا عِظٰمًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٩]

''کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ از سرِ نو پیدا کر کے اُٹھائے جانے والے ہیں؟''

خداوند تعالیٰ نے ان کا شبہہ یوں دور فرمایا:

﴿ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴾ [قٓ: ٤]

''یقیناً ہمیں علم ہے جو کچھ زمین ان میں سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب (ہر چیز کی) حفاظت کرنے والی ہے۔''

بے شک ایک چیز فنا کے گھاٹ اتر کر ہماری نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ موجود بھی ہو تو اسے بوسیدگی سے تروتازگی کی طرف لوٹانا ہمارے بس سے باہر ہو جاتا ہے، مگر علام الغیوب، جو کائنات کے ذرے ذرے سے واقف ہے، اس بات پر قادر ہے کہ اسے پہلے جیسی شکل میں لے آئے:

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴾ [القیامة: ٣]

''کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر پائیں گے؟ کیوں نہیں! بلکہ ہم تو اس کی پور پور ٹھیک کرنے پر قادر ہیں۔''

صالح کون ہیں؟

پھر فرمایا: زمین کے وارث صالح لوگ ہوں گے۔ ﴿ اَلْاَرْضَ ﴾ سے مراد اگر جنت لی جائے تو معنی ظاہر ہیں۔ ارضِ جنت میں صرف نیک لوگ ہی جگہ پا سکیں گے۔ اگر یہ دنیوی زمین مراد ہے تو پھر لفظِ ''صالح'' پر غور کرنا ہوگا! اس صورت میں ﴿ اَلصّٰلِحُوْنَ ﴾ سے مراد اہلِ صلاحیت لوگ ہیں۔

ہر کام کے لیے الگ الگ صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمام کاروباری اپنے اپنے پیشے کے مطابق مخصوص صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ایک آدمی اپنے کام میں مہارتِ تامہ رکھتا ہے، لیکن دوسرے کام میں بالکل نا اہل ثابت ہوتا ہے۔ تجارت وصنعت کے لیے الگ صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ زمین داری کچھ اور قسم کی صلاحیتیں چاہتی ہے۔ علماء کے لیے ان کی حیثیت کے موافق اور صلاحیتیں درکار ہیں۔ گھریلو معاملات بھی صلاحیت کے بغیر نہیں سلجھتے، جن گھروں کی فضا ہم مکدر دیکھتے ہیں، اس کی وجہ سراسر یہی ہوتی ہے۔

اسی طرح حکومت و اقتدار کے لیے بھی عظیم صلاحیتوں کا حامل ہونا پڑتا ہے۔ برے اور نا اہل افراد بھی اکثر برسرِ اقتدار آجاتے ہیں، لیکن ان کی حکومت ایک محدود رقبے اور محدود زمانے کے لیے ہوتی ہے، اسے قرار اور پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔

اچھے اور باخدا لوگ اگر حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائیں؛ بشرطیکہ وہ انسانی حقوق کا تحفظ کر سکیں، عدل و انصاف کے تقاضوں کو بروئے کار لے آئیں، ضروریاتِ زندگی کو ارزاں کر دیں اور پبلک کے لیے سہولتیں بہم پہنچائیں تو یہ چیزیں ان کے دورِ حکومت کے لیے گارنٹی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایسے حکام ہی صحیح معنوں میں ''صالح'' کہلانے کے حق دار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آخرت میں بھی بہترین متصور ہوں گے:

«اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ، خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوا» [1]

''لوگ گویا سونے اور چاندی کی کانیں ہیں۔ جو دنیا میں اچھے ہیں وہ آخرت میں بھی اچھے ہوں گے؛ بشرطیکہ وہ علمِ دین حاصل کریں۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٣٨)

وراثتِ ارضی کے لیے اہلیت ضروری ہے:

وراثتِ ارضی کے لیے اہلیت کو بڑا دخل ہے۔ اس باب میں کفر اور اسلام کی تمیز نہیں۔ یعنی مسلمان اگر صفاتِ حکمرانی سے عاری ہو جائیں تو ان کا خالی اسلام اس سلسلے میں کسی کام نہیں آتا۔ غیر مسلم ان (صفات) سے آراستہ ہو تو اسے نام وری حاصل ہو جاتی ہے۔ نوشیرواں غیر مسلم تھا، لیکن اپنے بیگانے سب اب تک اسے ''عادل'' کے پیارے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ بنو تیم سے تھے۔ آپ کا خاندان ہاشمیوں سے برابری کا دعویٰ نہیں کرتا تھا، تاہم انھیں خلافت سونپی گئی اور خواہش کے خلاف سونپی گئی۔ آپ نے کہا: ''مجھے خلافت کی ضرورت نہیں۔'' جواب دیا گیا: ''آپ کو ضرورت نہیں، لیکن ملت کو آپ کی ضرورت ہے۔'' کیوں؟ اس لیے کہ قدرت نے آپ کے وجود میں لاجواب صلاحیتیں سمو دی تھیں۔ نیک اور بھی تھے، صلحاء کی کمی نہ تھی، لیکن جہانبانی کے لیے بہت سی خاص صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بہت بڑا دل بھی ہونا چاہیے۔

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ دے رہے تھے، ایک بدوی بولا: ''أَلَا تَخَافُ اللّٰهَ؟'' ''کیا تجھے خدا کا خوف نہیں؟'' ایک آدمی فوراً کہنے لگا: ''ارے امیر المومنین سے مخاطب ہونے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟

قربان جائیں اس پُرجلال رجلِ عظیم کی بردباری اور انصاف پسندی کے، فرمایا: ''اسے رہنے دو، جب تک اس جیسے دیوانے موجود ہیں، عدل کا قیام بھی اسی وقت تک ہے۔''

فتحِ شام کے بعد یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما وہاں کے پہلے گورنر مقرر ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جانشین ہوئے، پھر وہی مسندِ آرائے خلافت ہو گئے اور اس طرح حکومت بنو امیہ کے قبضے میں چلی گئی، چنانچہ بعض مفسرین نے ﴿يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ کا اشارہ اسی طرف قرار دیا ہے۔

نیکی، پارسائی اور خاندانی وجاہت کے لحاظ سے بلاشبہہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے انھیں کوئی نسبت نہ تھی، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ سطوت و اقتدار کے لیے اس دنیا میں معیار ہی کچھ اور ہے۔ نیک آدمی خدا تعالیٰ سے اپنی نیکی کا اجر ضرور پائے گا، لیکن دنیا میں ترجیحی سلوک یا حکومت اس کا معاوضہ نہیں بن سکتی، حکومت کے لیے اور ہی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ

حد درجے کے متقی اور پرہیز گار تھے، لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ابو ذر! اگر تمھیں دو آدمیوں کی امارت بھی سپرد کی جائے تو کبھی قبول نہ کرنا۔''[1]

اسلامی ممالک میں بے چینی کے اسباب:

آج اسلامی ممالک میں رعایا حکام سے مطمئن نہیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں ایک بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ آئے دن انقلابات آتے رہتے ہیں، جس کا سبب یہی ہے کہ حکومتوں کی باگ ڈور نااہل ہاتھوں میں ہے۔ وہ اپنی اغراض کے پیچھے پڑے ہوتے ہیں، انھیں عدل و انصاف اور اہلِ ملک کی فلاح و بہبود کا احساس نہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے خطبۂ افتتاحیہ میں جو الفاظ فرمائے تھے، وہی حکمرانی کے اصول ہونے چاہئیں۔ ایک فقرہ یہ ہے:

''وَالضَّعِيفُ فِيكُمْ قَوِيٌّ عِنْدِي حَتّٰى أُرِيحَ عَلَيْهِ حَقَّهُ، إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، وَالْقَوِيُّ فِيكُمْ ضَعِيفٌ عِنْدِي حَتّٰى آخُذَ الْحَقَّ مِنْهُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ''[2]

''تم میں جو ضعیف اور کمزور ہے، وہ میرے نزدیک قوی ہے، جب تک کہ میں اس کا حق نہ دلا دوں (ان شاء اللہ) اور تم میں جو طاقت ور ہے، وہ (میرے نزدیک) کمزور ہے، جب تک میں اس سے حق نہ لے لوں (ان شاء اللہ)۔''

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو عوام کا اتنا خیال تھا کہ زمانۂ قحط میں انھیں بھوکا دیکھ کر کانپ جاتے تھے۔ آپ اپنی حدودِ سلطنت میں بسنے والے جانوروں کے حقوق بھی اپنے اوپر واجب سمجھتے تھے۔ یہ ذمے داری کا احساس تھا، اور جس حکومت میں یہ احساس نہیں پایا جاتا، اس کی قسمت میں پائیداری کیوں کر ہو؟

انقلاب کیا ہے؟

اس کا یہ مطلب نہیں کہ فقط حکام کو مطعون اور قصور وار قرار دے کر اپنے متعلق اطمینان حاصل کر لیا جائے، اور بغاوت یا سیاسی چالبازیوں کے ذریعے سے ملک میں انقلاب بپا کرایا جائے۔ دوبارہ جو برسرِ اقتدار آتے ہیں، وہ اپنے پیشروؤں سے بہتر نہیں ہوتے۔ اس سے ملک کو سوائے بدامنی اور خلفشار کے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ اصل انقلاب ''تبدیلیِ حالتِ افراد'' ہے۔ ہمیں چاہیے کہ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢٦)

[2] البداية والنهاية، ط هجر (٣٠١/٦)

اپنے آپ میں انقلاب لانے کی کوشش کریں۔ ہماری اخلاقی حالت نہایت ابتر ہو چکی ہے۔ ہم نے کبھی کسی کا بھلا نہیں سوچا۔ کسی کے لیے خیر خواہی کی امید بھی ہم سے نہیں کی جا سکتی۔

جو لوگ بڑی آسانی سے اپنی حکومتوں کا شکوہ کر لیتے ہیں، مادی نقطۂ نظر سے بے شک اس کی معقول وجوہ ہوں گی، لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ پیش آمدہ مصیبت کے پیچھے کچھ روحانی اسباب بھی ہوا کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے ہم نے اپنا کردار کہاں تک سنوارا ہے؟

ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں! کیا ہم اس لائق ہیں کہ ہمیں ''صالح'' کہا جا سکے؟ ان حالات میں صالح حکومت کی خواہش کیا ہمارے حسبِ حال ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ((كَمَا تَكُونُوا يُوَلَّى عَلَيْكُمْ))[1]

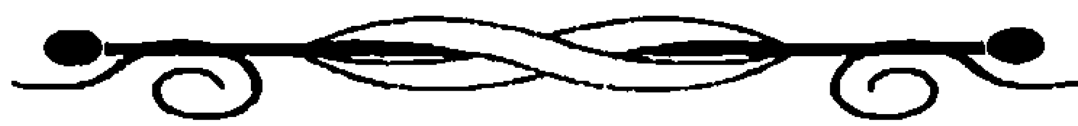
''جیسے تم خود ہو گے، ایسے ہی حکمران تمھارے اوپر مسلط کیے جائیں گے۔''

لمحۂ فکریہ:

علماء سوچیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ کاروباری حضرات بھی غور کریں، انھوں نے آزادی کے بعد کیا لوٹ کھسوٹ مچائی ہے؟ سیاسی پارٹیاں بھی، جو ہر وقت انقلاب کے لیے چشم براہ رہتی ہیں، اپنے ماضی کے آئینے میں جھانک کر دیکھیں کہ وہ اپنی تحریکوں میں کہاں تک صادق اور مخلص ہیں؟ جس کسی کو موقع ملا اس نے وقت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی!

یقین جانیے! صحیح معنوں میں انقلاب اسی وقت آئے گا، جب ہم خود کو بدل دیں گے۔ اس بگڑتے ہوئے دور میں ایک ''صالح'' کے لیے گنجایش ہی نہیں کہ وہ آگے بڑھ کر قوم کی کمان سنبھال سکے۔ اگر ہمارا دل نیکی کی جانب راغب ہو، حیا ہمارا جزوِ ایمان بنے اور ہر مقام پر، بالخصوص اپنے نمایندے منتخب کرتے وقت، دیانت و انصاف کا دامن ہاتھ سے نا جانے دیں تو پھر اچھی حکومت کی توقع بے جا نہیں ہے۔ تب ہی خدا کا یہ وعدہ پورا ہوتا ہے: ﴿ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴾.

خدا ہمیں نیکی کی توفیق دے۔ آمین[2]



[1] اس کی سند ضعیف ہے، دیکھیں: سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة (۳۲۰)

[2] خطبہ بتاریخ 5 اپریل 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (12 اپریل 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عبادت کی حقیقت اور رحمۃ للعالمین کا مفہوم

﴿ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ﴿١٠٦﴾ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴾
[الأنبياء: ١٠٦، ١٠٧]

''بلاشبہ اس میں (ہمارے) عبادت گزار بندوں کے لیے ایک اطلاع ہے۔ اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔''

انبیاء نے اپنی قوموں کو جو پیغامِ حق دیا، پھر ان قوموں کی طرف سے اس کا جو ردِ عمل ہوا، انھوں نے راہِ حق میں جو رکاوٹیں کھڑی کیں، جو اعتراضات اور شبہے پیش کیے، ان سب کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان کے شکوک و شبہات دور کیے، ان کے متعلق فرمایا:

﴿ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ﴿١٠٦﴾ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴾
[الأنبياء: ١٠٦، ١٠٧]

بلاغ کا معنی:

''بلاغ'' دو معنوں میں مستعمل ہے:

1. بغیہ، یہ مقصود کے معنی میں ہے، مقصد سے خالی تو کوئی کام نہیں ہوتا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان تہہ دل سے اسے چاہتا بھی ہو۔ بغیہ میں یہ پابندی ہے کہ انسان دل و جان سے حصولِ مقصد کا متمنی ہو۔
2. بلاغ کا دوسرا معنی کفایہ کا ہے۔ یعنی ایک دعوت کو قبول کرنے کی جو شرائط ہو سکتی ہیں یا ہدایت پانے کے لیے جن آیاتِ بینات کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ اس (قرآن) میں کافی و شافی موجود ہیں۔

معنی جو بھی لیجیے، بات ایک ہی بنتی ہے۔ جو شخص مقصد کو پا لے، وہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے اور کفایت تبھی ہوتی ہے، جب مطلوب تک رسائی ہو جائے۔

عبادت کیا ہے؟

﴿ لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ﴾ عبادت کیا ہے؟ خدا کو راضی کرنے کے سلسلے میں جو کام کیا جائے،

عبادت کہلاتا ہے۔ اس کے مختلف طریقے ہیں؛ نماز ان میں نسبتاً زیادہ اہم ہے، کیونکہ اس میں تلاوتِ قرآن بھی ہے، ادعیہ بھی ہیں، وظائف بھی ہیں، حضور ﷺ پر درود اور ان کے فضائل بھی ہیں اور ان کے علاوہ یہ متعدد فوائد اور خوبیوں کی جامع ہے۔لیکن عبادت میں بنیادی چیز انقیاد و تذلل ہے۔ آدمی اعترافِ عجز کرتے ہوئے مولا کے حضور ایسا جھکے کہ ''أنا'' (میں) کا وجود فنا ہو جائے، اس کے نہاں خانۂ قلب سے یہ بات نکلے:

''یا اللہ! میں کچھ بھی نہیں، تیری ذات والاتبار کے بالمقابل میری حقیقت ذرۂ بے مقدار سے بھی فروتر ہے۔''

یہی عبادت کی روح ہے۔ جس عبادت میں یہ روح جاری و ساری نہیں، وہ بے جان ہے۔ عبادت کے لیے مومن کا دل چاہیے۔ ایک دل میں ایمان اور کبر جمع نہیں ہو سکتے۔

ہدایت کے حق دار:

قرآن سے فائدہ صرف خدا کے عاجز بندے اٹھاتے ہیں۔ اصحابِ کبر کو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، جیسے فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ [البقرة: ٢] یہ کتاب پرہیزگاروں کے لیے ذریعۂ ہدایت ہے۔یعنی جو دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی زندگی سنوار لیتے ہیں۔قرآن مجید ویسے تو سب کے لیے راہنمائی کا سرچشمہ ہے، متقین کے ساتھ مخصوص اس لیے کیا ہے کہ عملاً فائدہ انہی کو پہنچتا ہے اور وہی اس لائق ہوتے ہیں کہ اس سے متمتع ہو سکیں۔ جس طرح ایک عام مریض کے لیے تو دوا مفید ہے، لیکن قریب المرگ یا مردہ شخص کے لیے اس میں کوئی شفا نہیں ہے۔ دوا میں نقص نہیں ہوتا، لیکن استعمال کرنے والے کی نبض بھی دیکھنا پڑتی ہے۔ اسی طرح قرآن کے مفید ہونے میں شک نہیں، مگر کبرِ نفس کی وجہ سے صداقت کی تلاش مفقود اور حق کی آرزو جب مر چکی ہو تو موت کا علاج کس کے پاس ہے؟

عاجزی کا انعام:

جو لوگ دربارِ الٰہی میں ذلیل ہو کر گرتے ہیں، ان کا مقام بڑا اونچا ہوتا ہے۔ یہ کتنا عجیب تضاد ہے، جو خدا کے سامنے جس قدر ذلیل اور ہیچ ہو، اس کی شان اتنی ہی بلند اور باوقار ہو جاتی ہے! اپنے مالک کے قدموں میں جھکنا طعنے کی بات نہیں، ہماری حیثیت اس کے سامنے کیا ہے؟

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ ﴾ [الفاطر: ۱۵]

''اے لوگو! تم (سب) اللہ ہی کے محتاج ہو اور اللہ ہی بالکل بے نیاز، قابلِ تعریف ہے۔''

ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمانِ غنی، علی مرتضٰی اور دیگر کبار اصحاب رضی اللہ عنہم نے بلند مقامات یہیں سے پائے۔ کُل انبیاء بھی خدا کے عاجز بندے تھے اور اسی وصف کی بدولت خدا نے انھیں کتنا مرتبہ عطا کیا:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۳]

''یہ سب رسول ہیں، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور ان میں سے بعض کے درجے بلند کیے۔''

عبادت میں عجز کے ساتھ محبت کا التزام:

عبادت کے لیے عجز کے علاوہ دوسری لازمی چیز محبت ہے۔ عجز اور محبت کا اجتماع بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص جس کے سامنے ذلیل ہو، اس سے محبت بھی کرے؟ لیکن فی الواقع ایسا ہی ہے۔ اولاد ماں باپ کے ساتھ، شاگرد اساتذہ کے ساتھ، معتقدین مرشدوں کے ساتھ اور عوام اپنے راہنماؤں کے ساتھ کبھی برابری کا دعویٰ نہیں کرتے۔ کسی مجبوری اور ڈر کے بغیر ان کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان سے ان کی محبت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ ان کے خلاف کوئی بات بھی سن نہیں سکتے۔

ذلت و محبت جب انتہا کو پہنچ جائیں تو وہ عبادت ہوتی ہے۔ جب ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے:

''خدایا! ہم تیرے حقیر بندے ہیں اور ہم تجھے بے انتہا چاہتے ہیں۔''

اگر یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تو عبادت بے روح ہے۔ ہمیں اپنی عبادتوں پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے کہ ہم ان میں کہاں تک ذلت و محبت کو شامل کر سکتے ہیں؟ کہیں یہ فقط محنت تو نہیں؟ یا اس میں قبولیت کا بھی کچھ امکان ہے؟ یہ نماز جو ہم پڑھتے ہیں، دو منٹ میں چار رکعتیں، میں نہیں سمجھتا کہ اس جلد بازی میں ذلت و محبت کی کتنی مقدار پائی جاتی ہوگی؟ یہ عبادت نہیں عبادت کا مذاق اڑانا ہے!

رحمۃ للعالمین کا مفہوم:

اس کے بعد فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ ہی نے ہمیں عبادت کا مفہوم بتایا، خالق مخلوق کی پہچان کرائی اور آقا و بندے کی نسبت واضح کی۔ آپ ﷺ کائنات کے لیے مجسمۂ رحمت ہیں۔ خاص طور پر دو لحاظ سے تو آپ ﷺ کا وجود نہایت ہی رحمت و کرم کا باعث ہوتا ہے:

1 اس لیے کہ آپ ﷺ ایسی کتاب دے کر مبعوث کیے گئے جو پوری دنیا کے لیے باعثِ ہدایت ہے، اس میں لاریب ہر ایک کے لیے فلاح کا سامان موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے استفادہ صرف متقی لوگ ہی کرتے ہیں۔ اگر مردہ ذہن اس سے متاثر نہیں ہوتے تو اس سے قرآن کی جامعیت اور حقانیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بصیرت سے محروم آنکھیں اگر آفتابِ عالم تاب کو نہ پاسکیں تو اس میں آفتاب کا کیا قصور؟ اشیاء اپنا اثر رکھتی ہیں، لیکن اس اثر کو قبول کرنے کے لیے قوتِ انفعالیہ کا درست ہونا بھی ضروری ہے۔ صفراوی بیماری سے اگر منہ کا مزا تلخ ہو جائے تو شہد کی مٹھاس سے انکار نہیں ہوسکتا۔

قرآن قرآن ہی ہے، ذہن ہی اگر ابوجہل، ابولہب، عبداللہ بن ابی سا ہو تو وہ (قرآن) کیا کرے؟ بارش خدا کی رحمت ہے، لیکن ہموار اور ستھری زمین کے لیے۔ گڑھوں میں کچھ نہیں اگتا، لیکن ان میں پڑے ہوئے پانی کا ذخیرہ کسی کام آجاتا ہے؛ خدا کی مخلوق اسے پی ہی لیتی ہے۔ لیکن شور والی زمین بے کار محض ہے، اس میں بارش کے قطرات سے اثر پذیر ہونے کی مطلق اہلیت نہیں۔ باعمل علماء، جو خود بھی نیکی کرتے ہیں اور نیکی پھیلاتے بھی ہیں، وہ صحیح معنوں میں قرآن سے مستفید ہوتے ہیں اور انہی کے لیے پیغمبر کا وجود اصل رحمت ہوتا ہے۔

یوں تو میرے جیسے واعظِ بے عمل سے بھی کچھ فائدہ پہنچ ہی جاتا ہوگا۔ عین ممکن ہے، کوئی کلمۂ خیر کسی کے کان میں پڑ جائے، لیکن جو ذہن اپاہج اور معطل ہو جاتے ہیں، ان میں کسی بات کا اثر و نفوذ نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں: واعظ کے وعظ میں وہ بات نہیں رہی! بے شک واعظ کے وعظ میں وہ بات نہ سہی، مگر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ ہمارے دل و دماغ ہی تو بنجر نہیں ہو چکے؟ نبی کریم ﷺ کے وعظ میں کیا

کم تاثیر تھی؟ لیکن مخاطب ہی ابوجہل جیسے لوگ ہوں تو وہاں کلامِ الٰہی اپنا اعجاز کیونکر دکھائے؟!

2 حضور پاک ﷺ اس لحاظ سے بھی رحمت ہیں کہ آپ ﷺ کی آمد کے بعد خدا نے اپنی مخلوق کو عذاب دینے کے معاملے میں بڑی تخفیف کر دی ہے۔ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں کفار نے بطورِ چیلنج خود عذاب طلب کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ ﴾ [الأنفال: ٣٣]

''اور (اے نبی!) اللہ ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ آپ ابھی ان کے درمیان (موجود) ہوں، اور اللہ انھیں عذاب دینے والا نہیں، جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں۔''

استغفار کو بھی دراصل حضور ﷺ ہی کا امت پر ایک احسان سمجھنا چاہیے، وہی ہمیں اس کا سبق دینے والے ہیں۔ پھر پہلے جو عذاب آتے تھے، وہ تو پوری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے تھے، ان کا نام و نشان تک نہ رہنے دیا جاتا۔ اب بھی عذاب آ جاتے ہیں، لیکن عذابِ مستاصل یا عذابِ مقیم کی صورت نہیں، یہ سب رحمۃ للعالمینی کا اثر ہے۔

حضور ﷺ کتنے مشفق و مہربان تھے؟ اس کا ہلکا سا اندازہ آپ ﷺ کی ایک دعا سے ہوتا ہے۔ فرمایا: ''یا اللہ میں نے جن کے حق میں لعنت کی ہے، اسے رحمت میں بدل دے: ((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، أَغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُ الْبَشَرُ))[1]

''کیونکہ بہ تقاضائے بشریت مجھے غصہ آ جایا کرتا ہے۔''

اس سے واضح ہے کہ اس سے مراد ذاتی غصے کی بنا پر کی گئی لعنت ہے، مذہب کی رو سے نہیں۔ جیسے آپ ﷺ نے حلالہ کرنے اور کرانے والے پر لعنت کرتے ہوئے فرمایا: ((لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ))[2]

کیوں کہ اس میں زنا کو نکاح کا نام دے کا جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔ یا جس طرح اہلِ کتاب پر لعنت فرمائی:

---

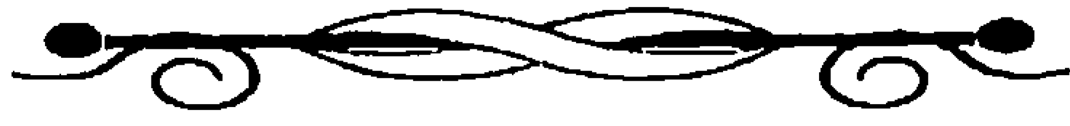
[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٠١) مسند أحمد، رقم الحديث (٧٣١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٩٠)

((لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى، اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ)) [1]

''یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت! انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔''

یہ لعنتیں واپس ہونے کی نہیں، یہ گناہ کی باتیں ہیں۔ وہ اور ہی لوگ ہوتے ہیں جنھیں گناہ کے ذریعے خوش کیا جاتا ہے۔ خدا اور اس کے پیغمبر کو راضی کرنا ہو تو نیک اعمال یا گناہوں سے استغفار کی ضرورت ہے، اسی سے ہمارے اندر رحمت کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ خدا ہمیں نیکی کی توفیق دے۔ آمین [2]



[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٧٦)

[2] خطبہ بتاریخ 19 اپریل 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (26 اپریل 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شرک بغاوت ہے

﴿ قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿108﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ وَ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿109﴾ اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَ یَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿110﴾ وَ اِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ﴿111﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ﴿112﴾ ﴾ [الأنبیاء: ۱۰۸۔۱۱۲]

”کہہ دیجیے: میری طرف تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ بس تمھارا معبود ایک ہی ہے، پھر کیا تم مسلمان ہو؟ پھر اگر وہ پھریں تو کہہ دیجیے: میں نے تمھیں یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے اور میں نہیں جانتا کہ جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے، وہ قریب ہے یا بعید ہے۔ بے شک وہ (اللہ) پکار کر کہی ہوئی بات کو بھی جانتا ہے اور جو تم چھپاتے ہو، اس کو بھی جانتا ہے۔ اور میں نہیں جانتا شاید یہ (تاخیرِ عذاب) تمھارے لیے آزمایش اور ایک وقت تک فائدہ ہے۔ (رسول نے) کہا: اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ فرما، اور ہمارا رب نہایت مہربان ہے، جو باتیں تم بیان کرتے ہو ان پر وہی مدد مانگے جانے کے لائق ہے۔“

عقیدے اور عمل میں ناموافقت:

یہ سورت انبیاء کی آخری آیتیں ہیں، ان میں ایک دفعہ پھر اس پیغامِ توحید کو دہرایا گیا ہے جو سورت کا اصل مضمون ہے۔ پیشتر ازیں رسولِ کریم ﷺ کو ”رحمۃ للعالمین“ کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ اب ان کی زبانِ مبارک سے ایک الٰہ کا نعرہ لگوانا دلالت کرتا ہے کہ حضور ﷺ کی رحمت عام ہونے کے باوصف محدود بھی ہو سکتی ہے، یعنی آپ ﷺ واقع میں انھی کے لیے رحمت ثابت ہوتے ہیں جو خداوند کو شرک کی آلایشوں سے منزہ تسلیم کر لیتے ہیں۔

ایک آدمی حضور ﷺ کے بارے میں کیسے ہی اچھے خیالات رکھے، آپ ﷺ کو افضل الرسل، شافعِ محشر اور رحمتِ عالم مانے، لیکن اپنا عمل پیغمبر ﷺ کی منشا کے مطابق نہیں کر سکا، اللہ سے منہ موڑ کر خانقاہوں، درختوں اور پتھروں میں سکون کا متلاشی ہے تو آپ ﷺ کی رحمت اس کے کسی کام نہیں آئے گی۔ اس کی مثال ایسے ہے جس طرح پانی طاہر بھی ہے اور مطہر بھی، لیکن جو شخص وضو کے ساتھ ساتھ پیشاب بھی کرتا جائے، اس کے حق میں پانی پاکیزہ بنانے کا عمل انجام نہیں دیتا۔ مشرکینِ مکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، لیکن کعبۃ اللہ میں 360 بت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اس وابستگی کو بے معنی بنا دیتے تھے۔

شرک بغاوت ہے:

شرک معمولی جرم نہیں۔ گناہ بڑے بڑے بھی ہوتے ہیں، لیکن شرک ''اکبر الکبائر'' ہے۔ عام کبیرہ گناہ سیلِ رحمت سے بہہ سکتے ہیں۔ شرک جرم نہیں، بغاوت ہے اور بغاوت معاف نہیں ہوتی۔ ایک مشرک کو حضور ﷺ کی رحمت سے کوئی واسطہ نہیں، آپ ﷺ اس کے کچھ نہیں ہوتے۔ وہ شخص کبھی ہمیں اپنی شفقت کا اہل نہیں سمجھتا، جسے چچا کہتے ہماری زبان تھکتی ہو اور ساتھ ہی اس کے متعلق گستاخانہ چٹکیاں بھری جائیں۔ نبی کریم ﷺ کو پیغمبر ماننا اور آپ ﷺ کے اصلی پیغام کو ٹھکرا کر آپ ﷺ کی رحمت کا امیدوار ہونا، کیا خوب حماقت ہے! ع

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد

ستم یہ ہے کہ وہ پیغامِ توحید جو تمام انبیاء کی تبلیغ کا اصل الاصول رہا ہے اور جس کے بغیر اسلام کا تصور ہی کالعدم ہو جاتا ہے، اسے اختلافی مسئلہ سمجھ لیا گیا ہے اور اسے بیان کرنا ان کے ہاں جرم، گویا انھیں خدا کی توحید بھی مشکوک نظر آتی ہے۔ قرآن نے تو کفار سے کہا تھا: ﴿ اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [إبراهيم: ١٠] ''کیا (تمھیں) اس اللہ کی بابت شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟'' اور یہاں مدعیانِ توحید کو توحید میں شک ہو گیا ہے ...!

شرک سے بے زاری:

فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُکُمْ عَلٰی سَوَآءٍ ﴾ اس آیت میں منکرینِ توحید کو

کھری کھری سنا دی ہے۔ لحاظ اور چشم پوشی کو روا نہیں رکھا گیا۔ یہ ان سے کھلا اور بے لاگ اعلانِ بے زاری ہے، جیسے ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں نے اپنی قوم سے کہا:

﴿اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ﴾ [الممتحنة: ٤]

”بے شک ہم تم سے اور ان سے بَری ہیں، جن کی تم عبادت کرتے ہو سوائے اللہ کے، ہم تم سے منکر ہوئے، ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہو گیا ہے، حتی کہ تم اللہ اکیلے پر ایمان لے آؤ۔“

﴿اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾ سے بھی مفہوم ملتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے قطع تعلقی پر تُل گئے ہیں۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ میں تمھارے مقابل ایک فریق اور دشمن ہوں۔ میری تم سے صلح نہیں، لڑائی ہے۔ جس طرح سورت بقرہ میں فرمایا: سود لینے سے باز نہیں آؤ گے تو ﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ [البقرة: ٢٧٩] ”خبردار ہو جاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے۔“

مصالحت کی ایک ہی صورت ممکن ہے، جو پہلے پارے میں بیان فرمائی گئی:

﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ﴾ [البقرة: ١٣٧]

”پھر اگر وہ (اہلِ کتاب) اس چیز پر ایمان لے آئیں، جس پر تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ ہدایت پا جائیں گے اور اگر وہ منہ موڑیں تو پھر وہی ہیں مخالفت میں۔“

شرک کے ساتھ متعلق رہ کر حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ: ”شیخ بھی خوش رہے، راضی رہے شیطان بھی۔“ والی بات ہے۔

دو راہیں:

﴿عَلٰى سَوَآءٍ﴾ سے ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ بے عمل صوفیوں نے اپنے بچاؤ کے لیے اسلام کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے، ایک کا نام ”شریعت“ اور دوسرے کا نام ”طریقت“۔ وہ کہتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی قسم کا کلام نازل ہوا؛ کچھ ان کے لیے مخصوص تھا، کچھ علماء کے لیے اور

کچھ صوفیہ کے لیے۔ یہ سب چھٹی صدی ہجری کی اختراع ہے، صرف اس لیے تاکہ کوئی ان کی بدعملی اور بدکرداری پر انگلی نہ رکھ سکے۔

﴿عَلٰی سَوَآءٍ﴾ سے اس بات کی نفی ہو جاتی ہے کہ اسلام میں ظاہریت اور باطنیت نام کی کوئی الگ الگ دو چیزیں ہوں۔ مولویوں کے لیے ظاہری احکام اور فقیروں کے لیے باطنی احکام؟ یہ امتیاز بے عمل رہنے کا ایک بہانہ ہے، اس سے انارکی پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ اولیاء الرحمان نہیں، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان کو اولیاء الشیطان سے تعبیر کیا ہے۔

ہر شخص عبادت کا مکلّف ہے:

کہا جاتا ہے کہ یہ ظاہری عبادتیں ظاہر پرستوں کے لیے ہیں۔ مخصوص لوگوں کے لیے باطنی احکام ہوتے ہیں، انھیں ظواہر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ان سے مستغنی ہوتے ہیں، ان کا دل ہی عبادت میں مستغرق ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے، امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بھی زیادہ کوئی خاص ہو گا؟ وہ تو نمازوں سے بے نیاز نہ رہ سکے۔ خود صاحبِ معراج صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ [الحجر: ٩٩] ''اور آپ اپنے رب کی عبادت کریں حتی کہ آپ کے پاس یقین (موت) آجائے۔''

عبادت میں کمی بیشی تو متصور ہو سکتی ہے، لیکن یہ کہ ان لاڈلوں کو تکلیفِ عبادت سے مستثنیٰ سمجھا جائے، غلط ہے۔ صحابہ و تابعین، سلف صالحین، ائمہ کرام اور فقرائے عظام؛ سب خدا کے عبادت گزار بندے تھے۔ جس دین میں نماز نہیں، وہ بھی کوئی دین ہے؟ جو دین بے عملی پر آمادہ کرتا ہے اور اللہ کے حضور سر بہ سجود ہونے کو کسرِ شان سمجھتا ہے، اللہ کا دین نہیں، ابلیس لعین کا دین ہے۔

شیعہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''امام وصی'' ثابت کرنے کے لیے کچھ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے ان کے کان میں کوئی وصیت کی تھی، جو باقی امت کے لیے نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی تردید ثابت ہے۔ وہ فرماتی ہیں: میری گود میں سر مبارک رکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جان دی تھی۔ ''مَتٰى أَوْصٰى إِلَيْهِ''[1] ''انھیں کب وصیت کی؟''

داماد کی حیثیت سے ممکن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وقت ان سے کچھ کہا ہو۔ رشتے داروں سے

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۷٤۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٦۳٦)

باتیں کی ہی جاتی ہیں، لیکن ایسی بات جس کا تعلق اسلام کی تکمیل اور اس کے مقاصد سے ہو، کسی کے ساتھ مختص نہیں کی جا سکتی۔

مسئلۂ علمِ غیب:

پھر فرمایا: ﴿ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴾ یعنی انکارِ توحید کی سزا تو بہر حال ہو گی، لیکن یہ میں نہیں جانتا تمھارا انجام نزدیک ہے یا دور؟ اور یہ مہلت تمھارے حق میں بہتر ہے یا نقصان دہ؟ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ظاہر و باطن کو خوب جانتا ہے۔

اپنی ذات سے دو اہم علوم کی نفی سے ''مسئلۂ علمِ غیب'' کا پول کھل جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی طرف ''مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ'' کا علم منسوب کرنے والے نا جانے ان آیتوں کی کیا تاویل کرتے ہیں؟!

یہ مکی آیات ہیں اور ہجرت کے بعد جلد ہی ان کا یومِ حساب شروع ہو جاتا ہے۔ غزوۂ بدر میں مسلمانوں نے ستر کفار کو مارا اور ستر ہی قید کر لیے، لیکن نبی کریم ﷺ مستقبل قریب کے متعلق کچھ بھی بتانے سے اظہارِ عجز فرما رہے ہیں۔ جو کچھ بذریعہ وحی معلوم ہو جائے، اس سے انکار نہیں، یہی تو نبوت ہے، لیکن اسے غیب نہیں کہا جاتا۔

غزوۂ بدر سے ایک روز پیشتر نبی کریم ﷺ نے خود پیش گوئی فرمائی کہ کل ان شاء اللہ فلاں دشمن اس جگہ گرے گا اور فلاں اس جگہ۔ اور جب جنگ شروع ہونے لگی تو آپ ﷺ نے نہایت الحاح وگریہ زاری سے دعا کی: یا اللہ! اگر یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر تجھے قیامت تک نہ پوجا جائے گا۔

علمِ غیب کی نفی:

عالمِ غیب کی حیثیت سے جنگ کا انجام اگر روزِ روشن کی طرح عیاں تھا تو یہ دعا چہ معنی دارد؟

پیش آمدہ مقدمات میں بھی آپ ﷺ نے ہمیشہ گواہی پر فیصلہ کیا، اپنے علمِ غیب کو کام میں نہیں لائے، اسی لیے خلافِ واقعہ فیصلے کا امکان رہتا تھا۔

حدیث ملاحظہ ہو:

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، وَإِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ إِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَّكُوْنَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ، فَأَقْضِيَ لَهٗ عَلٰى

نَحْوِ مَا أَسْمَعُ مِنْهُ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِشَيْءٍ مِّنْ حَقِّ أَخِيهِ فَلَا يَأْخُذَنَّهُ، فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ)) [1]

''ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: میں ایک بشر ہوں۔ تم میرے پاس جھگڑتے آتے ہو اور شاید تم میں سے ایک دوسرے کی بہ نسبت اپنی دلیل کو زیادہ بیان کرنے والا ہو اور میں اس کی گفتگو سن کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں، پس اگر میں اس کے بھائی کا حق اسے دے دوں تو وہ اسے ہرگز نہ لے، یہ گویا میں اسے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دیتا ہوں۔''

صحیح مسلم میں ایک روایت ہے:

''جب آسمان ابر آلود ہوتا تو نبی کریم ﷺ کا رنگ متغیر ہو جاتا، آپ ﷺ کبھی اندر اور کبھی باہر تشریف لاتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: یا حضرت! یہ کیا ماجرا ہے؟ فرمایا: عائشہ! ڈر آتا ہے، کہیں یہ اسی طرح کا بادل نہ ہو جسے قومِ عاد نے اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا تھا: یہ ابر ہمیں سیراب کرے گا۔'' [2]

کیا یہ غیب کی باتیں ہیں؟ انبیاء کے پاس علم بہت ہوتا ہے، لیکن خدا کی مانند نہیں۔ عالمِ غیب سمجھنا حد سے تجاوز ہے۔

آخر میں دعا کی: ﴿ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ﴾ ''اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ فرما۔'' پھر فرمایا: ﴿ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿١١٢﴾ ﴾ [الأنبياء: ١١٢] ''اور ہمارا رب نہایت مہربان ہے، جو باتیں تم بیان کرتے ہو ان پر وہی مدد مانگے جانے کے لائق ہے۔'' غزوۂ بدر میں بھی ستائے مسلمانوں کی دعاؤں اور وعدۂ الٰہی کا ایک مظہر تھا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. [3]



[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩٩)

[3] خطبہ بتاریخ 26 اپریل 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (17 مئی 1963ء) مرتب: محمد یوسف خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طریقِ بحث

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّ یَتَّبِعُ کُلَّ شَیۡطٰنٍ مَّرِیۡدٍ ۙ﴿۳﴾﴾

[الحج: ۳]

''اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں علم کے بغیر بحث کرتے ہیں اور وہ ہر سرکش شیطان کی اتباع کرتے ہیں۔''

قیامت اور اس کی دہشت کا ذکر فرما کر ذاتِ باری تعالیٰ کو بر بنائے جہالت موضوعِ بحث بنانے والوں کے بارے میں حرفِ شکایت ہے۔ جدال یا اختلاف ہو جانا ایک فطرتی بات ہے، انسانی طبیعت اسے پسند نہیں کرتی، اس لیے اختلاف کو رفع کرنا بھی قدرتی امر ہے۔ اختلاف دور ہو جانا حتمی نہیں، کبھی ہو جاتا ہے، کبھی نہیں۔ انبیاء علیہم السلام میں اختلاف نہیں پایا جاتا:

﴿شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ؕ﴾

[الشوریٰ: ۱۳]

''اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے، جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جو ہم نے (اے نبی!) آپ کی طرف وحی کیا ہے اور جس کا (تاکیدی) حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم اس دین کو قائم رکھو اور تم اس میں فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ۔''

امتیں اختلاف میں پڑ جاتی ہیں، یہ کمزوری ہے۔ یہ مقام انبیاء ہی کو حاصل ہے کہ ان کی دعوت میں ہمیشہ یکسانیت پائی گئی ہے۔ توحید و معاد اور دیگر بنیادی مسائل میں کبھی ان میں اختلافِ رائے نہیں ہوا، امت کے لیے اس مرتبے تک پہنچنا مشکل ہے۔

سنجیدگی سے:

اختلاف بڑھنا اچھا نہیں، اسے مٹانا چاہیے۔ بحث و جدال اگر افہام و تفہیم کے لیے اور علم و دین

کے ساتھ ہو تو مستحسن ہے۔ ضد، عناد اور عصبیت کی وجہ سے ہو تو قبیح۔ رفعِ اختلاف کے لیے خود انبیاء نے اپنی قوموں سے جدال کیا ہے اور نزاع کو نمٹانے کی کوشش کی ہے۔

اس باب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک بہترین مناظر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس عظیم موحد نے قوم کو کواکب پرستی سے روکنے کے لیے ستارے کو دیکھ کر کتنی سنجیدگی سے کہہ دیا: ﴿ هٰذَا رَبِّيْ ﴾ [الأنعام: ٧٦] گویا تھوڑی دیر کے لیے ان کی خاطر سے ستارے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ ''نقلِ کفر کفر نہ باشد'' کوئی طنز نہیں کی، انھیں چڑا کر خواہ مخواہ جھگڑا مول نہیں لیا۔ بعض مفسرین نے اسے استفہامیہ بھی لکھا ہے: ''اسے میرا رب کہتے ہو؟''

جب یہ ڈوب گیا تو آپ نے چوٹ کی: ﴿ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٧٦] یعنی مجھے ایسا خدا پسند نہیں ہے جو بنے اور بگڑے، چڑھے اور ڈوبے اور مرے اور جیے۔ پھر علی ہذا القیاس آپ علیہ السلام نے چاند اور سورج کی خدائی پر بھی حکیمانہ تبصرہ کر دیا۔

لاجواب مناظرہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب قوم سے جدا ہو کر حران پہنچے تو نمرود سے بھی ایک لاجواب مناظرہ کیا۔ اپنے رب کی تعریف فرمائی: ﴿ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ [البقرة: ٢٥٨] یعنی وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ مخاطب نیک نیت اور حق پرست ہوتا تو بحث ختم تھی، لیکن ہٹ دھرمی اور بے وقوفی نے اسے خاموش نہ رہنے دیا، کہنے لگا: ﴿ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ﴾ [البقرة: ٢٥٨] یعنی یہ تو میرے اختیار میں بھی ہے کہ کسی کو موت کی سزا دے دوں اور کسی مجرم کو بری کروں۔ اور جب آپ نے کہا:

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ﴾ [البقرة: ٢٥٨]

''بے شک اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال کر دِکھا۔''

یعنی اگر تمھیں الوہیت کا دعویٰ ہے تو اس نظامِ قدرت کو ذرا بدل کے دکھا دو! وہ مبہوت ہو گیا۔ کتنا معقول جدال تھا یہ؟

اختلاف کی دو قسمیں:

اختلاف دو طرح کا ہے: ایک اختلاف جو اساسی اور بنیادی ہوتا ہے جیسے توحید، رسالت، معاد

اور سنت کا انکار، یہ بے شک کفر ہے۔ دوسرا فرعی ہے جیسا کہ ائمۂ سنت میں پایا جاتا ہے۔ یہ کفر پر منتج نہیں ہوتا۔ اسلام کے بنیادی ارکان اور اصول کو مانتے ہوئے اگر کسی فروعی مسئلے کو کسی مسئلے پر ترجیح دے دی جائے تو اسے اختلافِ افضیلت سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ بنیادی اختلاف میں مجادلہ جائز ہے، بشرطیکہ اندھا دھند نہ ہو۔ فرمایا:

﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [النحل: ۱۲۵]

''(اے نبی!) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دیجیے۔''

سینہ زوری اور تعصب بازی تو کافروں سے بھی جائز نہیں کہ ہمارا مسئلہ مانو، ورنہ تمھاری خیر نہیں۔ گفتگو بہتر دلیل کے ساتھ ہونی چاہیے، یہی جدالِ احسن ہے۔

تقلید:

تقلید کے ساتھ بحث، جدال بغیر علم ہے: ''ہمارے ابو صاحب نے یوں فرمایا، ہمارے آباء واجداد یوں کیا کرتے تھے۔'' یہ کوئی حجت اور قابلِ تعریف طریقۂ بحث نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

﴿مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿52﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿53﴾﴾ [الأنبياء: ۵۲۔۵۳]

''یہ کیا مورتیاں ہیں جن کے لیے تم مجاور (بنے بیٹھے) ہو؟ وہ کہنے لگے: ہم نے اپنے باپ دادا کو انھی کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔''

کتنا بودا جواب تھا یہ؟ توحید جیسے بنیادی مسئلے میں میاں جی اور تایا جی کا حوالہ دے کر اس پیغمبر سے بحث کی جس سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ہوسکتا، اور تمام ائمہ اور فقہاء کو اپنے علوم کی اسی سے سند چاہیے۔ یہ جدالِ احسن نہیں ہے۔ توحید اور معاد جیسے نازک مسائل کا مختلف فیہ ہونا بڑی بات ہے۔ حمایتِ شرک اور انکارِ آخرت میں آج تک کوئی عقلی و نقلی دلیل پیش نہیں کی گئی، جیسے فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ﴾ [الحج: ۸]

''اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر روشن کتاب کے بحث کرتے ہیں۔''

عوام کا وظیفہ:

وہ بحث اس طرح کرتے ہیں شاید دوسروں کو بولنے کا حق ہی نہیں۔ چوری اور سینہ زوری، یہ بحث نہیں۔ آدمی مسئلے کی نوعیت سمجھ کر تحقیق کرے اور اہلِ علم سے تبادلۂ خیالات کرے۔ اگر اپنے پاس اہلیت یا فرصت نہیں تو بحث کرنا بددیانتی ہے۔ یہ علماء کا حق ہے۔ زیادہ تر کوئی مسئلہ اسی وقت اُلجھتا ہے جب ہر کس و ناکس دخل در معقولات کا مرتکب ہونے لگتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ نیک نیتی سے بحث کرتے ہیں، لیکن علم کے بغیر مسئلے کو حل کرنا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا اور غلط نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور وہ شخص تو کبھی اچھے الفاظ سے یاد کیے جانے کے قابل نہیں جس کے متعلق فرمایا: ﴿ وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴾ [الحج: ٣] یعنی ایک تو بغیر علم مجادلہ کرتا ہے اور دوسرا شیطان صفت لوگوں کو مرشد بنا رکھا ہے۔ امام میں خلوص نہ ہو تو مقتدی کب مخلص ہوگا؟

غلط راہنماؤں کو شیطان کا لقب اسی لیے عطا ہوا کہ وہی پہلا مناظر تھا جس نے غلط قیاس کر کے مجادلہ کی غلط بنا ڈالی اور مردود ہوا۔ اپنی خواہشات سے مسائل حل کرنے والے شیطان ہیں۔ ان کی پیروی انہی کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ مسئلہ اہلِ علم و تقویٰ سے پوچھنا چاہیے، وہی اس کا حق رکھتے ہیں: ﴿ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [النحل: ٤٣] ”لہٰذا تم اہلِ ذکر (اہلِ کتاب) سے پوچھ لو اگر تم علم نہیں رکھتے۔“

علم اور جہالت:

جو مسئلہ جہالت کی پیداوار ہو، وہ جہالت ہی کے ماحول میں نشوونما پا سکتا ہے، علم کے سامنے نہیں ٹکتا، اسے شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے بتوں پر ہاتھ صاف کیا تو پجاری پوچھنے لگے: ﴿ ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴾ [الأنبياء: ٦٢] ”اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ (یہ کام) کیا ہے؟“ فرمایا: ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٦٣] ”بلکہ یہ (کام) ان کے اس بڑے نے کیا ہے، لہٰذا تم ان سے پوچھ لو، اگر وہ بولتے ہیں۔“

یعنی جن خداؤں کو وہ پوجتے اور جن سے مدد چاہتے تھے، ایک ''وہابی'' انھیں توڑنے کے لیے آیا اور سارے مل کر بھی اس کا بال تک بیکا نہ کر سکے۔ لاجواب ہونے کے بعد انہی ہتھیاروں پر اتر آئے جو ہمیشہ سے مشرکین کا طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ کہنے لگے: ﴿حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ﴾ [الأنبياء: ٦٨] ''اگر تم (کچھ) کرنے والے ہو تو اس (ابراہیم) کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔''

بے علمی اور شیطان کی پیروی میں کیے ہوئے مناظرے کا آخر یہی تماشا ہوتا ہے۔

حق پرستی کی ایک مثال:

اگر بے علمی کے ساتھ حق پرستی کا رجحان غالب ہو تو کبھی کبھی اچھے نتیجے کی امید کرنی چاہیے۔ صحیح مسلم میں روایت آتی ہے کہ عرب کا مشہور افسوں گر ضماد ازدی مکہ میں آیا اور کفار سے سنا کہ محمد ﷺ پر جنات کا اثر ہے تو اپنی خدمات پیش کیں اور کہا میں تمھیں اپنا منتر سناتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم مجھ سے کچھ سنو! آپ ﷺ نے خطبہ مسنونہ ارشاد فرمایا، اس نے دوبارہ، سہ بارہ یہی کلمات سننے کی فرمایش کی۔ شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ بعض دفعہ ایک مخبوط الحواس آدمی بھی معقول گفتگو کر لیتا ہے، لیکن وہ اس بے نظیر کلام کو مکرّر سن کر بے اختیار ہو گیا اور اسلام لے آیا۔[1]

جدال کے آداب:

بحث و تمحیص کرتے وقت جدال کے ان آداب کو ہرگز نہیں بھولنا چاہیے، جن پر قرآن نے روشنی ڈالی ہے۔ علم، خلوص، نیک نیتی اور ذہن کی صفائی اس کی لازمی شرائط ہیں۔ اگر ہم ان شرائط کو نباہ نہیں سکتے تو بحث فتنے کا دروازہ ہے اور تخریب بلا تعمیر ہے۔ اس سے پھوٹ پڑتی ہے اور انتشار بڑھتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ لوگوں کو ان کی حالت پر رہنے دیا جائے۔

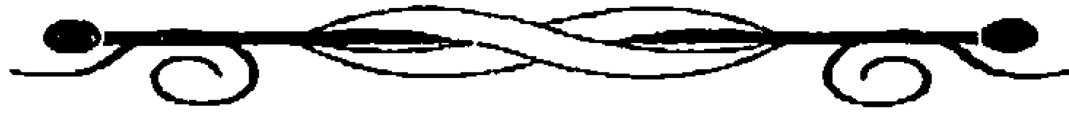
﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ [بني إسرائيل: ٨٤] یعنی ''ہر کوئی اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے۔'' ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝﴾ [الکافرون: ٦] کی یہی سٹیج ہوتی ہے، انھیں منہ نہ لگایا جائے۔ خانہ جنگی کے بجائے ان سے کھل کر اعلانِ جنگ اور دوٹوک فیصلہ ہو۔ اہلِ مکہ کے ساتھ تیرہ سال کے

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦٨)

طویل عرصے میں جو مسئلہ حل نہ ہو سکا، ہجرت کے بعد کھلے مقابلے میں آٹھ سال میں فیصلہ ہو گیا اور فضا صاف ہو گئی۔

ہم مسلمان:

شرک کی بیماری بہت سے مسلمانوں میں بھی پھیلی ہوئی ہے، وہ شرک کرتے ہیں، لیکن بے چاروں کو سمجھانے والا ہی کوئی نہیں، نا جانے ان کے دماغوں میں کیا بھر دیا جاتا ہے کہ وہ صحیح راہنمائی کے مواقع کھو دیتے ہیں، اور وہ بدنیت علمائے سوء، جن کا علم بے علمی سے بدتر کہنا چاہیے، جو مسائل کو اپنی مرضی کے مطابق حل کرنے کے عادی ہیں اور جنھوں نے عوام کو بھیڑ اور بکریاں سمجھ رکھا ہے، قطعاً حوصلہ افزائی کے قابل نہیں۔ یہ لوگ خدا اور رسول کا نام لے کر شیطانیت کا پرچار کرتے ہیں، ان سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ [1]



[1] خطبہ بتاریخ 17 مئی 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (31 مئی 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قیامت کی دلیل اور انسانی پیدائش کے مختلف مراحل

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ﴾ [الحج: ۵]

’’اے لوگو! اگر تم دوبارہ جی اُٹھنے کے متعلق شک میں ہوتو (تمھیں علم ہونا چاہیے کہ) بلاشبہہ ہم نے ہی تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے جو واضح شکل وصورت اور غیر واضح شکل وصورت والا ہوتا ہے، تا کہ ہم تمھارے لیے (اپنی قدرت وحکمت) واضح کریں، اور ہم جس (نطفے) کے متعلق چاہیں اسے مقررہ مدت تک رحموں میں ٹھہراتے ہیں، پھر تمھیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں، تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی فوت کر دیا جاتا ہے اور تم میں سے کوئی ناکارہ ترین عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، تا کہ وہ جاننے کے بعد کچھ بھی نہ جانے۔‘‘

قیامت کی دلیل:

قیامت پر ایسی دلیل دی ہے جو ہر ذی روح کے تجربے میں آتی ہے۔ اپنی پیدائش پر غور کرنے کو کہا گیا ہے۔ ہم طوراً بعد طورٍ کئی تطورات اور مختلف مراحلِ حیات سے گزر کر موجودہ ہیئت اختیار کرتے ہیں۔ عمر وفا کرے تو ابھی کئی منزلیں باقی ہوتی ہیں۔ یہ سب جسمانی تغیرات ہیں۔ قیامت بھی ایک تبدیلی اور تغیر ہی کا نام ہے، اس پر خدا کیوں نہ قادر ہو؟ پھر یہ ہر نیا انقلاب حالتِ گذشتہ کے لیے ناسخ ثابت ہوتا ہے۔ اگر خداوندِ عالم اس کائنات کو فنا کر کے ایک نیا جہان بسا دے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے!

انسانی تخلیق کا بنیادی عنصر:

﴿اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾ تخلیقِ اول اور ابتدائے آفرینش کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا گیا تھا، وہ ہمارے باپ تھے، ان کی پیدایش گویا ہماری اساسی پیدایش ہوئی۔ سورت حجر میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسٰنَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿26﴾﴾ [الحجر: ٢٦]

”اور یقیناً ہم نے انسان کو سڑے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے تخلیق کیا ہے۔“

انسان کے اجزائے ترکیبی:

انسانی وجود میں بے شک مٹی کے علاوہ دیگر عناصر بھی شامل ہیں۔ اہلِ یونان عناصرِ اربعہ، یعنی آگ، مٹی، ہوا اور پانی کے قائل تھے۔ موجودہ تحقیقات کے مطابق ہمارا وجود ساٹھ یا ستر اجزاء سے مرکب ہے، تاہم مٹی کا عنصر غالب ہے۔ ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کا باعث یہی تھا۔ اس نے غالب مٹی کو خالص مٹی سمجھا، حالانکہ مٹی کا عنصر اس میں بھی موجود ہے، لیکن مغلوب، اس میں آگ کا جزو غالب ہے۔ انسان کو مٹی سے بنا کر اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ٹھنڈک اور سنجیدگی مٹی کی خصوصیات ہیں۔ یہی صفات انسان میں بھی قابلِ ستایش ہیں۔

آگ اور مٹی کے اثرات:

ٹھنڈا دماغ اور سنجیدہ ذہن تدبر کی علامت ہے۔ صحیح الفطرت شخص ہمیشہ سوچ کر قدم اٹھاتا ہے اور کام بہتر طور پر انجام دیتا ہے۔ جلد بازی اور اشتعال میں کیے ہوئے کام خسارے کا سودا ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سنجیدگی غالب تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت و تدبر کے دامن کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ اسی لیے کسی فیصلے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھتانے اور افسوس کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ تیزیِ طبع قلتِ شعور کی علامت ہے۔

آدمی کے مغلوب الغضب ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس پر آگ کا عنصر غالب ہو جاتا ہے، پھر وہ بآسانی شیطان کا کھلونا بن جاتا ہے اور ایسی حرکات کر بیٹھتا ہے جو انسانی اخلاق کے منافی ہوں۔ حواس جواب دے دیتے ہیں۔ کوئی معقول بات اسے متاثر کر سکے، اس کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ فرمایا:

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴾ [طٰہٰ: ٥٤]

''بے شک اس میں عقل مندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔''

حضور ﷺ کی دعا تھی:

((اَللّٰهُمَّ أَحْسَنْتَ خَلْقِي فَأَحْسِنْ خُلُقِي))[1]

''خدایا! صورت کی طرح میری سیرت بھی اچھی بنا دے۔''

پہلا مرحلہ:

﴿ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ﴾ یہ قلیل چیز کے معنی میں ہے۔ ''رات ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی'' کو عرب کہتے ہیں: ''لَيْلَةٌ نَاطِفَةٌ''.

بدبودار پانی کا یہ قطرہ انسان کا بیج ہے، اس میں کئی جراثیم ہوتے ہیں۔ ایک جرثومے سے چھے فٹ جوان تیار ہوتا ہے۔ یہ خدا کی قدرت ہے۔ ننھی سی گٹھلی میں آسمان سے باتیں کرنے والا کھجور کا درخت سمایا ہوتا ہے۔ انگور کی وسیع و عریض بیل ایک دانے سے نکلی ہوتی ہے۔ پیپل کے تناور درخت کا مخرج بھی ایک پھل ہوتا ہے، جس میں کئی بیج ہوتے ہیں اور ہر بیج خدا کی مدد سے بہت بڑا درخت پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

فرمایئے! دنیا کے بیج سے آخرت کا پودا کیوں نہ تیار ہوگا؟

لفظ نطفہ سے ہمیں اپنی حقیقت و اصلیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ انسان کیا ہے؟ متعفن پانی کا ایک غلیظ اور ناقابلِ دید کیڑا جس نے رحم کی گندگیوں میں پرورش پائی۔ کوئی عقل مند ہو تو اس تصور سے غرور کی موت ہو جانا چاہیے۔

دوسرا مرحلہ:

﴿ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ﴾ وہ نطفہ اب گاڑھے خون کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انسانی اختیارات کا یہاں کوئی کام نہیں۔ ماں باپ بے خبر ہیں۔ قدرت کے مخفی ہاتھ سبھی کچھ کر رہے ہیں۔ تبارک وتعالیٰ احسن الخالقین خدا کے سوا کوئی خالق نہیں۔ اس کارخانۂ قدرت میں کسی پیغمبر کو دخل ہے

[1] مسند أحمد (٣٠٤/١)

نہ کسی ولی کو۔ وہ خود اپنی خلقت میں خدا کے محتاج ہیں۔ خدا چاہے تو کافروں اور دہریوں کو اولاد بخش دے، نہ چاہے تو محمد مصطفیٰ ﷺ کو اولادِ نرینہ سے محروم رکھے۔

﴿يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝٤٩ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ۭ﴾ [الشوریٰ: ٤٩، ٥٠]

''جسے چاہے (صرف) بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہے (صرف) بیٹے عطا کرتا ہے۔ یا اُن کو بیٹے اور بیٹیاں ملا کر دیتا ہے اور جسے چاہے بے اولاد رکھتا ہے۔''

کیا خیال ہے ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کا مالک حشر بپا نہیں کر سکے گا؟

تیسرا مرحلہ:

﴿ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ خون، گوشت کا لوتھڑا بن گیا۔ اب ہم اسے خام انسان کہہ سکتے ہیں۔ ہنوز وہ خدائی تربیت اور نگہداشت سے بے نیاز نہیں ہوا۔ ہم اب بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ صحیح سلامت پیدا ہو جائے گا۔ ممکن ہے اتنا کچھ ہونے کے بعد اِسقاط ہو جائے۔

بصورتِ ولادت خدا بہتر جانتا ہے وہ کیسی شکل کا مالک ہو گا؟ خوب صورت ہو گا یا بدصورت، معذور واپاہج ہو گا یا تندرست؟ ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ﴾ [آل عمران: ٦]

''وہی ہے جو (تمھاری ماؤں کے) پیٹوں میں تمھاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے۔''

﴿لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ﴾ طبی تحقیقات یہ تو جان سکتی ہیں کیا ہو رہا ہے؟ یہ نہیں معلوم کر سکتیں کہ کیوں ہو رہا ہے؟ دیر سے کوششیں ہو رہی ہیں کہ رحمِ مادر سے باہر مصنوعی بچہ پیدا کیا جائے، لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ بالفرض تجربہ کامیاب ہوا بھی تو اس کے لیے ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت کہاں سے مہیا ہو گی؟ بچے کو ماں باپ کی ضرورت تولد کی حد تک نہیں ہوتی، بلکہ اسے بعد میں بھی ان کی احتیاج ہوتی ہے، جس کو والدین کے سوا کوئی پورا نہیں کر سکتا۔ وہ خود خواہ کتنی بڑی مصیبت میں مبتلا ہوں، اولاد کو معمولی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ بالخصوص ماں کی تو بات ہی اور ہے، اس نے خونِ جگر پلا پلا کر اسے پالا ہوتا ہے، یہ بے لوث جذبہ مصنوعی طور پر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھا مرحلہ:

﴿وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾: رحمِ مادر میں بچے کی رہایش بالعموم نو ماہ ہوتی ہے۔ قدرت میعاد میں کمی بیشی کرے تو اس کی مرضی، چھے اور سات ماہ کے بچے بھی ہوتے ہیں۔ بعض کیس تین تین سال تک طول پکڑ جاتے ہیں اور کوئی بس نہیں چلتا۔ اس وقت پیروں کی کرامتیں کام کرتی ہیں نہ سائنس کے کرشمے۔

اولاد کے معاملے میں اچھے خاصے راسخ الاعتقاد لوگوں کا ایمان بھی دگرگوں ہونے لگتا ہے۔ قبروں پر آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے، تعویذوں کی گٹھڑیاں لاد لی جاتی ہیں۔ پیروں کی دکان داری چمک اٹھتی ہے اور ان کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں، حالانکہ یہ صرف خدا کا کام ہے، اسی طرف رجوع ہونا چاہیے، دولت کے لیے کوئی بہتر مصرف تلاش کیجیے۔

پانچواں مرحلہ:

﴿ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا﴾: مشینری مکمل ہو کر کام کرنے لگی اور ننھے میاں کبھی ماں کی گود میں اور کبھی جھولے میں پڑے نظر آتے ہیں۔ بلوغت تک طفل اور سراپائے احتیاج ہیں۔ یہ بچہ کس نے پیدا کیا؟

﴿قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾

[یٰسٓ: ۷۸، ۷۹]

”ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، جب کہ وہ گلی سڑی ہوں گے؟ آپ کہہ دیجیے: انھیں وہی (اللہ) زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا۔“

چھٹا مرحلہ:

﴿ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ﴾ وہ معصوم خیر سے جوان ہوتا ہے۔ اب وہ سینہ تانے، گردن اکڑائے اور قوی بازوؤں کو فضا میں لہراتے، غرور و نخوت سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے خدا کی زمین پر متکبرانہ چال چلتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ میری پیدایش کن کن ادوار سے ہو گزری ہے۔

ساتواں مرحلہ:

﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى﴾ اس جوان سے متعلقین کو بڑی توقعات وابستہ ہوتی ہیں، لیکن خدا

کو کچھ اور منظور ہوتا ہے، اس کی موت ہو جاتی ہے۔ راہی ان کی ویران قبر کے پاس سے بصد یاس یہ کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں ؏

حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے

آٹھواں مرحلہ:

﴿ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ﴾ بعض کو صبر آزما عمر نصیب ہوتی ہے۔ وہ موت کا انتظار کرتے ہیں، لیکن اس کا کہیں پتا نہیں۔ وہ شخص جو کبھی جوان تھا، اب دوسروں کے سہارے جی رہا ہے اور ان کے لیے آزمایش بنا ہوا ہے۔ خدا کی قدرت بابا جی پھر سے کاکا بن گئے، اعزہ تک کی پہچان نہیں رہی۔ سلسلۂ پیدایش میں انبیاء اور اولیاء بھی مستثنیٰ نہیں۔[1]



[1] خطبہ بتاریخ 7 جون 1963 شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (21 جون 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قیامت کی دلیل، مردہ زمین کو زندگی عطا فرمانا

﴿ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ ﴾ [الحج: ۵۔۷]

''اور آپ زمین بنجر اور خشک پڑی دیکھتے ہیں، پھر جب ہم نے اس پر پانی نازل کیا تو وہ لہلہا اُٹھی اور پھولی، اور اس نے ہر طرح کی خوش نما نباتات نکالیں۔ یہ (سب کچھ) اس لیے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے اور بے شک وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور بے شک وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔ اور یہ کہ بلاشبہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اور بے شک اللہ ان کو اُٹھائے گا جو قبروں میں (پڑے) ہیں۔''

قیامت کی دو دلیلیں:

قیامت کے ذکر سے سورت حج کا آغاز ہوا۔ منکرین کو اس سلسلے میں دو ایسی دلیلیں دی گئیں، جو روز مرہ ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں۔ اول کا تعلق پیدائش سے ہے، اس بارے میں گذشتہ جملہ وضاحت سے عرض کر دیا گیا تھا، یعنی مٹی سے لے کر ارذل العمر کو پہنچنے تک انسان جتنے مرحلے طے کرتا ہے، سب اس بات کی شہادت ہیں کہ خدا دوبارہ پیدا کرنے پر بھی بخوبی قادر ہے۔

نصوصِ شریعت میں عریانی کا شبہہ:

شاید آپ کو یہ چیز کھٹکی ہو کہ عبارت میں کچھ عریانی سی آ گئی ہے۔ ضرورت کے موقع پر ایسا ہو جائے تو حرج نہیں، بلاوجہ جنسی باتوں کو زبان پر لانا بری بات ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع

فرمایا ہے کہ میاں بیوی میں سے کوئی رات کی بات صبح اٹھ کر لوگوں سے کہتا پھرے۔[1] کوئی اچھا مقصد یا تعلیم و تربیت پیشِ نظر ہو تو کام کی بات بتانے سے حیا مانع نہیں ہونی چاہیے۔ قرآن مجید کا اپنا مخصوص اندازِ بیان ہے۔ وہ وضاحتِ حق میں جو مناسب سمجھتا ہے کہہ دیتا ہے، چاہے کوئی اس کے متعلق کیسی رائے رکھے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ﴾ [البقرۃ: ۲٦]

''یقیناً اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی سی بھی مثال بیان کرے، مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (حقیر یا عظیم) ہو۔''

یہاں بھی قیامت پر گفتگو کرتے ہوئے اس سے بہتر دلیل ہمارے سمجھانے کو اور کیا ہو سکتی ہے؟ مُردوں کو زندہ کر کے تو ہم دکھا نہیں سکتے، نظیر اور مثال دے کر ہی یہ تصور ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔

پچھلے دنوں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جسٹس محمد شفیع نے ایک مقدمے کے فیصلے میں حدیث پر بحث کرتے ہوئے امہات المومنین سے مروی ان احادیث پر تنقید کی تھی، جن میں تعلقاتِ زن و شو وغیرہ کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ان مقدس ماؤں نے بے شک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے کچھ عریاں مسئلے بیان کیے ہیں، لیکن ایسا کبھی بے موقع نہیں ہوتا تھا۔ استاد شاگرد کو بہت کچھ سکھاتا ہے۔ ماں بیٹی کو سب کچھ بتا دیتی ہے۔ عدالتوں میں زنا بالجبر کے مقدمات میں زبان سے کیا کچھ نہیں اُگلوایا جاتا؟ ضرورت کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ کتبِ حدیث میں ایسی باتیں آ گئی ہیں تو کیا ہوا؟ ہمیں ان سے نہایت اہم تعلیم ملتی ہے۔ تیرہ سو سال سے یہ حدیثیں لکھی پڑھی اور سنی جا رہی ہیں، کبھی کسی کو اعتراض نہیں ہوا، وہ شرم و حیا سے خالی تو نہیں تھے۔ نیز حدیث اس معاملے میں منفرد نہیں ہے۔ قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں عریاں اشیاء کا تذکرہ موجود ہے، کیا انھیں مٹا دیا جائے گا؟

بات کہنے کا ایک ڈھنگ اور مقام ہوتا ہے۔ رونقِ محفل اور جنسی تسکین کے لیے ایسی باتیں کی جائیں تو محلِ اعتراض ہیں۔ خیال فرمایئے! سارے معاشرے میں جگہ جگہ عریانی کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اور یہ لوگ بدرجہ غایت اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تفہیم کی خاطر اگر کچھ مذکور ہو تو نا جانے انھیں کیوں تکلیف ہوتی ہے!

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۳۷)

قیامت کی دوسری دلیل:

﴿ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ ﴾ [الحج: ۵۔۷]

''ھمد'' کے معنی سکوت، خشکی، بوسیدگی اور بے آب و گیاہ ہونے کے ہیں۔ پانی دستیاب نہ ہونے سے جب روئیدگی کی قوتیں معطل اور تر و تازگی اور بڑھاؤ ختم ہو جائے تو یہ زمین کی موت ہوتی ہے۔ پھر جب مینہ برستا ہے مردہ اور بنجر زمین میں حرکت پیدا ہوتی ہے، مسام کھلتے ہیں، چشمے پھوٹتے ہیں، ندی نالے بہتے ہیں اور کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، یہ زمین کی حیات ہے، جیسے فرمایا:

﴿ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا ﴾ [یٰسٓ: ۳۳]

''ایک نشانی مردہ زمین ہے، ہم نے اسے زندہ کیا۔''

جس طرح آدمی جیتا اور مرتا ہے، زمین بھی موت اور زندگی سے دوچار ہوتی ہے۔ یہ انسان جو کل معدوم تھا، آج موجود ہے، فنا ہو کر دوبارہ عالمِ وجود میں آ جائے گا، یہ قیامت ہوگی۔

وہی حق ہے:

پھر فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ پے در پے خدا کی تین ذاتی، فعلی اور وصفی صفتوں کا علی الترتیب بیان ہوا۔ وہی ''حق'' ہے۔

حق یہاں ''باطل'' کے بجائے ''فانی'' کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔ خدا کے سوا ہر چیز فانی ہے، وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ اس پر کبھی زوال نہیں اور کوئی نہیں جس نے دائمی زندگی پائی ہو۔ کچھ موت کا پیالہ پی چکے ہیں، کچھ وہ ہیں موت جن کے انتظار میں ہے۔ انبیاء، اولیاء اور دیگر اکابر آئے اور تشریف لے گئے۔ اب ہم ان کے لیے صرف دعائے رحمت ہی کر سکتے ہیں۔ آپ انھیں زندہ مانیں، آپ کی مرضی، بہرحال وہ اس جہان میں کہیں موجود نہیں ہیں۔ موت کا سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا، یہاں تک کہ قیامت قائم ہوگی، کیوں کہ اصل ''حیی'' موجود ہے: ﴿ وَاَنَّهٗ يُحْيِ

﴿الْمَوْتٰى﴾ اس فعلی صفت میں شرک کرتے ہوئے کسی نے احیائے موتی کو اوروں کی طرف منسوب کیا اور کسی نے محال سمجھتے ہوئے اس کا انکار کیا:

﴿مَنْ يُّحْيِ الْعِظٰمَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿78﴾﴾ [یٰسٓ: ۷۸]

''ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، جب کہ وہ گلی سڑی ہوں گی؟''

بے شک زندگی دینا انسان کے بس کا روگ نہیں، لیکن خالقِ کائنات کو اپنے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ وہ قادرِ مطلق سب کچھ کرسکتا ہے۔

نتیجہ:

آخر میں کہا: ﴿وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا﴾ قیامت یقیناً بپا ہوگی، اس کی آمد شک سے بالا ہے۔ اس روز مردے قبروں سے ایسے ہی جی اٹھیں گے، جیسے قدرتِ ایزدی سے بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اور زمین سے کھیتی پھوٹ نکلی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.[1]



[1] خطبہ بتاریخ 14 جون 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (28 جون 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

بحث کے آداب

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍۙ ‏﴿۸﴾‏ ثَانِىَ عِطۡفِهٖ لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ لَهٗ فِى الدُّنۡيَا خِزۡىٌ‌ وَّنُذِيۡقُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ‏ ﴿۹﴾‏ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ‏﴿۱۰﴾‏ ﴾ [الحج: ۸۔۱۰]

''اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر روشن کتاب کے بحث کرتے ہیں۔ (تکبر کی وجہ سے حق سے) پہلو تہی کرتے ہوئے، تاکہ وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بہکائے، اس کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور یومِ قیامت ہم اسے جلانے والا عذاب چکھائیں گے۔ (کہا جائے گا:) یہ اس کا بدلہ ہے جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا، اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

گذشتہ آیتِ کریمہ میں پیدائش اور زمین کے انقلابات کے متعلق مذکورہ انفسی اور آفاقی دو دلیلیں سمجھ لینے کے بعد قیامت میں کوئی اشتباہ یا بحث و جدال کا موقع باقی نہیں رہ جاتا۔ یہ دلائل اس دعوے کے قطعی ثبوت ہیں کہ خدا مرنے والوں کو قبروں سے ضرور اٹھائے گا۔

قبر کیا ہے؟

قبر کے لیے ضروری نہیں وہ مٹی کا گڑھا ہی ہو۔ ناگہانی حادثوں کا شکار ہونے والے اگر درندوں، پرندوں اور مچھلیوں کی خوراک بن جائیں تو جانوروں کے پیٹ ہی ان کے لیے قبر ہوتے ہیں۔ میت جلا کر خاکستر کر دینے کے بعد اس کے ذرات کو ہوا یا پانی میں بکھیر دیا جائے تو مٹی کی گرد یا دریاؤں اور سمندروں کی تہہ پر ہی قبر کی حقیقت کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ یعنی ''قبر'' نام ہے دنیا اور آخرت کے درمیانی وقفے کا۔

اس برزخی زندگی میں آرام اور تکلیف پہنچنے کے متعلق حدیث میں جو کچھ اجمالاً بیان ہوا ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے، تفصیلی کیفیات نامعلوم ہیں۔ روح کا جسم کے ساتھ وہاں کیا تعلق ہوتا ہے؟ یقیناً وہ نہ تو دنیوی ہے اور نہ اخروی، بس ایک برزخی حیات ہے، جس کو ہم لفظ ''موت'' سے بجا طور پر تعبیر کر سکتے ہیں، اس کی ماہیت خدا جانے۔ اتنا اعتقاد ضرور ہے کہ خدا عنقریب سب کو از سرِ نو زندہ کرنے والا ہے۔

بحث کا طریقہ:

کوئی اس آفتاب سے زیادہ روشن اور لکھی ہوئی حقیقت نہ مانے تو اس کا کیا علاج؟ پہلی آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

کچھ ماننے یا منوانے کے لیے تین ہی معقول ذرائع ہوتے ہیں: یا تو بات ہی اتنی بدیہی ہو جہاں بحث کا سوال نہ رہے، نظری ہونے کی صورت میں قائل کرنے کے دو طریقے ہیں: دلیل عقلی ہو یا دلیل نقلی، یعنی کسی مستند کتاب کا حوالہ۔ قرآنی آیات تو بدیہیات ہیں، جن کا انکار بداہت کا انکار ہے۔ ان میں بحث کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہتا ہے مجھے سردی یا گرمی محسوس ہوتی ہے یا بھوک اور پیاس لگ رہی ہے تو آپ اس کا اعتبار نہ کرتے ہوئے بحث شروع کر دیں کہ بتاؤ تمھیں بھوک کیوں کر لگی ہے؟

نظری اور بحث طلب مسائل کو اللہ تعالیٰ نے دلائل سے موید کیا ہے، لیکن فرمایا: منکرین بحث و نزاع تو کرتے ہیں، لیکن بے تکے پن سے۔ ان کے پاس نہ یقینی علم ہوتا ہے نہ عقلی دلائل اور نہ کسی روشن کتاب سے استدلال۔

روشن کتاب:

کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔ دو آدمیوں میں اختلاف ہو جائے تو تحریری یادداشت اسے مٹا دیتی ہے۔ ذہن میں ظلمت اور تاریکی چھائی ہوئی ہو تو کتاب اسے رفع کر کے اجالا کر دیتی ہے۔ قرآن نور ہے۔ اس نے بے شمار ذہنوں سے تاریکیوں کو دور کر کے اَفہام کو منور کیا۔ حضور ﷺ کے نور ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ کے روشن دلائل اور چمکتے بیانات سے بنی نوعِ انسان کی تاریکیاں چھٹ گئیں، ورنہ (نعوذ باللہ) حضور ﷺ بتی کی طرح جلتے نہیں تھے۔

ہمارے لیے نبی کریم ﷺ کی باتیں نقلی دلائل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس آیت سے ماخوذ ہوتا ہے کہ عقل کے ساتھ ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ سے بھی ہمیں باقاعدہ راہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ غیر مسلموں سے بات چیت کا ڈھنگ بے شک جدا ہوگا، لیکن مسلمانوں کے لیے کتاب وسنت مستند ہیں۔ اصحابِ رسول ﷺ کا یہی طرزِ عمل تھا، وہ آپ ﷺ سے مسائل پوچھتے اور کامل اعتماد کے ساتھ ان پر ایمان لاتے۔

کفار کی کم عقلی:

کفار نے حضور ﷺ سے قیامت کے موضوع پر بحث کی۔ وہ اسے محال جانتے تھے، لیکن ان کا یہ استحالہ محض فرضی اور بے دلیل تھا۔ ''بداہت'' عقل اور نقل سے اس کو کوئی لگاؤ نہیں۔ بے شک وہ یا ان کے معبودانِ باطلہ قادر نہیں تھے، لیکن خدائے حقیقی تو اپنے جیسا نہیں ہو گیا۔ وہ مسئلۂ توحید اور نبوت پر بھی بحث کرتے تھے، لیکن نرا جھگڑا اور بحث برائے بحث۔

اصولِ مذکورہ کے تحت اگر بحث ہو تو مفید ہے، اس سے کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے متعدد مناظرے فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون اور فرعون سے تبادلۂ خیالات کیا۔ بعض لوگ نبی کریم ﷺ سے بھی حلف اٹھوا کر مسائل کی تسلی کرتے، ایسے مناظروں میں کوئی نقصان نہیں، لیکن بلا دلیل شور مچانا اور اپنے مقتدیوں کو متاثر و مرعوب کرنے کے لیے نعرہ ہائے جہالت کا سہارا لینا دھکا شاہی ہے۔ چوری اور سینہ زوری اسی کو کہتے ہیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ اولیاء اللہ زندگی میں ہمارے لیے دعا تو کر سکتے ہیں، لیکن خدائی کاموں میں انھیں کوئی دخل نہیں تو حیران ہو کر پوچھتے ہیں: پھر ان کا فائدہ کیا ہے؟ گویا ان کے نزدیک اولیاء کا مصرف صرف یہی رہ گیا ہے کہ انھیں الوہیت کا پیوند لگا کر رکھا جائے!!

مناظرہ اور جہاد:

مناظرے کی مثال جہاد کی سی ہے۔ خون خرابہ اچھا نہیں، کلمۂ حق کی بلندی کے لیے لڑائی گلے پڑ جائے تو فرار بھی نامناسب ہے۔ نبی کریم ﷺ کا مدینے میں دس سالہ قیام جہاد کی مصروفیتوں میں گزرا، تاہم جنگ جوئی اور خون ریزی کو طبعاً کبھی پسند نہیں فرمایا۔ ہمیشہ مجبوری کی حالت میں لڑائی لڑی۔ قرآن کا بھی آپ کو یہی حکم تھا:

﴿ وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ﴾ [الأنفال: ٦١]

"اور (اے نبی!) اگر وہ آپ کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جائیں۔"

چھے ہجری میں جب نبی کریم ﷺ دیگر صحابہ کے ہمراہ عمرے کی نیت سے مکہ میں داخل ہونے کے قریب تھے اور حرم میں لڑائی کا خدشہ بھی تھا، یکا یک آپ کی "قصواء" نامی اونٹنی بیٹھ گئی۔ لوگ کہنے لگے: "خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ، خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ" "قصواء رک گئی، قصواء رک گئی۔" حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَا خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ وَمَا ذَاكَ لَهَا بِخُلُقٍ وَلٰكِنْ حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيلِ)) [1]

"قصواء رکی نہیں نہ اس کی یہ عادت ہے، لیکن اسے ہاتھیوں کو روکنے والے نے روکا ہے۔"

آپ ﷺ خدائی اشارہ سمجھ گئے، فوراً اونٹنی کو کھڑا کیا، باگیں موڑ لیں اور حدیبیہ میں خیمہ زن ہوئے۔ لیکن جب لڑنا پڑ ہی جائے تو پھر کسی کا بھاگنا گناہِ عظیم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مناظرہ جہالت کی بے اعتدالیوں سے پاک اور افہام وتفہیم کے لیے ہو تو مناظرے کی شکل میں حمایتِ حق غیر طبعی فعل نہیں۔ بہر حال مباحثہ یا مجادلہ اگر نیک نیتی اور سمجھنے کے لیے کیا جائے تو نتیجہ خیز ہوتا ہے، ورنہ غرور کی سزا دو جہان میں ذلت و رسوائی مقرر ہے۔ [2]



[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٣١)

[2] خطبہ بتاریخ 21 جون 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (5 جولائی 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بارگاہِ خداوندی میں عزت وتوقیر کا معیار

﴿ثَانِیَ عِطۡفِهٖ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّ نُذِیۡقُهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿9﴾﴾ [الحج: ۹]

’’(تکبر کی وجہ سے حق سے) پہلو تہی کرتے ہوئے، تاکہ وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بہکائے، اس کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور یومِ قیامت ہم اسے جلانے والا عذاب چکھائیں گے۔‘‘

تقلید:

پہلے بیان کیا گیا ہے کہ آخرت کا انکار عقل و نقل، یعنی سوچ اور کتابی علم، دونوں کے خلاف ہے اور بلا دلیل جھگڑنا خدا کے ہاں پسندیدہ نہیں۔ آخری مرتبہ بحث تقلید کی رہ جاتی ہے۔ مقلدین کہا کرتے تھے:

﴿اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ﴿23﴾﴾ [الزخرف: ۲۳]

’’بلاشبہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا اور ہم تو انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔‘‘

یعنی ہم نے اپنے بڑوں سے یہی سنا ہے۔ یہی کچھ ہمیں پتا ہے اور یہی کچھ ہم کریں گے، حجت اور مدلل انداز میں گفتگو نہیں۔ ’’تقلید‘‘ جہالت کا دوسرا نام ہے، اسے اپنے حق میں بہتر سمجھ کر پھولنا اور ناز کرنا، پرلے درجے کی جہالت ہے۔ علم و حقیقت سے چشم پوشی کر کے جہالت کو اس کے قائم مقام نہیں بنایا جا سکتا۔

ہدایت و ضلالت کو ایک دوسرے سے سروکار نہیں، روشنی اور تاریکی ہمیشہ سے جدا جدا ہیں۔ لاعلمی کو دلیلِ راہ بنانے کے بجائے اسے ناقابلِ تلافی قصور تصور کرنا چاہیے۔ کنویں کا مینڈک بن

جانے سے اگر بیرونی دنیا کی ہوا معلوم نہ ہوتو یہ عذر معقول نہیں۔ ارشادِ پیغمبر ﷺ کے سوا کسی کا قول و فعل معتبر نہیں ہوسکتا، اِلا یہ کہ وہ کتاب وسنت سے ٹھیک ٹھیک مطابقت رکھتا ہو۔

تکبر:

﴿ ثَانِيَ عِطْفِهٖ ﴾ سے ایسے شخص کی تصویر کھینچی ہے جو دلیل سے منہ موڑ کر بے پر کی اڑانے کا عادی ہے۔ ''عطف'' کے معنی پہلو کے ہیں۔ پہلو یا کروٹ پھیرنا غرور کی بنا پر ہوتا ہے۔ حق سن کر گردن پھیر لینا یا ترچھی نگاہوں سے دیکھنا ''تکبر'' ہے۔ بعض منچلوں کی عادت ہوتی ہے کہ مسئلہ اپنی شان کے موافق نظر نہ آئے تو کہہ دیتے ہیں: اس کو پتا ہی کیا ہے؟

صفتِ غرور لائقِ تحسین نہیں، بالخصوص دین اور حق کے مقابلے میں تو کچھ بھی پلے نہیں رہ جاتا ہے۔ غلط نہ ہوگا اگر اسے شرک کے ہم پلہ قرار دے دیا جائے۔ بڑائی صرف خدا کی ذات کو زیبا ہے:

((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ)) [1] ''ذاتی بڑائی صرف میری چادر ہے۔''

ہمیں دعوائے کبریائی کا استحقاق نہیں۔ انسان بے شمار بڑائیاں اور عظمتیں حاصل کرتا ہے، وہ علامہ، فلاسفر، مفکر، ادیب، شاعر اور بہت کچھ ہوتا ہے، لیکن اس سے وہ اتنا بڑا نہیں ہو جاتا کہ اسے حقِ غرور پہنچے۔ دنیا میں کئی خدا کے بندے اس سے بھی بلندتر مقام رکھتے ہیں۔ اور کوئی نہیں تو اللہ کی جامع الصفات ہستی تو کہیں گئی نہیں کہ ﴿ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿٧٦﴾ ﴾ [يوسف: ٧٦] ''اور ہر صاحبِ علم کے اوپر ایک زیادہ علم والا ہے۔''

تکبر صرف خدائی صفت ہے:

عظیم انسان کو خدا کی عظمت کا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ شد و مد سے قائل اور ممنون ہونا چاہیے، نیز یہ بڑائیاں ازخود کسی کو حاصل نہیں ہو جاتیں، ذاتِ الٰہی نے انھیں بندے کو عطا کیا ہوتا ہے۔ ہم کتنے ہی اونچے مناصب پر فائز ہوں، کتنا ہی دنیوی جاہ وحشم ہمیں حاصل ہو، کروڑوں روپے کی جائیداد ہماری ملکیت ہو جائے، ہم پھر بھی اس کے دربار کے منگتے، فقیر اور سائل ہیں:

﴿ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿١٥﴾ ﴾ [الفاطر: ١٥]

[1] مسند أحمد، رقم الحديث (٨٨٩٤)

''تم (سب) اللہ ہی کے محتاج ہو اور اللہ ہی بالکل بے نیاز، قابلِ تعریف ہے۔''

ہر چیز اپنی جگہ پر ہی اچھی لگتی اور حسین نظر آتی ہے۔ کبر کا مقام فقط خدا کی ذات ہے، یہیں اسے حسن ملتا ہے۔ اور کون ہے جو کبر کا اہل ہو؟ ناموزوں جگہ پر کبر بے ڈھنگا لگتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایسے الفاظ کے استعمال سے روکا ہے جس سے مخلوق کی برتری مفہوم ہوتی ہو۔ فرمایا:

《أَخْنَىٰ الْأَسْمَاءِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ اللّٰهِ رَجُلٌ تُسَمّٰى مَلِكَ الْأَمْلَاكِ》[1]

یعنی اللہ کے نزدیک کسی کا مبغوض ترین نام روزِ قیامت شہنشاہ ہے، کیوں کہ بادشاہوں کا بادشاہ اور تمام کا آقا وہی ہے۔ باقی بڑے چھوٹے سب اس کے حقیر بندے ہیں۔ وہ اپنے بارے میں کسی کی شرکت اور بھائی چارہ برداشت نہیں کرتا:

《أَنَا أَغْنَىٰ الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ》[2]

''میں شرک کے معاملے میں تمام شریکوں سے زیادہ بے پروا ہوں۔''

متکبر صفتِ کبر میں رب کا شریک وسہیم بن کر اپنے ایمان کو غارت کر لیتا ہے۔ مومن کو اس سے پاک ہونا چاہیے، کیوں کہ بندۂ مومن کا دل خدا کا گھر ہوتا ہے، وہاں اور کسی کے لیے گنجایش نہیں ہو سکتی اور جس دل میں ماسوا اللہ کی محبت اور بڑائی سما جائے، خدا کی محبت وہاں سے الگ ہو جاتی ہے۔

علماء کو نصیحت:

علماء ومناظرین کو میں خاص طور پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ اپنے علم وفن میں بہت مغرور ہو جاتے ہیں، ان کی کبریائی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ غلط بھی کریں تو ''ٹھیک'' ہوتا ہے۔ کسی سے حق بات سن کر اپنے رویے کو بدل لینا ان کے لیے کسرِ شان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایک عام اور سادے آدمی کو اچھی بات مل جائے تو وہ اس پر عمل پیرا ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور عالم اپنے علم کے گھمنڈ میں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔

تکبر یہود کی صفت ہے:

علمائے یہود اسی بیماری میں مبتلا تھے، انھیں اپنے علم پر ناز تھا:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٥)

﴿ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ﴾ [الغافر: ٨٣]

''تو وہ اس (جھوٹے) علم پر اِتراتے رہے جو اُن کے پاس تھا۔''

وہ حضور ﷺ پر اس لیے ایمان نہ لائے کہ انھیں آپ کے ''اُمی'' ہونے پر اعتراض تھا۔ خدا کی قسم ان کا سارا علم آپ ﷺ کی اُمیت پر قربان، بلکہ یوں کہیے کہ وہ علم جو انھیں صحیح راہ نہ دکھا سکا، جہالت سے بھی فروتر تھا۔ کفارِ مکہ کو بھی کچھ اسی قسم کے غرور نے بگاڑا تھا، وہ کہا کرتے:

﴿ لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَيْهِ ﴾ [الأحقاف: ١١]

''اگر وہ (دین) بہتر ہوتا تو وہ (عام لوگ) اس (کو قبول کرنے) میں ہم سے پہل نہ کرتے۔''

خود کو وہ اتھارٹی خیال کرتے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کسی خیر سے محروم رہ جائیں، گویا بھلائی ان کے گھر کی لونڈی ہی تو تھی۔ قانون یہ ہے کہ ''پیاسا'' کنویں کے پاس چل کر آتا ہے نہ کہ کنواں۔ مومن کی دینی حمیت اسے تلاشِ حق سے نہیں روکتی، وہ مسلسل اس کوشش میں رہتا ہے، اسے کہیں سے فیض مل جائے:

((اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤمِنِ حَيْثُمَا وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا))[1]

''اچھی بات مومن کی گم شدہ متاع ہے، وہ اسے جہاں بھی پائے، اس کا زیادہ حق دار ہوتا ہے۔''

اچھی زندگی تکبر نہیں:

نبی کریم ﷺ سے کبر کے متعلق گفتگو سن کر ایک صحابی کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ کچھ نہ کچھ بڑائی تو ہر کوئی چاہتا ہے، مثلاً: یہ کہ اس کا لباس اچھا ہو، اس کا جوتا خوب صورت ہو (کہیں یہ بھی تو کبر میں شامل نہیں؟) آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ، اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ))[2]

''بے شک اللہ تعالیٰ خوب صورت ہے، خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو انکارِ حق اور لوگوں کو ذلیل سمجھنا ہے۔''

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٦٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١)

یہود کے نقشِ قدم پر:

اس آئینے میں حال کے مشرکین اپنا چہرہ بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ یقین جانیے، ان کے پاس کوئی کام کی دلیل نہیں ہوتی جس پر کوئی شریف آدمی غور کر سکے۔ صرف علمائے یہود کی طرح بدتر از جہالت، علم کا غرور ان کے دماغوں میں رچا ہوا ہے، جس سے حق کو دھتکار دیتے ہیں اور بندگانِ خدا کو ذلیل اور بے وقوف سمجھتے ہیں۔

''کبر'' انسانیت کی توہین ہے:

کسی انسان کو کم تر خیال کرنا بڑی نادانی ہے۔ اس سے انسانیت کی توہین ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت آدمیت کو نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے، جب کہ ہم سبھی اسی نوع سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں:

«كُلُّكُمْ بَنُوْ آدَمَ وَ آدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ»[1]

''تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے تھے۔''

تقویٰ بڑی چیز ہے:

دنیا میں سیادت و رفعت کا وجود ہے، لیکن خدا کے ہاں انسان دنیوی پیمانوں سے نہیں ماپا جاتا، وہاں بڑائی کا معیار کچھ اور ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٣]

''بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام بے شک بھوکے تھے، لیکن اس مردِ قلندر کے وجود سے کروڑوں فرعون لرزتے تھے۔ ہمارے ائمہ کرام اور بزرگ اسلاف، جن کی گھریلو حالت کا اللہ ہی حافظ ہوتا تھا، دلیری اور بے باکی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ تخت و تاج کے وارث کبھی ان کی نگاہوں میں نہ جچ سکے۔ بادشاہ ان کی شانِ فقر کو حسد و رقابت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے حجاج بن یوسف کے سامنے جس بے خوفی سے تقریر کی، آج تک وہ ضرب المثل ہے۔[2]

[1] مسند البزار (٢٩٣٨)

[2] دیکھیں: البدایة والنهایة (١٢/٥١٣)

بات یہ ہے کہ یہ لوگ صرف خدا سے ڈرنے والے تھے۔ ان کے نزدیک سوائے خدا کے اور کوئی ڈرنے کی چیز ہی نہ تھی۔ وہ خود بڑا بنتے تھے اور نہ انھیں غیراللہ کی کبریائی کا قائل کیا جا سکتا تھا۔

برا محسوس نہ ہو تو اپنے عمل کو بھی ایک نظر دیکھ لیجیے! غرور کے پتلے کمزوروں کو آنکھیں دکھاتے ہیں اور خدا کے علاوہ ہر طاقت کا خوف ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اور ستم یہ کہ اپنے آپ کو بڑا حضرت اور علامہ سمجھے ہوئے ہیں!

دین سے بے توجہی:

﴿ثَانِيَ عِطْفِهِ﴾ کا ایک دوسرا مفہوم ''اعراض'' اور ''بے پروائی'' ہے۔ یہ بھی بری عادت ہے۔ دین کی بات سے پہلو تہی برت کر، سنی اَن سنی کر دینا غافل لوگوں کا کام ہے۔ کبر میں اگر شرک کی بو پائی جاتی ہے تو غفلت شعاری بھی خدا سے بہت دور لے جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ [الأعراف: ٢٠٤]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے (کان لگا کر) سنو اور خاموش رہو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

حضور ﷺ جب خطبہ دے رہے ہوتے تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رخ آپ کی طرف ہوتا۔ خطبہ جمعہ کے دوران میں کسی کو نشستِ احتباء بیٹھنے کی اجازت نہ تھی،[1] کیوں کہ اس سے نیند آ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔

ایسے ہی بات چیت بھی منع ہے۔ کوئی نادان بولنے کی غلطی کر بیٹھے تو اسے چپ کرانے کو بھی حضور ﷺ نے لغو قرار دیا۔[2] یعنی ایسی کوئی حرکت جائز نہیں سمجھی گئی جس سے غفلت پیدا ہوتی ہے۔ ہمہ تن گوش ہو کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا پیغام سننا چاہیے۔

کفر کی امامت:

پھر فرمایا:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٥١٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥١)

﴿لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۗ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ [الحج: ٩]

جو خود گمراہ ہو، کسی دوسرے کو سیدھی راہ پر چلتے دیکھنا اس کی برداشت سے باہر ہوتا ہے اور اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ میری طرح سب بہک جائیں۔ اگر میں حق قبول نہیں کر سکا تو اور کسی کو یہ نعمت کیوں ملے؟ ابو جہل اور ابولہب اگر ذاتی طور پر نبوت کے معترف نہ ہوتے تو شاید انھیں کفر میں مثالی شہرت نہ ملتی، لیکن انھوں نے دوسروں کو ایمان سے باز رکھنے کے لیے ایذا دہی اور گمراہ کن پروپیگنڈا کرنے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا کر کفر میں امامت کا ''اعزاز'' حاصل کیا۔

درسِ عبرت:

پھر ان کا حشر بھی وہ ہوا، جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔ میدانِ بدر میں انھوں نے عبرت ناک شکست کھائی۔ بھاگنے والوں کو اتنی فرصت نہ مل سکی کہ ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگا لیتے۔ یہ سردارانِ قریش جو کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے، اب ان کی لاوارث پڑی نعشیں گل سڑ رہی تھیں اور جانور انھیں نوچ رہے تھے۔ مسلمانوں نے ان نعشوں کو ایک کنویں میں پھینکا، جس پر کھڑے ہو کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((فَإِنَّا قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا؟))

''ہم نے خدا کا وعدہ سچا پایا، کیا تم نے بھی اپنے رب کا وعدہ برحق پا لیا ہے؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے:

''تُكَلِّمُ مِنْ أَجْسَادٍ لَا أَرْوَاحَ لَهَا؟''

''آپ اجسامِ مردہ سے مخاطب ہیں؟''

فرمایا: ((مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ لِمَا أَقُوْلُ مِنْهُمْ)) [1]

''تم میری بات ان سے زیادہ نہیں سن رہے ہو۔''

یہ مقامِ عبرت ہے۔ اس سے سبق لینے کے بجائے اپنا وقت اس استدلال میں ضائع نہیں کرنا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٧٦)

چاہیے کہ مردے سنتے ہیں۔ یہ نبی کریم ﷺ کا وقتی معجزہ تھا اور آپ ﷺ کا آخری پیغام تھا، جو اللہ تعالیٰ نے انھیں ڈانٹنے اور شرمسار کرنے کے لیے سنایا، جیسا کہ راویِ حدیث قتادہ سے بھی بخاری شریف میں مروی ہے۔[1]

یہ سزا ان کی دنیا میں تھی اور جن کو یہاں توبہ نصیب نہیں ہوئی، آخرت میں بھی ان کا انجام بڑا ہولناک ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ أَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ.[2]



[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۹۷٦)

[2] خطبہ بتاریخ 28 جون 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (12 جولائی 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام کے مفاد پرست دوست

﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ۝١٠ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ ۚ فَاِنۡ اَصَابَهٗ خَيۡرُ ۨاطۡمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنۡ اَصَابَتۡهُ فِتۡنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجۡهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ ‌ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ﴾

[الحج: ۱۰، ۱۱]

”(کہا جائے گا:) یہ اس کا بدلہ ہے جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا، اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اور لوگوں میں سے کوئی اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے (شک) پر، پھر اگر اسے بھلائی مل گئی تو اس پر مطمئن ہو گیا اور اگر اسے کوئی آزمائش آپڑی تو اپنے چہرے کے بل پلٹ جاتا ہے، اس نے دنیا اور آخرت میں خسارہ اُٹھایا، یہی کھلا خسارہ ہے۔“

دلیل سے بات کرنے کے بجائے رسوم و عادات اور من گھڑت کہانیوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے لیے سزا کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: یہ دونوں جہانوں کی ذلت ان کے اپنے اعمال کا کیا دھرا ہے، خدا ہرگز ظالم نہیں ہے۔

مفاد پرست:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ ۚ فَاِنۡ اَصَابَهٗ خَيۡرُ ۨاطۡمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنۡ اَصَابَتۡهُ فِتۡنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجۡهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ ‌ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ ۝١١﴾ [الحج: ۱۱]

اس آیت سے ایک نرالی قسم کے گروہ کا تذکرہ شروع فرمایا، انھیں سچی یا جھوٹی دلیل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، صرف ذاتی مفاد سے ان کو مطلب ہوتا ہے۔ جہاں مقصد حل ہو جائے، اسی کے گن

گانے لگتے ہیں اور وہی ان کا مذہب ہو جاتا ہے۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی دیوار یا پہاڑ کے سرے پر کھڑا ہو اور ہر آن یہ خطرہ رہے کہ ابھی پاؤں پھسلا اور گرا۔

منافقت:

ایک مسلک پر پختگی سے کار بند نہ ہونے والا ''منافق'' ہوتا ہے۔ اس پر ہر وقت عدمِ اطمینان کی کیفیت مسلط رہتی ہے۔ تذبذب، شبہات اور وسوسے اسے گھیرے رہتے ہیں۔ جونہی فائدہ نظر آیا، خوش ہو گیا کہ یہ مذہب بہت اچھا ہے اور اگر آزمایش کی گھڑی آ پہنچے تو عالمِ گھبراہٹ میں اسے کہیں اور کی سوجھتی ہے۔

وہ ہدایت سے نکل کر قعرِ ضلالت میں یوں گرتا ہے، گویا پہاڑ سے نیچے آ رہا ہو۔ اس کا مذہب موقع پرستی ہے۔ یہ اگر خدا کی عبادت کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ مستحقِ عبادت ہے، بلکہ اس کا ذاتی مفاد اس سے عبادت کراتا ہے۔ اس میں اس کا کچھ دنیوی مطلب پنہاں ہوتا ہے، جس کے لیے وہ اپنا ایمان فروخت کر دینے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ ایسے بدقسمت کو خدا پر یقینِ کامل نہیں ہوتا۔ وہ توکل علی اللہ کی نعمت سے یکسر محروم ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اسی شش و پنج میں رہتا ہے کہ نا جانے میری وہاں سنی جاتی ہے یا نہیں۔ دعا کی قبولیت میں تاخیر ہو جائے تو غیر اللہ سے استمداد کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے اور کفر اس کے رگ و ریشے میں سمایا ہوتا ہے۔ یہ کہاں کی دوستی ہے: خوشی میں ساتھ اور تکلیف میں فرار؟

چلو ادھر، جدھر کی ہوا ہو:

بعض مطلب پرست اتنے بد مذاق واقع ہوئے ہیں کہ مسجد میں جوتا گم ہو جائے تو اسی کو اپنے حق میں فالِ بد تصور کرتے ہوئے دین سے بیزار ہو جاتے ہیں اور خدا کے متعلق طرح طرح کے تشویش ناک خیالات اپنے دل میں بٹھا لیتے ہیں۔ ایک بدوی مدینے میں وارد ہو کر حضور ﷺ سے بیعت ہوا۔ اتفاقاً اسے بخار چڑھ گیا۔ آنحضرت ﷺ سے کہنے لگا: میری بیعت لوٹا دو۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمَدِيْنَةُ كَالْكِيرِ تَنْفِي خَبَثَهَا)) [1] ''مدینہ بھٹی کی مانند ہے جو گندگی کو نکال دیتا ہے۔''

اسی طرح بعض دیہاتیوں کو مدینے میں آ کر کوئی خوشی دیکھنا نصیب ہو جاتی۔ مثلاً مالِ غنیمت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٨٣)

میں سے حصہ مل گیا یا اونٹنی نے بچہ دے دیا تو کہتے: محمد ﷺ سچے ہیں۔ ذرا معاملہ ٹیڑھا ہو جاتا تو ذہن کی گندگی نکل کر باہر آ رہتی۔ منافقوں کا تو خیر شیوہ ہی یہ تھا کہ وہ مال کے پیچھے پیچھے بھاگتے تھے، جدھر سے مل گیا، اسی کے مدح سرا ہو گئے۔

آج بھی کئی مفاد پرست ایسے ہیں، جب انھیں محسوس ہوتا ہے کہ اپنی جماعت میں انھیں خاص مقبولیت حاصل نہیں، وہ فوراً ایسے گروہ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتے ہیں جہاں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے اور معقول تنخواہ مل جائے۔ حق و باطل کی تمیز ان کے پیشِ نگاہ نہیں ہوتی۔ دنیوی عزت اور پیسے کا لالچ ان کی نظروں میں وقیع ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک کھرے اور کھوٹے کی کسوٹی یہی ہوتی ہے کہ اپنا اُلو کہاں سیدھا ہوتا ہے۔

ایمان کی پرکھ:

﴿فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ ۖ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴿١١﴾﴾ [الحج: ١١]

''خیر'' اور ''فضل'' بھلائی اور بزرگی کے علاوہ دنیوی مال کے معنی میں بھی مستعمل ہوتے ہیں، جیسے: ﴿إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ﴾ [البقرۃ: ١٨٠] اور ﴿ابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ [الجمعۃ: ١٠] میں استعمال ہوئے ہیں۔

﴿فِتْنَة﴾ ''فَتَّانَةٌ'' سے ہے۔ یہ ''کسوٹی'' کے معنی میں ہے۔ خدائی آزمائشیں ایک طرح کی کسوٹی ہیں۔ ان سے ہر شخص کا ایمان پرکھ لیا جاتا ہے۔ صدقِ قلب سے مومن ہو تو وہ مزید پختہ کار ہوتا ہے۔ مفاد پرست ہو تو اس کی ''چیں'' بول جاتی ہے۔

1947ء کا انقلاب خدا کی بہت بڑی آزمایش تھی، بالخصوص مہاجرین کو تو خاصے کٹھن امتحانات سے گزرنا پڑا۔ اچھے لوگوں کے دل خوفِ خدا سے معمور ہو گئے۔ عبرت انگیز مناظر نے ان کے دل پر گہرا اثر چھوڑا اور ان کی عبادت میں نسبتاً زیادہ خشوع پیدا ہو گیا۔ دنیا دار طبقے نے اسے دوسرے معنوں پر محمول کیا، وہ نماز روزے سے بھی بے نیاز ہو کر خدا سے اور دور چلے گئے۔ ذوالوجہین اور بے ضمیر آدمی کو دنیا میں کوئی بھی اچھے نام سے یاد نہیں کرتا، اس کی دنیا بھی بگڑی اور میدانِ محشر میں بھی اس کا حشر دیدنی ہوگا: ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ﴾.

ہم اگر مومن ہیں تو پھر ڈگمگانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ آزمایشوں کے سامنے چٹان کی مانند ڈٹ جانا ہی درحقیقت صحتِ ایمان کی علامت ہے۔ یہ بھی کوئی ایمان ہے کہ درخت کے گرے پڑے پتوں کی طرح جدھر ہوا کا جھونکا آیا، ادھر پلٹا کھا گئے!

گھٹیا مقصد:

کچھ لوگ خدا کی عبادت تو کرتے ہیں، لیکن مقصد گھٹیا ہوتا ہے۔ صرف کاروباری اصلاح ان کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ بڑے زور و شور سے نمازیں پڑھیں، لمبی لمبی دعائیں مانگیں، جوں ہی مطلب نکل آیا، سب جوش و خروش ختم اور ڈھیلے پڑ گئے۔

کئی بھائی اسلام کی تعریف میں صرف اس لیے رطب اللسان ہوتے ہیں کہ یہ دنیوی اعتبار سے بہت مفید ہے۔ یہ بندے کا خدا سے کیا تعلق جوڑتا ہے؟ اس پر وہ غور نہیں کرتے۔ یہ ذہنیت اچھی نہیں۔ شکر ہے اہلِ توحید عموماً خدا کا در چھوڑ کر کہیں نہیں جاتے، یعنی ''شرک'' کی جانب کم ہی مائل ہوتے ہیں، لیکن تنگدستی میں ان کا ایمان بھی کچھ متزلزل سا ہو جاتا ہے۔ بددلی چھا جاتی ہے اور عبادت میں وہ ذوق و شوق نہیں رہتا، جو اس کا حقیقی جوہر ہے۔

یہ ہرجائی لوگ!

پیر پرستوں کی زندگی عجیب ہوتی ہے، انھیں کہیں بھی طمانیت اور یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ خدا سے دعا مانگی، نامقبول ہوئی اور اس سے بدظن ہو گئے۔ جھٹ کسی پیر فقیر کے آستانے پر قسمت آزمانے پہنچ گئے۔ فریاد گزار ہوئے، کچھ انتظار کے بعد معلوم ہوا کہ مراد بر نہیں آئی، اس سے بھی بدظن۔ پھر کسی سے پتا چلا کہ فلاں درگاہ شریف میں بڑی جلدی فریاد رسی ہوتی ہے، وہاں کا رخ کر لیا، یعنی ''ڈھلمل یقین'' خالق و مخلوق، دونوں سے ناامید ہو جاتے ہیں۔ خدا پر اعتماد نہ کسی اور پر بھروسا۔

یہ اگر کسی ایک روضے سے وابستہ نہیں ہوتے تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ ایسا کرنا شرک ہے، بلکہ اس لیے کہ اس صاحبِ روضہ نے بیٹا نہیں دیا ہوتا، یا کسی سودے میں برکت نہیں بخشی ہوتی۔ مفاد پرستی میں یہ خدا کا لحاظ نہیں کرتے۔

پیر تو خیر پیر ہی ہوتے ہیں۔ کتنے مفاد پرست اور مطلبی دوست واقع ہوئے ہیں یہ۔ ان حضرات

نے اب تک یہی سمجھا ہے کہ خدا تبھی لائقِ عبادت ہوسکتا ہے اگر انھیں بیٹے وغیرہ مہیا کر دے۔ ایسی جعلی دوستی ہم اپنے حق میں تو برداشت نہیں کرتے، نا جانے خدا کے بارے میں کیوں گوارا کر لی جاتی ہے؟ لیکن شاید عاشقوں کی لغت میں دوستی کا یہی مفہوم ہوتا ہو گا۔

حسنِ ظن:

حضرت زکریا علیہ السلام اولاد کے بغیر بوڑھے ضعیف ہو گئے، لیکن خدا کا دامن نہ چھوڑا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر بڑا نازک وقت آیا۔ دشمن کی یورش ہوتی، لڑائی کے تھپیڑے ہوتے، اندر اور باہر خطرہ اور ہر سو بے اطمینانی کا دور دورہ ہوتا، لیکن کبھی کسی کو خیال نہ آیا کہ اس پیغمبر کا ساتھ چھوڑ کر خلاصی حاصل کر لی جائے۔ جوں جوں ان پر مصائب ٹوٹتے، ان کا ایمان مضبوط ہوتا اور وہ پہلے سے زیادہ استقامت کا مظاہرہ کرنے لگتے۔ ان کے دل سوئے ظن سے پاک تھے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے مایوس ہو کر کبھی غیر اللہ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا، کیونکہ ان کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدٌ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰهِ»[1]

''مومن وہی ہے جو خدا پر حسنِ ظن رکھتا ہو۔''

ہمیں اپنا ذہن ہمیشہ صاف رکھنا چاہیے۔ کیسے بھی حالات ہوں، غیر اللہ کا در جھانکنا بے غیرتی، کفر اور بدترین گمراہی ہے۔ نیز ہماری عبادت کا مقصد بھی نیک ہو۔ دنیوی مقاصد ہیچ ہیں، انھیں اولیت دینے میں ہم اپنی دنیا برباد نہ کر لیں۔[2]



[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۸۷۷) میں اس حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: "عَنْ جَابِرٍ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ قَبْلَ مَوْتِهِ بِثَلَاثٍ يَقُوْلُ: «لَا يَمُوْتَنَّ أَحَدُكُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰهِ» ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تین دن پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرماتے تھے کہ تم میں سے کوئی شخص فوت نہ ہو، مگر صرف اس حال میں کہ وہ اللہ کے ساتھ اچھا گمان رکھتا ہو۔'' (عبدالسلام)

[2] خطبہ بتاریخ 5 جولائی 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (19 جولائی 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے سوا کوئی نفع اور نقصان کا مالک نہیں

﴿يَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنۡفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِيۡدُ ۝ يَدۡعُوۡا لَمَنۡ ضَرُّهٗۤ اَقۡرَبُ مِنۡ نَّفۡعِهٖ ؕ لَبِئۡسَ الۡمَوۡلٰى وَلَبِئۡسَ الۡعَشِيۡرُ﴾

[الحج: ۱۲،۱۳]

''وہ اللہ کے سوا اسے پکارتا ہے جو اسے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ اسے نفع دے سکتا ہے۔ یہی دور کی گمراہی ہے۔ وہ اسے پکارتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے، بلاشبہ وہ برا کارساز ہے اور بلاشبہ وہ برا ساتھی ہے۔''

بے دلیل مناظر اور مفاد پرستوں کے بعد تیسری مخالفِ اسلام صنف مشرکین کا بیان شروع ہوا۔ ان کا امتیازی نشان یہ بتایا کہ یہ ''غیر اللہ'' کو مدد کے لیے پکارتے ہیں، حالانکہ وہ کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں۔

اسباب کی دو قسمیں:

نفع اور نقصان کے اسباب کچھ ظاہری ہوتے ہیں اور کچھ باطنی، اور ہر دو غیر یقینی ہوتے ہیں:

1. ظاہری اسباب کا تعلق کبھی ہماری ''صحت'' سے ہوتا ہے، مثلاً دوا یا خوراک، ہم اسے فائدے کے لیے کھاتے ہیں، لیکن نتیجہ منشا کے خلاف ہوتا ہے۔
2. کبھی ظاہری اسباب کا تعلق ''معیشت'' سے ہوتا ہے۔ منافع کے لیے بیوپار کرتے ہیں تو گھاٹا پڑ جاتا ہے۔ سودے میں کسی کو خسارا پہنچانا مقصود ہوتا ہے، لیکن وہ فائدے میں رہتا ہے۔ معاملات میں بھی ہم نہایت سوچ بچار کے بعد اور اپنے لیے مفید خیال کرتے ہوئے کوئی قدم اٹھاتے ہیں، مگر وہ قدم غلط اٹھ جاتا ہے۔

اسی طرح باطنی اسباب بھی کبھی حسبِ توقع اثر پہنچاتے ہیں اور کبھی دم، تعویذ اور تمام روحانی عمل بے اثر، بلکہ الٹے پڑ جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ عامل کا کام تو زیادہ سے زیادہ دعا ہی کرنا ہوتا ہے۔ آگے اس کا اثر اور قبولیت، کلی طور پر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جزواً بھی کسی اور کو اختیار نہیں دیا گیا۔ یہ سب کچھ خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، ہم اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتے۔

مشرکین کی حماقت:

اب غور کیجیے! یہ اسباب جن پر ہمارا اختیار ہے، اپنی تاثیر میں اس قدر بے بس ہیں کہ وہ نفع و نقصان کی قطعی ضمانت نہیں۔ بڑے سیانے طبیب کا مشورہ غلط ہو جاتا ہے۔ مریض کسی کے زیرِ علاج رہتا ہے، طبیب نے کافی غور وخوض کے بعد اس کے لیے نسخہ تیار کیا، مگر حالت نہیں سدھرتی۔ وہ مایوس ہو کر کسی اور کی طرف رجوع کرتا ہے، وہاں سے پتا چلتا ہے کہ پہلے حکیم صاحب کی تشخیص ہی غلط تھی۔

ایک ہوشیار تاجر بعض دفعہ ایسی زبردست ٹھوکر کھاتا ہے کہ دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ سارے منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں۔ بڑے بزرگ کی دعا نامقبول ہو جاتی ہے۔ یعنی اسباب کی دنیا نفع و نقصان کی ذمے داری لینے کو آمادہ نہیں اور یہ مشرکین اتنے احمق ہیں کہ ان سے مرادیں مانگتے ہیں، جن کا سرے سے وجود ہی کوئی نہیں۔ سنگ تراش اپنے ہاتھ سے بت بناتے ہیں اور وہ پجاریوں کے لیے بت بن جاتے ہیں، اسے بڑی بڑی مشکلات حل کرنے کو کہتے ہیں اور وہ اس قابل بھی نہیں ہوتا یہ کہے کہ مجھے بھوک لگی ہے، کھانا لا دو۔ یہ کہے کہ کھانا لے جاؤ، مجھے ضرورت نہیں۔ یہ تو مکھی کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ۚ﴾ [الحج: ۷۳]

”بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی ہرگز نہیں پیدا کر سکتے، اگرچہ وہ (سارے بھی) اس کے لیے جمع ہو جائیں، اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے تو وہ اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔“

خود ہمیں کئی دفعہ مکھی ستاتی ہے۔ آپ تنگ آ کر اس کا کام تمام کرنا چاہتے ہیں، وہ فوراً دوسری جگہ بیٹھ کر کاٹنے لگتی ہے اور تھپڑ اپنے آپ ہی کو لگ جاتا ہے، اس طرح بڑے بڑے بزرگوں سے بھی ہو جایا کرتا ہے۔

قبر پرستی:

قبروں کا بھی یہی حال ہے۔ ہم خود ہی ان پر فنِ تعمیر کا ہیبت ناک شاہکار بنا کر جھک جاتے ہیں۔ وہاں روزانہ کئی من دودھ آتا اور پیا جاتا ہے۔ نذر و نیاز کی دیگیں پہنچتی اور تقسیم فرمائی جاتی ہیں۔ ان بے چاروں کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہماری تربت سے کیا بیت رہی ہے اور یہ ان سے نفع ونقصان کی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں!!

شفاعت اور دعا:

بتوں کے پجاری ہوں یا قبروں کے مجاور، دعا اور پکار سے مقصد سب کا یہی ہوتا ہے کہ ان کی ''شفاعت'' ہو جائے۔ شرک کا کارخانہ بس ''شفاعت'' پر قائم ہے اور یہ نامعلوم کوشش ہے۔ زندہ کی سفارش یقینی نہیں ہوتی، پتھر کی مورتیوں اور مٹی کے ڈھیروں کی سفارش کا ذکر ہی کیا ہے، ان سے آس لگانا شرکِ محض ہے۔

انبیاء نے بعض دعائیں کیں، لیکن قبول نہ ہوئیں۔ ہم دعا کر کر تھک جاتے ہیں، شنوائی نہیں ہوتی۔ بارش رک جاتی ہے، سارے جہان کے ولی زور لگا بیٹھتے ہیں، خدا کو منظور نہ ہو تو نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک ''مجتہد'' جو کتنا بڑا عالم ہوتا ہے اور اپنے علم سے قوم کو بہت فیض پہنچاتا ہے، اس کے متعلق بھی مانا ہوا مقولہ ہے:

''قَدۡ يُخۡطِئُ وَقَدۡ يُصِيبُ'' ''کبھی غلط اور کبھی صحیح کہتا ہے۔''

اسباب کی بے چارگی:

اس دنیائے ہست و بود میں پائے جانے والے اسباب، ہماری سمجھ سے متعلق ہوں یا اس سے ماورا، قانونی حیثیت نہیں رکھتے۔ حالات ہر طرح سازگار ہوں تو بھی کسی بات کا دعویٰ غیر ممکن ہے۔

حالات موافق بھی رہیں تو بھی یہ صف کی صف پڑی بے کار رہ جاتی ہے۔ اور جب خدا فضل کرنے پر آئے، حالات کتنے ہی سنگین اور مخالف ہوں، پروا نہیں۔

کنواری مریم کے بطن سے مسیح پیدا ہو گیا (علیہما السلام)، زکریا علیہ السلام کی جوانی روتے روتے گزر گئی، مگر یحییٰ بیٹا بڑھاپے میں نصیب ہوا۔ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی ہوا، اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام ضعیف العمری کی اولاد ہیں، خدا کسی خشک اور عمر رسیدہ پودے کو ثمر دار کر دے تو اس کے لیے کیا رکاوٹ ہے۔

﴿ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ [هود: ٧٣]

"اللہ کی رحمت اور برکتیں ہوں تم پر اے اہلِ بیت!"

خدا نہ چاہے تو دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، کچھ نہیں ہو سکتا۔ کتابِ ذہن سے یہ ورق اکھاڑ پھینکیے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر بھی کوئی نفع و نقصان پہنچا سکتا ہے۔

انبیاء بے بس ہیں:

پانی دم بہ دم چڑھ رہا تھا، پہاڑوں کی چوٹیاں زیرِ آب ہو رہی تھیں اور بیٹا باپ کی نظروں کے عین سامنے ڈبکیاں کھا رہا تھا، اس وقت کشتی سے آواز بلند ہوتی ہے:

﴿ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴾ [هود: ٤٥]

"اے میرے رب! بے شک میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے، اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلے کرنے والوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی خدا کے سامنے ایک نہایت ہی عاجزانہ درخواست تھی۔ جنھوں نے ساڑھے نو سو سال اپنے رب کی تبلیغ کی تھی۔ دن دیکھا نہ رات، برابر خدمت میں مصروف رہے۔ جب لختِ جگر کی جان بخشی کے لیے درخواست گزار ہوتے ہیں تو سخت جھاڑ پلا دی جاتی ہے اور اتنا صاف جواب ملتا ہے کہ مزید کچھ کہنے کا حوصلہ ہی نہیں رہتا اور معافی مانگ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

حشر کے دن ابو الانبیاء ابراہیم علیہ السلام، باپ کے لیے فریادی ہوں گے تو بات نہیں مانی جائے گی۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی تمنا تھی کہ سب راہِ راست پر آ جائیں، لیکن فرمایا:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [البقرۃ:۲۷۲]

''(اے نبی!) لوگوں کو ہدایت دینا آپ کی ذمے داری نہیں، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

آیت کی عمومیت:

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ﴿ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ﴾ کا تعلق بتوں یا مُردوں کے ساتھ ہی ہے۔ میرے نزدیک جینے والے بھی رتی بھر نفع ونقصان کے مالک نہیں۔ یہ پر خلوص دعا، دردمندانہ اپیل، عاجزانہ درخواست اور سوز بھری شفاعت تو کر سکتے ہیں، لیکن قبولیت کا کلی اختیار خدائے وحدہ کی ذات کو ہے۔

اُحد میں کیا گزری؟

حالات دیکھتے ہوئے احد میں فتح یقینی تھی، لیکن جو ہوا توقع کے خلاف تھا۔ ستر صحابہ شہید اور اتنے ہی زخمی ہو گئے، حالانکہ اسی لشکر میں سرکارِ دو عالم ﷺ کی بابرکت ذات جلوہ فرما تھی۔ عظیم القدر صحابہ بھی موجود تھے، جن کا رتبہ اولیاء سے کئی چند زیادہ ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا یہ حال تھا کہ آگے کے چاروں دانت شہید ہو چکے تھے۔[1] علی رضی اللہ عنہ پانی لا رہے تھے، فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا زخم دھو کر مرہم پٹی کر رہی تھیں اور سردارِ کونین ﷺ بصد غم فرما رہے تھے:

((اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ دَمَّوْا وَجْهَ نَبِيِّ اللّٰهِ))[2]

''اس قوم پر اللہ کا غضب شدید ہو گیا جس نے اللہ کے نبی کے چہرے کو لہولہان کر دیا۔''

پکارنا بھی عبادت ہے:

﴿ يَعْبُدُ ﴾ کے بجائے ﴿ يَدْعُوْا ﴾ کا لفظ مظہر ہے کہ غیر اللہ کو پکارنا بھی شرک ہے، کیوں

[1] آنحضرت ﷺ کا صرف ایک رباعی دانت شہید ہوا تھا، جو نیچے کی قطار میں درمیان کے دو دانتوں کے ساتھ دائیں طرف ملتا ہے۔ دیکھیے: صحیح بخاری "باب ما أصاب النبيﷺ من الجراح يوم أحد" اس کے تحت قسطلانی اور دوسرے شارحینِ بخاری کا بیان ملاحظہ کریں۔ (عبدالسلام)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٧٤)

کہ دعا عبادت ہے۔ اس لیے مفسرین غیر اللہ کو مدد کے لیے پکارنے کو ہو بہو بت کے آگے سجدہ ریز ہونے کے مترادف سمجھتے ہیں۔

حرفِ ندا ''یا'':

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حرفِ ندا ''یا'' سے کیا ہوتا ہے؟ بحث ''یا'' میں نہیں، بلکہ اس ذہنیت میں ہے جو اس کے پیچھے کارفرما ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اہلِ توحید نے بھی اپنے کلام میں غائبین کو حرفِ ندا سے پکارا ہے، لیکن وہ انھیں معبود نہیں تصور کرتے تھے۔ کبھی انھوں نے اس طرح نہیں کہا تھا: ''یا شیخ اجمیری کشتی پار کر میری'' غیر اللہ کو نفع نقصان کے لیے یاد کرنا سراسر گمراہی اور بہت بڑی بھول ہے۔

صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے، لیکن شرک کی وادیوں میں کھویا ہوا انسان بھٹک کر بہت دور جا پہنچتا ہے۔ وہ ناممکن الحصول چیز کے پیچھے پڑا ہے:

﴿ كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۚ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿14﴾ ﴾ [الرعد: ١٤]

''جیسے کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے، تاکہ پانی اس کے منہ میں آ پہنچے، جبکہ وہ اس (کے منہ) تک پہنچنے والا نہیں۔ اور کافروں کی پکار سراسر گمراہی میں ہے۔''

﴿ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۚ ﴾ جنھیں یہ مدد کے لیے پکارتے ہیں وہ تو نفع یا نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتے، لیکن یہ شرک کے ذریعے اپنا بیڑہ ضرور غرق کر لیتے ہیں۔[1]



---

[1] خطبہ بتاریخ 16 جولائی 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (26 جولائی 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چھے گروہ، جن کا فیصلہ دربارِ خداوندی میں ہوگا!

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿17﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ ۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ وَمَنْ يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُكْرِمٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۩ ﴿18﴾﴾ [الحج: ۱۷، ۱۸]

”بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی ہوئے، اور صابی (بے دین) اور نصاریٰ اور مجوسی اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، بے شک اللہ ان کے مابین یومِ قیامت فیصلہ کرے گا، یقیناً اللہ ہر شے پر شاہد ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمانوں میں اور جو کوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے لوگ (بھی۔) اور بہت سوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا ہے اور جسے اللہ ذلیل کرے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں، بے شک اللہ جو چاہے کرتا ہے۔“

ربطِ آیات:

پہلے ذکر اس طرح آ رہا تھا کہ اہلِ شرک یہ کہتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی کوئی بھی مدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو رہی، ان کی نظر تمام تر ظاہری امور کی طرف تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ اکثریت آنحضرت ﷺ کے خلاف ہے، تمام عرب و عجم دشمن ہیں۔ ظاہری شان و شوکت بھی

انھیں حاصل نہیں۔ مال و اسبابِ دنیا کی شدید کمی ہے۔ فرمانروائی اور بادشاہی بھی نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد بھی آپ ﷺ کے شاملِ حال نہیں ہے اور نہ ہوگی۔ اگر مدد ہوتی تو حالات بالکل مختلف ہوتے!

ہمیشہ دنیا پرستوں کا یہی دستور رہا ہے اور اب بھی ہے کہ ان کا تمام تر انحصار دنیاوی وسائل پر ہوتا ہے۔ مال و دولت اور اسبابِ دنیا سے ان کی نظر آگے کبھی بڑھنے نہیں پاتی، حالانکہ یہ حقیقت ہے اور تجربے سے بھی ثابت ہے کہ حق کے راستے میں اسبابِ دنیا کی کمی کبھی رکاوٹ نہیں بنی اور باطل کو تباہ ہونے سے مال و متاع کی بہتات کبھی نہیں بچا سکی۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا، اس کا یہ خیال غلط ہے۔ وہ اپنی طرف سے کوشش کر لے کہ رسول کی مدد نہ ہو، اللہ تعالیٰ ضرور مدد کرے گا۔

چھے گروہ:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز دوٹوک فیصلہ کیا جائے گا اور اختلاف کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اس آیت میں چھے گروہوں کا ذکر کیا ہے:

① ﴿اٰمَنُوْا﴾:

سب سے پہلے ﴿اٰمَنُوْا﴾، یعنی ان لوگوں کا ذکر ہے جو ہر زمانے میں اللہ کو مانتے رہے ہیں اور اس کے بھیجے ہوئے نبیوں اور کتابوں کو بھی مانتے ہیں، اور نہ صرف ماننے والے ہیں، بلکہ اپنی عملی زندگی میں تمام ہدایات پر عمل بھی کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیں اور جن پر انبیائے کرام علیہم السلام عمل کر کے دکھا گئے۔

② ﴿وَالَّذِيْنَ هَادُوْا﴾:

اور جو یہودی ہو گئے۔ یہ نہیں کہ یہودی تھے، بلکہ بعد میں بن گئے تھے۔ ابتداء میں یہ امتِ مسلمہ ہی میں سے تھے۔ اب یہ ایک ایسی جماعت ہے جو بالکل باغی ہے۔ اپنے ابتدائی وقت میں یہ بالکل درست تھے۔ یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسول مانتے ہیں۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت پیش کی تھی تو صورتِ حال کیا تھی؟ فرعون کے پاس ہر طرح کے دنیوی اسباب تھے: حکومت، مال و دولت اور قوتِ عددی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہی حالت

تھی جو اسلام کے ابتدائی دور میں، مالی لحاظ سے، رسول اکرم ﷺ کی تھی۔ ان کو مال و دولت، حکومت اور نہ اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن کیا فرعون کو یہ چیزیں تباہی سے بچا سکیں؟ ایسا نہیں ہوا، بلکہ جب آخری مقابلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو غرق کر کے، ایک بے دست و پا قوم کو دنیا کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا: ﴿ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٨٨]

③ ﴿ وَالصّٰبِـِٕيْنَ ﴾:

صابی کون تھے؟ اس ضمن میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے کہا ہے اس سے مراد ایسا گروہ ہے جس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ستاروں کو پوجنے والے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ لامذہب اور بے دین ہیں۔ یہ تمام مذاہب سے بیزار تھے اور مذاہب کے دل پسند امور و عقائد کو ملا کر انھوں نے ایک خود ساختہ دین بنا دیا تھا، جس میں ہر دین کی کوئی نہ کوئی چیز شامل کر لی گئی تھی۔ یہ عرب اور ایران کے سرحدی علاقے میں آباد تھے۔

ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ ایک اباحی فرقہ ہے، انھوں نے ہر قسم کی قیود سے بغاوت کر رکھی تھی اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمام پابندیوں کو غلط قرار دے دیا تھا۔[1]

④ ﴿ وَالنَّصٰرٰى ﴾:

نصاریٰ، یعنی عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کا دعویٰ کرنے والے، اپنے وقت پر یہ بھی ایک درست جماعت تھی، لیکن حضرت مسیح علیہ السلام کی غلط محبت میں انھوں نے دین کو مسخ کر کے رکھ دیا اور عقیدۂ توحید میں بگاڑ پیدا کر دیا۔ ان لوگوں کو حضرت مسیح علیہ السلام سے غلط دعوائے محبت نے راہِ راست سے بھٹکا دیا۔ انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور تثلیث کا عقیدہ گھڑ لیا۔ یہ سب کچھ دین کے ٹھیکیداروں کا کیا کرایا ہے، جنھوں نے دین کو دین نہیں، بلکہ مال و دولت کے حصول کا ذریعہ بنا لیا اور وہی کاروبار شروع کر دیا، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ اسی کے متعلق فرمایا:

﴿ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ﴾
[التوبة: ٣٤]

"بے شک اکثر علماء اور درویش لوگوں کا مال ناحق ہی کھاتے ہیں۔"

[1] تفسير ابن كثير، البقرة (ص: ٦٢)

⑤ ﴿وَالْمَجُوْسَ﴾:

آتش پرست۔ یہ لوگ پورے ایران میں آباد تھے۔ اپنے آپ کو زرتشت کے پیرو مانتے تھے۔ ان لوگوں نے خدا کو انسان پر قیاس کیا اور کہا کہ جس طرح انسان سے ایک ہی وقت میں دو متضاد کاموں کا ہونا ممکن نہیں ہے، اسی طرح خدا سے بھی ایک وقت میں دو متضاد کاموں کا ہونا ممکن نہیں۔

کسی انسان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ہی وقت میں راضی بھی ہو اور اسی وقت میں ناراض بھی ہو۔ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ کوئی آدمی خوش ہے اور کوئی غمگین تو یقیناً دو خدا ہیں: ایک خوشی کا اور ایک غمی کا، ایک روشنی کا اور ایک تاریکی کا؛ اہرمن اور یزدان۔[1]

⑥ ﴿وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا﴾:

یہ وہ مخلوق ہے جو خدا کو ماننے کے باوجود سب سے زیادہ خدا پر ہی بدگمان ہے۔ یہ خدا کو بااختیار نہیں مانتے۔ اگر یہ یقین ہو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور جب جس طرح چاہے اور جیسے چاہے کر سکتا ہے تو شرک کرنا ممکن نہیں رہتا۔

یہ لوگ خدا سے مایوس ہوتے ہیں اور تبھی دوسرے درباروں کا رخ کرتے ہیں۔ انبیائے کرام، صلحائے امت اور اولیائے کرام نے بے حد کوشش کی کہ بدگمانی خدا کے متعلق دور ہو جائے، لیکن دور نہ ہو سکی۔

یہ خدا تعالیٰ کو تو مانتے ہیں، لیکن ایک چور دروازہ رکھ لیتے ہیں کہ خدا پر کسی طرف سے دباؤ بھی ڈالا جا سکتا ہے اور کام اس طرح نکالے جا سکتے ہیں۔ مومنوں کا عقیدہ صاف ہے: ﴿لَا شَرِيْكَ لَهٗ﴾ کہ اس خدا کا کوئی بھی شریک نہیں۔

ان چھے گروہوں میں جو اختلافات ہیں ان کا فیصلہ قیامت کے روز خود خالقِ کائنات کریں گے۔

غور کا مقام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی تمام عمر صرف کر دی کہ یہ نظریاتی اختلافات ختم ہو جائیں، لیکن ختم نہ ہو سکے۔ رسول اللہ ﷺ کو جیسی فصاحت اور بلاغت حاصل تھی، جو مقامِ تقدس اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا کر رکھا تھا، آپ ﷺ میں جو بھرپور اخلاص موجود تھا اور جو اخلاقی رفعت

[1] التحریر والتنویر لابن عاشور (١٧٢/١٤)

حاصل تھی، اس سب کے باوجود فرقہ پرستی کی پوری جڑ نہ کٹ سکی اور عملاً باقی رہ گئی، چنانچہ فرمایا ہے کہ تیرا رب ان سب کا فیصلہ یوم الدین کو کر دے گا۔ یہ فیصلہ حتمی اور آخری ہو گا۔ ہر ایک پر اپنے نظریات کی غلطی نمایاں ہو جائے گی اور جزا و سزا ہو گی۔

ایک آدمی قتل کرتا ہے اور مقتول کے ورثاء اس پر دعویٰ کرتے ہیں۔ معاملہ عدالت میں چلا جاتا ہے، شہادتیں ہوتی ہیں، وکلاء ہر دو فریق کو تسلی دیتے رہتے ہیں، لیکن بالآخر فیصلہ عدالت ہی کرتی ہے اور آخری فیصلہ یہ کرتی ہے کہ مجرم کو جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

اسی طرح آخرت کا فیصلہ ہے، جو اللہ تعالیٰ خود کریں گے۔ آخرت میں اگرچہ سب قسم کے گواہ ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ خود گواہ ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾

[الحج: ١٧]

ہر شے اللہ کی اطاعت گزار ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾

[الحج: ١٨]

﴿ يَسْجُدُ ﴾ کا مطلب "یُطیع" ہے، یعنی ہر چیز اللہ کے حکم کے تابع ہے۔ زمین اور آسمان کی ہر چیز اس معنی میں خدا کو سجدہ کر رہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کے لیے جو کام، جس طرح مقرر کر دیا ہے، وہ اس کے مطابق سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔

تمام مخلوق اس کے قانون (قانونِ فطرت) کی پابند ہے۔ چار و ناچار اس پر چل رہی ہے۔ خدا کا انکار کرنے والے بھی اگر چاہیں کہ اس معنی میں خدا کے قانون سے بھاگیں تو یہ ممکن نہیں۔ ہر چیز خدا کی اس طرح مطیع ہے کہ خدا کو سجدہ کر رہی ہے۔

انسانوں میں بھی کافی لوگ اپنی خوشی سے خدا کو سجدہ کرتے ہیں، لیکن ایسے بھی ہیں جو باغی اور عذاب کے حق دار ہیں، لیکن اس کے باوجود خدا کے قانون کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں کہ بعض

امور میں فرار ممکن ہی نہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو قانونِ فطرت بنا دیا ہے، اس کی اطاعت ناچار ان کو بھی کرنی پڑتی ہے۔ چاہے یہ اطاعت ان کو کوئی فائدہ نہ دے، بلکہ اور ذلیل کر دے: ﴿فَمَا لَهُ مِنْ مُّكْرِمٍ﴾ [الحج: ۱۸] ''پھر اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔''[1]



[1] خطبہ بتاریخ 16 اگست 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (30 اگست 1963ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''شرک'' ظلم عظیم ہے

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾
[الحج: ۱۸]

''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمانوں میں اور جو کوئی زمین میں ہے، اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے لوگ (بھی۔) اور بہت سوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا ہے اور جسے اللہ ذلیل کرے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں، بے شک اللہ جو چاہے کرتا ہے۔''

اختلاف کے حل کی راہ:

اس سے قبل کی آیت میں ان تمام مذاہب کا ذکر تھا جو رسول اللہ ﷺ کے وقت میں موجود تھے۔ ہر زمانے میں مختلف فرقے اور مذاہب رہے ہیں اور ہمیشہ ان میں اختلافات بھی رہے ہیں۔ اختلافات اگر تعصب اور عناد پر مبنی نہ ہوں اور ان کی وجہ سے ضد اور تصادم نہ پیدا ہو جائے اور دیانت داری باقی ہو تو ان کا حل نکل آتا ہے اور کسی نہ کسی فیصلے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے فرقوں میں سخت قسم کا تعصب، تصادم اور بد دیانتی، اختلافات کے حل کی راہ میں حائل ہیں۔ اسی لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ان کا عملی فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی کریں گے۔ اس دنیا میں ان کا فیصلہ ممکن نہیں ہے۔

دنیا میں ہر آن مختلف قسم کے نزاعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان کو حل کرنے کے لیے اگر دیانت داری سے کوشش کی جائے اور کسی تعصب کو حائل نہ ہونے دیا جائے تو کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو جاتا ہے،

لیکن اگر ایک فریق کا ارادہ ہی اختلافات ختم کرنے کا نہ ہو تو ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قیامت کے دن ان سب کا فیصلہ ہوگا۔

فرقہ پرستی اور پروری بعض دفعہ عذاب کی صورت بن جاتی ہے۔ ماحول اور مشکلات ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا حل نظر نہیں آتا، بلکہ یہ خرابی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے مختلف عذابوں سے ڈراتے ہوئے فرمایا: ﴿ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا ﴾ [الأنعام: ٦٥] ''یا وہ بطورِ عذاب تمھیں فرقوں میں بانٹ دے۔'' اور یہ عذاب سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

ہر شے اللہ کو سجدہ کرتی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝ؔ ﴾ اس دنیا میں جس قدر کائنات ہے، سورج، چاند، زمین اور آسمان اور ان کے اندر بسنے والے تمام جاندار و بے جان، سب اللہ تعالیٰ کو سجدہ کر رہے ہیں اور بہت سارے انسان بھی۔

حاضر ناظر کا عقیدہ:

یہاں دو تین امور قابلِ غور ہیں:

رسول اکرم ﷺ کو ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ فرمانا۔ یہاں رؤیت سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ ہم جس طرح حدِ نظر میں موجود اشیاء کو دیکھ سکتے ہیں اور دیکھتے ہیں، اسی طرح رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مشرکین بھی دیکھتے تھے، لیکن یہاں آنکھوں سے دیکھنے سے زیادہ ''جاننا'' اور ''سمجھنا'' مراد ہے۔ قرآن مجید خود اس بات پر شاہد ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ ﴾ [الفیل: ١]

''(اے نبی!) کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟''

جس وقت اصحابِ فیل کا واقعہ ہوا، اس وقت نبی کریم ﷺ موجود نہ تھے، بلکہ صحیح روایات کے مطابق پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ یہاں ''دیکھنا'' مراد نہیں، بلکہ ''جاننا'' مراد ہے۔ اصحابِ فیل کا واقعہ

ایک قریبی زمانے کا حادثہ تھا، ابھی اس کے نشانات بھی موجود تھے، اس لیے اس کو خوب جانتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ انھوں نے ابابیل کی رنگ بدلی ہوئی بیٹیں دیکھی ہیں۔ تو یقیناً اس سے مراد ''جاننا'' اور ''سمجھنا'' ہی تھا۔

ایک فرقے کے بعض علماء ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ سے رسولِ اکرم ﷺ کو حاضر ناظر بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، ایسا سمجھنا غلط ہے۔ رسول اکرم ﷺ (فِدَاهُ أَبِيْ وَأُمِّيْ) کو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ اس قدر اعلیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے بعد آپ ﷺ ہی کا مقام ہے، لیکن دنیا کے اندر اُن کے حاضر ناظر ہونے کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ فائدہ۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جو عقلی اور نقلی، ہر طرح سے غلط ہے۔

مخلوقات کی تعداد کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں:

آنحضرت ﷺ کو فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ زمین و آسمان اور مافیہما، اللہ تعالیٰ کو سجدہ کر رہے ہیں، کوئی آدمی اس سجدے کو دیکھ نہیں سکتا۔ یہاں ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ کا مطلب ''أَلَمْ تَعْلَمْ'' ہے، ''رؤیت'' یہ ''علم'' کے معنی میں ہے۔

تمام کائنات اللہ کے حکم کے تابع ہے۔ آسمان میں کس قدر اور کیسی کیسی مخلوق ہے؟ اس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ فضا کی مخلوق کا پتا کرنے کے لیے انسان نے انتہائی کوشش کی ہے، لیکن جو اندازہ لگایا ہے، وہ بھی انتہائی کم ہے۔ سمندر کے اندر کس قدر مخلوق ہے؟ اس کا اندازہ ایک غوطہ زن ایک حد تک کر سکتا ہے۔ زمین کے اندر اور باہر بے شمار مخلوق ہے، جو ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کو سجدہ کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ علم اور رسولِ خدا ﷺ کے حکم کے مطابق اس امر کو ہم جانتے اور مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہم نے آنکھوں سے نہیں دیکھا، لیکن اس کے باوجود ہم اسے مانتے ہیں۔

سجود کا مطلب:

﴿ يَسْجُدُ ﴾ سجدہ کر رہے ہیں۔ ''سجود'' کا مطلب کیا ہے؟ ایک سجدہ وہ ہے جو آپ نماز میں کرتے ہیں: قبلہ رخ ہو کر، ماتھے کو زمین پر رکھتے ہیں اور سارے جسم اور اعضاء کو جھکاتے ہیں۔ ایسا سجدہ تو وہی مخلوق کرے گی، جس کو ایسے اعضاء دیے گئے ہیں۔

اب یہ امر ظاہر ہے کہ زمین و آسمان کے ایسے اعضاء نہیں ہیں، اس لیے وہ اس طرح سجدہ تو

نہیں کر سکتے، تو ان کے سجود کا مقصد کیا ہے؟ ان کے سجدے کی نوعیت، حکمِ الٰہی کا اتباع ہے۔ یہاں ﴿یَسْجُدُ﴾ کا مطلب ہے: ''یُطِیْعُ وَیَنْقَادُ'' ''فرماں بردار اور مائل ہوتا ہے۔'' اس لیے سجدے کی واضح شکل اور طریقہ معین کرنا ممکن نہیں، اس کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ جو جو کام اللہ تعالیٰ نے ان کے ذمے لگایا ہوا ہے، اس کو پورا کر رہے ہیں۔ اس طرح زمین و آسمان اور ما فیہما اپنے خالق کو سجدہ کر رہے ہیں۔ مشرک یہ سب کچھ دیکھتا ہے، لیکن اس کو اس نظام میں کوئی نشان ایسا نظر نہیں آتا جو اس کو خدا تک پہنچا دے۔

شرک بے عقلی ہے:

مشرک یہ تو مانتے تھے کہ یہ سب چیزیں خدا نے بنائی ہیں، لیکن پرستش کے وقت مخلوق کو بھی سجدے کا حق دار بنا لیتے تھے۔ یہ بالکل ''بے عقلی'' ہے۔ مخلوق کا مخلوق کو سجدہ کرنا بالکل غلط ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ ایک بدوی سے گفتگو کر رہے تھے کہ دورانِ گفتگو اس نے اللہ تعالیٰ کا نام لیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: ''تو اللہ کو کس طرح پہچانتا ہے؟'' اس نے جواب دیا کہ یہاں راستے میں اونٹ کی لید پڑی ہوئی دیکھتا ہوں تو اونٹ کو دیکھے بغیر فوراً سمجھ لیتا ہوں کہ یہ یقیناً اونٹ کی ہے اور اونٹ اس راستے سے گزرا ہے۔ پاؤں کے نشان کی لمبائی سے آدمی کے قد کا اندازہ کر لیتا ہوں تو جب ساری کائنات، آسمان و زمین اور دوسری مخلوقات کو دیکھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کو پہچاننا کوئی مشکل ہے؟

ایک بدو فطرت کے مظاہر کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو جان لیتا ہے، لیکن مشرکین اور دہریوں کی عقل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

شرک کا انتشار:

حضرت آدم علیہ السلام سے کئی سو سال بعد تک ''شرک'' کا نام و نشان تک دنیا میں موجود نہ تھا، اس کے بعد جب شرک شروع ہوا تو پھر بھی اکثر لوگ شرک نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ آ گیا۔ اس وقت اکثریت مشرک ہو گئی۔ علاقوں کے علاقے شرک میں ملوث ہو گئے اور توحید کے ماننے والے قلیل تعداد میں رہ گئے تھے۔ ﴿وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ﴾ یہ وہ گروہ ہے جو دوزخ کا ایندھن ہے۔

ہر نبی سے ''شرک'' ٹکر لیتا رہا ہے۔ کبھی شکست کھائی اور پیچھے ہٹ گیا، کبھی پھر مسلط ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے مشرکین کی تباہی کی دعا کی اور زمین صاف ہو گئی اور پھر برسوں ذکرِ الٰہی سے معمور رہی، لیکن بعد میں پھر شرک شروع ہو گیا اور بت پرستی شروع ہو گئی۔

شرک کا انجام:

﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ﴾ دنیا میں کچھ ہستیاں ایسی ہیں جن کی قسمت ہی میں ذلت ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ انبیائے کرام علیہم السلام کے طریقے کی مخالفت کر کے غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں اور اس طرح ذلت کا سامان فراہم کر لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ذلت سے بچائے کہ اس کے بغیر کوئی بچانے والا نہیں ہے اور شرک سے محفوظ رکھے کہ فرمایا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨]

''بے شک اللہ (یہ گناہ) نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے۔''

ساری عمر حق کی مخالفت میں گزارنا اور شرک کو لائحہ عمل بنا لینا اور پھر بخشش کی امید رکھنا جو بو کر گندم کے پھل کی امید رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ شرک سے بچائے کہ یہ ظلمِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، کوئی اس کو پوچھنے والا نہیں ہے۔[1]



[1] خطبہ بتاریخ 23 اگست 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (6 ستمبر 1963ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منکرینِ حق قیامت کے روز

﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ ۖ فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ
مِّنْ نَّارٍ ؕ یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ ﴿19﴾ یُصْهَرُ بِهٖ مَا فِیْ بُطُوْنِهِمْ
وَالْجُلُوْدُ ﴿20﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ ﴿21﴾ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ
اُعِیْدُوْا فِیْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿22﴾﴾ [الحج: ۱۹-۲۲]

’’یہ دو جھگڑنے والے (گروہ) ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، چنانچہ جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جائیں گے، ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی انڈیلا جائے گا۔ اس سے وہ سب کچھ گل جائے گا جو ان کے پیٹوں میں ہے اور (ان کی) کھالیں بھی۔ اور ان (کو مارنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔ اور وہ جب بھی مارے غم کے اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے، اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور (کہا جائے گا:) بے شک جلانے والا عذاب چکھو!‘‘

اتفاق میں رکاوٹ:

اس سے قبل، قرآنِ عزیز نے چھے گروہوں کا ذکر کیا ہے، مسلمان، یہودی، عیسائی صابی، مجوس اور مشرک۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن کرے گا۔ یہاں دنیا میں جھگڑے کی بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا حل نکل آتا ہے اور معاملات طے ہو جاتے ہیں۔ دنیاوی امور کا تصفیہ عام طور پر ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ دینی اختلافات کا حل بھی نکل آتا ہے، لیکن بعض دفعہ ذہن ہی بدل جاتے ہیں اور دین کے نام پر شخصیتوں کے اثر اور عناد وضد سے ذہن ماؤف ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اِفہام وتفہیم بے کار ثابت ہوتی ہے اور کسی اختلاف کا طے ہونا ممکن ہی نہیں ہوتا، بلکہ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

والا معاملہ بن جاتا ہے۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ قیامت کے روز فیصلہ ہوگا، جہاں جج، مجرم اور گواہ سبھی موجود ہوں گے۔

کفر ایک ملت ہے:

اس آیت میں ان چھے گروہوں کو دو گروہ قرار دیا ہے۔ حق کے انکار کے معاملے میں سب ایک ہیں۔ سارا کفر ایک طرف اور حق اس کے دوسری طرف ہے: "اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ" "کفر سب مل کر ایک ہی گروہ ہے۔"

تمام مذاہب کے ماننے والوں نے ایک ہی کلمہ دعوتِ حق کے مقابلے میں کہا تھا:

﴿مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ﴾ [صٓ: ۷]

"ہم نے یہ بات کسی اور دین میں نہیں سنی۔"

مراد یہ ہے کہ حق کی مخالفت اور انکار میں سب برابر ہیں، اس لیے ان کو ایک گروہ قرار دیا ہے، چاہے ان کے آپس میں کتنے ہی اختلافات ہوں۔ یہ لوگ کفر کے باوجود بعض اعمالِ صالحہ کو پسند کرتے ہیں، جیسے: سچ بولنا، ماں باپ کی فرماں برداری، خیرات دینا، لیکن ان اعمالِ صالحہ کو ایک دینی فرض نہیں سمجھتے، بلکہ ایک اخلاقی معاملہ سمجھتے ہیں۔ تعلیم، عقائد اور عمل کا فرق ان کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا ہے: رسول اللہ ﷺ کے متبع اور خادم ایک گروہ اور تمام دشمن ایک گروہ۔

حق کے لیے لڑائی کارِ ثواب ہے:

﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا﴾: ﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ﴾ کے بعد ﴿اخْتَصَمُوْا﴾ کہہ کر اُن سب کے اندر جو اختلافاتِ عقائد و اعمال ہیں، ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور جمع کے الفاظ سے تعبیر فرمایا: ﴿فِيْ رَبِّهِمْ﴾ کہ یہ نزاع، جو خدا تعالیٰ کے معاملے میں تمھارا ہے، کیا یہ اختلاف اور جھگڑا کوئی اچھی بات ہے؟ کیا یہ دونوں غلطی پر ہیں؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک گروہ سچائی پر ہے اور ایک غلطی پر۔ ہر جھگڑے کو غلط اور برا کہنا درست نہیں ہے۔ سچائی اور حق کے لیے جھگڑنا اچھی بات ہے۔

اسی طرح تمام اتفاق بھی ٹھیک نہیں ہوتے۔ چور اگر اپنے بد مقصد کے لیے اتفاق کر لیں تو ایسے اتفاق کو توڑا جائے گا۔ امن پسند شہری اور پولیس اس کو برداشت نہیں کریں گے۔ اب ایسے اتفاق کو

اچھا نہیں برا کہا جائے گا۔ پورا عرب متفق تھا کہ حضور اکرم ﷺ کی آواز کو دبا دینا چاہیے، لیکن اس اتفاق کو پارہ پارہ کیا، اس لیے ''خصام'' ہر لحاظ سے برا نہیں ہوتا۔ مظلوم کے لیے جھگڑنا ثواب ہے۔[1]

باری تعالیٰ میں اختلاف کی شکلیں:

باری تعالیٰ کے معاملے میں ان سب کے اختلافات کیا تھے؟ ان کے ذکر سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ ان کے اختلاف کی بے شمار صورتوں کا ذکر کیا ہے۔ بعض دو خدا کو مانتے تھے۔ بعض خدا کی بیوی اور اولاد مانتے تھے۔ بعض 360 خدا مانتے تھے۔ بعض آگ کو سجدہ کرتے تھے۔ ذات اور صفاتِ باری تعالیٰ میں بھی بے شمار اختلافات تھے، ان سب کا جھگڑا ایک خدا کو ماننے والوں سے تھا اور ہے۔ گویا ایک طرف اقرارِ حق اور دوسری طرف انکارِ حق، یعنی کفر تھا۔

کفار کا انجام:

﴿ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ﴾: اب بتایا ہے کہ کفر کرنے والوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ جو کچھ ان کے ساتھ ہونے والا ہے، اس کی ایک طرح سے منظر کشی کر دی ہے۔ ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے جائیں گے، یعنی اس طرح کاٹے جائیں گے کہ بدن پر بالکل فِٹ بیٹھیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴾ [إبراهيم: ٥٠]

''ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے، اور آگ ان کے چہروں کو ڈھانپتی ہوگی۔''

﴿ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴾ [الحج: ١٩، ٢٠]

''ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی انڈیلا جائے گا۔ اس سے وہ سب کچھ گل جائے گا جو ان کے پیٹوں میں ہے اور (ان کی) کھالیں بھی۔''

یہ پانی سر سے پیٹ تک جسم کو جلا دے گا اور پیٹ کے اندر انتڑیوں کو نکال باہر کرے گا۔ چمڑے خراب ہو جائیں گے، غم واندوہ غیر مرئی نہیں، بلکہ مرئی ہوگا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٤٣)

ہولناک عذاب:

﴿ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ﴾ [الحج: ٢٢]

''اور ان (کو مارنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔ اور وہ جب بھی مارے غم کے اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے، اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور (کہا جائے گا:) بے شک جلانے والا عذاب چکھو!''

آپ اس حال کا اندازہ کریں کہ کفار کے ساتھ کیا بیت رہی ہو گی۔ سارے جسم کو آگ لگی ہوئی ہے، گرم پانی سے سر جل رہا ہے، چمڑا کٹ کٹ کر گر رہا ہے، انتڑیاں گل سڑ کر نکل رہی ہیں، لوہے کے ہتھوڑے اور گرزیں ماری جا رہی ہیں۔ جسم کا کوئی حصہ عذاب سے محفوظ نہیں ہے، کیوں کہ ہر برا اور اچھا کام جسم اور روح کے اشتراک کے بغیر نہیں ہوتا تھا، اس لیے عذاب میں دونوں کا اشتراک لازم تھا۔ عذاب کی یہ حالت ہے کہ گھبرا کر اس سے بھاگنا چاہیں گے، لیکن یہ ممکن نہ ہو گا۔ داروغۂ جہنم کو امداد کے لیے پکاریں گے: ﴿ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ﴾ [الزخرف: ٧٧].

جواب سختی سے دیا جائے گا اور خاموش ہونے کے لیے کہا جائے گا، حتیٰ کہ کلام ہی سے روک دیا جائے گا اور ﴿ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ کا مژدہ سنایا جائے گا!

ایمان داروں کا انعام:

یہ تو ان لوگوں کی حالت کا ذکر تھا، جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی۔ اب دوسری طرف ایمانداروں کی کیا حالت ہو گی؟ اس کا ذکر ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝ ﴾ [الحج: ٢٣، ٢٤]

''یقیناً اللہ ایمان لانے والوں اور نیک اعمال کرنے والوں کو (ایسے) باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہاں انھیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے

جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔ اور انھیں پاکیزہ بات کی ہدایت دی گئی، اور قابلِ تعریف (اللہ کی) راہ دکھائی گئی۔"

یہ لوگ ایماندار ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں اور اس کی وحدانیت کے قائل ہیں۔ ذات اور صفات میں بھی اسے یکتا سمجھتے ہیں۔ مخلوقِ خدا کو خدائی کا رتبہ نہیں دیتے۔ رسول کو اپنا رہبر مانتے ہیں۔ ان کی زندگی اعمالِ صالحہ کا مجموعہ رہی ہے اور وہ برائیوں سے بچتے رہے ہیں۔

ایسے گروہ کے لیے جنت کا انعام ہے، جہاں روح کے لیے تمام آسایشیں ہوں گی۔ جسم کے لیے تمام زیبایشیں ہوں گی۔ ہر قسم کے کھانے ہوں گے اور رفاہیت کے تمام سامان ہوں گے۔ یہ سب کچھ کیوں؟ ﴿وَهُدُوٓا إِلَى ٱلطَّيِّبِ مِنَ ٱلۡقَوۡلِ وَهُدُوٓا إِلَىٰ صِرَٰطِ ٱلۡحَمِيدِ﴾ کیوں کہ انھوں نے پاکیزہ بات (کلمۂ طیبہ اور عقیدۂ صالحہ) کو قبول کیا اور انھوں نے صراطِ مستقیم کو اختیار کیا۔[1]



[1] خطبہ بتاریخ 6 ستمبر 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (20 ستمبر 1963ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بیت اللہ اور اس کی حدودِ عزت واحترام

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَۨ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَالۡبَادِ ؕ وَمَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡہُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۵﴾﴾ [الحج: ۲۵]

’’بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ اور مسجدِ حرام سے روکتے ہیں، جسے ہم نے (سب) لوگوں کے لیے بنایا ہے، اس میں مقیم اور بادیہ نشین (باہر سے آنے والے) برابر ہیں اور جو اس میں ظلم کے ساتھ کج روی کا ارادہ کرے، ہم اسے نہایت دردناک عذاب چکھائیں گے۔‘‘

ربطِ آیات:

سورت حج کے شروع سے اس مقام تک حق اور باطل کی جنگ اور آویزش کا ذکر چلا آ رہا تھا اور ہر فریق کا جو انجام ہونے والا ہے، اس کا بیان بھی ہو چکا ہے۔

اب ان آیات میں کفارِ مکہ کا ذکر ہے۔ ایسے لوگ، جو رسولِ اکرم ﷺ کی دعوت کو ماننے سے انکار کر چکے ہیں اور اب بھی اسی روش پر قائم ہیں، یعنی خود بھی ماضی و حال میں کفر ہی کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور اللہ کے راستے سے دوسروں کو روک رہے ہیں اور ماضی قریب و بعید میں بھی ان کا عمل یہی رہا ہے۔

ضد اور عناد قبولِ حق میں رکاوٹ ہے:

ضد اور عناد قبولِ حق کی راہ میں سخت رکاوٹ ثابت ہوتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ لوگ اطمینان سے زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں کہ ایک غلط آدمی اس طرح ضد اور عناد اختیار کرتا ہے

کہ لوگوں میں تفریق کرا دیتا اور زمین میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ پارٹی بازی ہو جاتی ہے۔ امن پسند آدمیوں کی اکثریت ہوتی ہے، لیکن وہ شرارت پسندوں کے خوف سے خاموش ہو جاتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ایک شخص نے سوال کیا تھا کہ آپ جن لوگوں کو ''بدعتی'' کہتے ہیں، ان کے ساتھ بھی لوگ ہیں اور آپ کے ساتھ بھی ہیں، اب کس طرح پتا چلے کہ کون حق پر ہے؟ امام صاحب رحمہ اللہ نے جواب دیا:

''جنازے کے دن ان کا اور ہمارا فرق ظاہر ہو جائے گا۔''[1]

امام احمد رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ان کے جنازے میں لاکھوں مسلمان شریک ہوئے اور جنازے سے متاثر ہو کر کئی ہزار یہودی مسلمان ہو گئے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے مخالف بھی فوت ہوئے، لیکن کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔

اللہ کی راہ سے روکنے والے:

کفارِ مکہ ایک تو خود کافر تھے، دوسرے اللہ کے راستے (اسلام) سے لوگوں کو روکتے تھے۔ اسلام سے لوگوں کو روکنے اور برگشتہ کرنے کے لیے ہر طریقہ اور حربہ ان لوگوں نے استعمال کیا۔ ابوجہل اور ابولہب نے جس طرح مخالفت کی، اسی طرح علمائے یہود نے بھی علانیہ مخالفت کی۔ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے رہے اور مسلمانوں کو ایمان سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بیت الحرام کو مسلمانوں کے لیے بند کر دیا، کوئی مسلمان وہاں جا کر نماز نہیں پڑھ سکتا تھا۔

سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

لوگوں کو کس طریقے سے روکتے اور اسلام کے قریب نہ جانے دیتے؟ اس کا اندازہ کرنے لیے آپ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے اس واقعے پر غور کریں:

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ مکے سے دور ایک گاؤں میں رہتے تھے اور بکریاں چراتے تھے۔ اسلام کی دعوت ان کے کان میں پڑی۔ تحقیقِ حال کے لیے انھوں نے اپنے بھائی کو مکے روانہ کیا۔ اس نے سرِراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، لیکن ملاقات مختصر تھی۔ ماحول اس قدر خراب تھا کہ وہ کھل کر بات

[1] تاريخ الإسلام للذهبي (۱۰۸/۱۸)

نہ کر سکے اور چند باتیں سن کر رسولِ اکرم ﷺ سے ایک طرف ہو گئے کہ مبادا مکے والے دیکھ لیں۔

انھوں نے واپسی پر ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ملاقات کے وقت بتایا، لیکن کوئی واضح بات نہ بتا سکے۔ کہا: وہ آدمی دیکھنے میں شاعر ہے نہ ساحر۔ اس کے کلام میں اثر ہے اور جادوگروں سے اوپر کے درجے کا آدمی ہے۔

لیکن اس سے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو تسلی نہ ہوئی۔ بکریاں بھائی کے حوالے کر کے خود مکے کا رخ کیا۔ مکے میں پھرتے رہے اور حرم میں کافی دنوں تک قیام کیا، لیکن کوئی آدمی رسول اللہ ﷺ کا پتا تک نہ بتاتا تھا۔

ایک روز انھوں نے دیکھا کہ چند لوگ نئی طرح سے نماز پڑھ رہے ہیں، مگر خوف و ہراس اس قدر طاری تھا کہ ان سے پوچھ نہ سکے۔ اس دوران میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی نماز پڑھتے دیکھا تو ان سے دعوائے نبوت کرنے والے کے متعلق دریافت کیا۔

اس طرح رسولِ اکرم ﷺ کی مجلس میں پہنچے اور ملاقات کے بعد مسلمان ہوئے۔ مکے والوں سے اس قدر مار کھائی کہ ساری عمر یاد رہی۔[1] اس طرح یہ لوگ اللہ کے راستے کی طرف لوگوں کو آنے سے روکتے رہے!

مسجدِ حرام سے مراد:

﴿ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ ائمۂ تفسیر نے اس کے مطلب میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ سے مراد بیت اللہ کی چار دیواری ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مکہ شہر کی آبادی کی حدود ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ''حرم'' کی حد ہے۔

مسجدِ حرام سے روکنا یہ ہے کہ ذہن میں اس مسجد کی عزت اور وقار نہ ہو۔ مکے کے اندر لڑنا منع ہے اور کسی کی بے عزتی کرنا بھی منع ہے۔ مسجد کی حد جس قدر زیادہ ہو، وہ مسجد ہی میں شمار ہو گی۔ جتنی بھی توسیع ہوتی رہے، وہ مسجد ہی شمار ہو گی۔

مسجدِ حرام میں سب برابر:

﴿ سَوَآءًۨ الْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾: ساری دنیا کے مسلمانوں کے حقوق بیت اللہ میں مساوی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٧٤)

ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مقامی آبادی کے حقوق زیادہ ہوں اور باہر سے آنے والوں کا درجہ کم ہو۔ دن اور رات کے کسی بھی حصے میں ہر آدمی نماز اور طواف کے لیے آزاد ہے، کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔

مکہ مکرمہ میں گھر کرایہ پر دینا:

کیا مکہ شہر میں بھی مقامی اور باہر سے آنے والوں کے حقوق یکساں ہیں؟ اس کے متعلق امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ مکے کے مکان کسی کی ملکیت نہیں ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حکم دے رکھا تھا کہ حج کے زمانے میں کوئی شخص اپنے گھر کا دروازہ بند نہ کرے۔[1]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جو شخص مکے کے مکانات کا کرایہ وصول کرتا ہے، وہ اپنا پیٹ آگ سے بھرتا ہے۔[2] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ مکے میں سب کے حقوق برابر ہیں۔ مکے میں رہنے والوں کو باہر والوں سے کرایہ لینے کا حق نہیں ہے۔

بہر حال اکثر تابعین اور ائمہ میں سے امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مکے کی زمین کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔[3] البتہ بعض نے عمارت کی حیثیت سے ان مکانوں کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے، زمین کی بیع نہیں۔ یعنی زمین کے اوپر جو ملبہ وغیرہ ہے، اس کو بیچا جاسکتا ہے، لیکن مکانات کے متعلق اہلِ مکہ کو چاہیے کہ حج کے موسم میں بقدرِ ضرورت جگہ کو روک لیں اور باقی خالی کر دیں، تاکہ حاجی بلا معاوضہ استعمال کر سکیں۔

آج کل مکے کے لوگ حاجیوں کو کاروباری نظر سے دیکھتے ہیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی فکر میں رہتے ہیں، اسی طرح بجائے رعایت کرنے کے، مکانات کے کرائے بھی زیادہ وصول کرتے ہیں۔

مساجد پر کوئی پابندی نہیں لگانی چاہیے۔ مسجد ہر آدمی کے لیے کھلی رہنی چاہیے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ

[1] سنن الدارقطني (٣٠١٦)

[2] مصنف عبد الرزاق (٩٢١٠)

[3] تبيين الحقائق (٢٩/٦)

﴿ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾ [البقرة: ١١٤]

''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے جس نے لوگوں کو اس بات سے روکا کہ اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے اور انھیں اجاڑنے کی کوشش کی، ان (روکنے والوں) کے لائق تو یہ تھا کہ ان میں ڈرتے ہوئے داخل ہوں۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔''

عقیل بن ابی طالب نے رسولِ اکرم ﷺ کی ہجرت کے بعد مکے میں ان کے مکانات کو فروخت کر دیا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی اس بیع کو توڑا نہیں تھا، بلکہ رہایش کے متعلق سوال کے جواب میں کہا تھا کہ کیا عقیل کوئی مکان چھوڑ گیا ہے کہ میں اس میں رہایش کروں؟[1]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیع کا جواز ہے۔ اس لیے جائز اور مناسب کرائے پر مکان دیا جا سکتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ بھی اسی خیال کے موید ہیں۔

مسجدِ حرام کی حرمت و تقدس:

﴿ وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾: اس سے مراد کوئی خاص فعل نہیں ہے، بلکہ ہر وہ کام جو ظلم کی تعریف میں آتا ہو اور وہ گناہ اور راستی سے ہٹا ہوا ہے۔ گناہ ہر حال میں برا ہے، لیکن ''حرم'' کے اندر اس کا ارتکاب اور بھی شدید گناہ ہے۔ مسجدِ حرام کی حرمت کے احکام خاص ہیں۔

کسی آدمی کو حق نہیں ہے کہ حرم سے باہر کیے ہوئے قتل کا بدلہ حرم میں لے۔ حرم میں پناہ لینے والوں سے تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں جنگ و جدال حرام ہے۔ بے دینی، کفر، شرک، مصنوعی قحط پیدا کرنا، گرانی کا شکار کرنا، گری پڑی چیز کا اٹھانا، پرندوں اور جانوروں کو مارنا، قدرتی درختوں کو کاٹنا؛ یہ سب ایسے کام ہیں جن کے لیے عذابِ الیم کی وعید سنائی گئی ہے۔ اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے۔ آمین[2]



---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٠٥٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣١٥١)

[2] خطبہ بتاریخ 13 ستمبر 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (4 اکتوبر 1963ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیت اللہ کی طہارت اور پاکیزگی

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۚ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿25﴾ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿26﴾﴾ [الحج: ٢٥، ٢٦]

’’بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ اور مسجدِ حرام سے روکتے ہیں، جسے ہم نے (سب) لوگوں کے لیے بنایا ہے، اس میں مقیم اور بادیہ نشین (باہر سے آنے والے) برابر ہیں اور جو اس میں ظلم کے ساتھ کج روی کا ارادہ کرے، ہم اسے نہایت دردناک عذاب چکھائیں گے۔ اور (یاد کریں) جب ہم نے ابراہیم کے لیے بیت اللہ کی جگہ مقرر کر دی (اور اسے حکم دیا) کہ تو میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کر اور طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع، سجدے کرنے والوں کے لیے میرا گھر پاک رکھ۔‘‘

ربطِ آیات:

اس سے قبل ایسے لوگوں کا ذکر ہو چکا ہے جو مسجدِ حرام سے روکتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جو عام مساجد کی بے رونقی کا سبب بنتے ہیں۔ مفسد اور ہنگامہ پسند، شرفاء سے لڑنے جھگڑنے والے، مختلف طریقوں سے مساجد کی آبادی میں حائل ہوتے ہیں، ان کے لیے بھی یہی حکم ہے: ﴿وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾

اِلحاد:

بے دینی اور دین سے بغاوت مراد ہے، یعنی سیدھی راہ سے ایک طرف ہو جانا، دین کی راہ سے ہٹ جانا۔ ''لحد'' اس قبر کو کہتے ہیں جس کی ''سامی'' ایک طرف کو بنائی گئی ہو۔ اسی طرح ''الحاد'' سے مراد دین سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کرنا ہے۔ مفسرینِ کرام نے گالی گلوچ، بد زبانی، ذخیرہ اندوزی، شرک، فساد، ایذا رسانی اور ہر وہ کام جو بیت اللہ کی رونق و آبادی اور حج کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرے، اس کو الحاد میں شمار کیا ہے۔

بیت اللہ کی تعمیر:

﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ ﴾: زمین کی پیدائش کے بعد کافی عرصے تک کرۂ ارض بے آباد رہا۔ اس کے بعد سب سے پہلے خانہ کعبہ والی زمین کو فرشتوں نے عبادت گاہ بنایا۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام یہاں اترے اور خانہ کعبہ کی تعمیر کی، جس کو بعد میں حضرت آدم علیہ السلام کے بڑے بیٹے ''شیث'' نے مکمل کیا یا دوبارہ تعمیر کیا۔ یہ عمارت طوفانِ نوح علیہ السلام تک محفوظ رہی اور طوفانِ نوح علیہ السلام میں یہ عمارت معدوم ہوگئی، اس کی بنیادیں تک دب گئیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت کے بعد جب فلسطین آئے اور وہاں سے حجاز آ کر حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ علیہما السلام کو اس مقام پر آباد کیا تو بیت اللہ کی دوبارہ تعمیر کی۔

اس وقت کے بعض آثار کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ ایک آندھی چلی تھی جس کے اثر سے بنیادیں ظاہر ہوگئیں اور ایک اثر میں یہ بھی ہے کہ ایک سانپ نکلا اور اس کے چلنے سے بنیادوں پر نشان پڑ گیا، جس کی مدد سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بنیادوں کو کھود لیا اور وہاں خانہ کعبہ تعمیر کر لیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے جس طرح چاہا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنیادوں کی نشاندہی کر دی۔

بیت اللہ کے آداب:

﴿ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾

اس میں بیت اللہ کے آداب کا تذکرہ ہے۔ حکم ہے کہ خانہ کعبہ ایک ''معبد'' ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کو معبود بنا لیا جائے اور اس کی پرستش شروع ہو جائے۔ اس شبہے کے پیشِ نظر حکم دیا: ﴿ لَا

تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا﴾ غور کا مقام تو یہ ہے کہ ''شرک'' سے بچنے کی یہ تلقین کس ہستی کو کی جا رہی ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو!

کیوں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو ساری عمر شرک سے لڑائی کی اور اسی جرم کی پاداش میں وطن سے نکالے گئے، اسی وجہ سے جلتی آگ میں گرائے گئے۔ کیا پھر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شرک کا احتمال تھا؟ ایسا نہیں ہے۔ یہاں اگرچہ مخاطب حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، لیکن متنبہ ہمیں کیا گیا ہے۔

یہ ایسا ہی ہے کہ بعض دفعہ ''سنانا'' تو برے آدمیوں کو ہوتا ہے، لیکن ایک دانا ''شرفاء'' کو مخاطب کر کے بات کرتا ہے۔ ہم سب کو حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں۔

محبت میں غلو درست نہیں:

محبت میں غلو درست نہیں۔ لوگوں نے ادب اور محبت کے غلو سے مختلف ہستیوں کو خدائی میں شریک کر لیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت تھی اور ہونی چاہیے کہ یہ ایمان کا جزو ہے:

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهِ وَ وَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ)) [1]

''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

لیکن محبت میں ایسے مبالغے سے، جو شرک تک پہنچ جائے، منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے کہ میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنانا:

((اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا ...)) [2]

''اے اللہ میری قبر کو سجدہ گاہ بننے سے بچانا۔ لوگو! تم سے پہلی امتیں ہلاک ہو گئیں (کیوں کہ) انھوں نے اپنے بزرگوں اور انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔''

بیت اللہ اور بیت المقدس کی تعمیر میں فاصلہ:

ایک حدیث میں ہے کہ ''بیت المقدس اور بیت اللہ کی تعمیر میں چالیس سال کا فاصلہ ہے۔'' [3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠)

[2] موطأ الإمام مالك (٣٩٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٦٦)

اس سے بعض لوگوں کو الجھن ہوئی ہے کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت سے متصادم ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ ﴾ [آل عمران: ٩٦]

''بے شک (اللہ کا) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔''

کیوں کہ تاریخ میں ہے کہ بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بیت المقدس کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، جس میں سیکڑوں سال کا فاصلہ ہے۔ یہ تعمیر دراصل بعد کی ہے۔ اولین تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے دونوں کعبوں (بیت اللہ اور بیت المقدس) کی کی تھی، جس میں چالیس سال کا فاصلہ تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اول بیت اللہ اور چالیس سال بعد بیت المقدس کی تعمیر کی تھی۔

بیت اللہ کی پاکیزگی کا مقصد:

﴿ وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ میرے گھر کو پاک اور صاف رکھنا، کس لیے:

1. طواف کرنے والوں کے لیے۔
2. قیام کرنے والوں کے لیے۔
3. رکوع کرنے والوں کے لیے۔
4. سجود کرنے والوں کے لیے۔

یہ سب حالتیں عبادت کی ہیں: طواف، رکوع، قیام اور سجود۔ سجدے کی حالت میں انسان خدا کے بے حد قریب ہو جاتا ہے اور سجدے میں کی گئی دعا قبولیت کے قریب ہوتی ہے۔

طہارت کی دو قسمیں:

تطہیر اور صفائی دو طرح سے ہے: ظاہری اور باطنی۔

1. حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی جس عمارت کی تعمیر کی تھی، اس کی چھت نہیں تھی، اس لیے اس کی صفائی کی خاص ضرورت تھی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کی صفائی انبیائے کرام کی سنت ہے، یہ کوئی گھٹیا کام نہیں ہے۔ دیکھیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حکم ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ [الأنعام: ۹۰]

''سوتو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔''

اس لیے ہمیں مساجد کی صفائی کی طرف خاص توجہ دینی چاہیے۔

2 ﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ۱۸] یعنی مساجد میں صرف ذکرِ الٰہی کرو، اس ذکر میں کسی دوسرے کو مت شامل کرو اور غیر اللہ کو نہ پکارو۔

''الوہیت'' کا مقام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور رسول اکرم ﷺ کا مقام رسالت ہے، ایک آقا اور دوسرا پیغمبر۔ مساجد میں غیر اللہ کی عبادت نہیں ہونی چاہیے۔

اس باطنی پاکیزگی کا مقام پہلے ہے، کیوں کہ جہاں تک بیت اللہ کی صفائی کا تعلق ہے، مشرکینِ مکہ اس معاملے میں پیچھے نہیں تھے، لیکن ان کی یہ خدمت ان کے منہ پر ماردی گئی۔

بیت اللہ اور مساجد کی پاکیزگی مسلمان پر فرض ہے اور ان کو شرک سے پاک رکھنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس فعلِ قبیح سے محفوظ رکھے اور اپنی عبادت کی توفیق بخشے۔ آمین [1]



[1] خطبہ بتاریخ 20 ستمبر 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (18 اکتوبر 1963ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حجِ بیت اللہ اور آوازِ ابراہیم علیہ السلام کے اثرات کی ہمہ گیری

﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿26﴾ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿27﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿28﴾﴾ [الحج: ٢٦۔٢٨]

”اور (یاد کریں) جب ہم نے ابراہیم کے لیے بیت اللہ کی جگہ مقرر کر دی (اور اسے حکم دیا) کہ تو میرے ساتھ کسی شَے کو شریک نہ کر اور طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع، سجدے کرنے والوں کے لیے میرا گھر پاک رکھ۔ اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیدل (چل کر) اور ہر لاغر سواری پر (سوار ہو کر) آئیں گے جو ہر دور دراز رستے سے آئیں گی۔ تا کہ وہ اپنے منافع کے لیے حاضر ہوں، اور معلوم ایام میں (ذبح کرتے وقت) ان چوپائے مویشیوں پر اللہ کا نام ذکر کریں، جو اللہ نے انھیں دیے ہیں، پھر تم (خود بھی) ان کا گوشت کھاؤ اور لاچار فاقہ کش فقیر کو کھلاؤ۔“

ربطِ آیات:

پچھلے خطبہ جمعہ میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی تعمیر اور اس کو شرک، بت پرستی اور گندگی سے پاک رکھنے کا حکم دیا۔ ظاہری اور باطنی، حسی اور معنوی، تمام نجاستوں سے محفوظ رکھنے کی تاکید کی، تا کہ طواف، رکوع، قیام اور سجود کرنے والے اس میں یکسوئی کے ساتھ عبادت کر سکیں۔

طواف:

﴿ لِلطَّآئِفِيْنَ ﴾: طواف کرنے والوں کے لیے کعبے کو پاک رکھنا۔ طواف ایک ایسی عبادت ہے جو صرف خانہ کعبہ کے لیے مخصوص ہے۔ کسی دوسری مسجد یا عمارت کا طواف کرنا گناہ ہے۔ یہاں تک کہ مسجدِ نبوی کا طواف کرنا بھی جائز نہیں، جس کی فضیلت بے حد وحساب ہے۔ مسجد قباء کو بھی یہ حق نہیں جس کے متعلق کہا ہے: ﴿ اُسِّسَ بُنْيَانُهٗ عَلَى تَقْوٰى ﴾[التوبۃ: ۱۰۹]

رسولِ اکرم ﷺ پابندی سے ہفتے میں ایک مرتبہ قباء ضرور جاتے تھے،[1] لیکن اس کے باوجود اس مسجد کا بھی طواف نہیں کیا جا سکتا۔ اب آپ خود غور کریں کہ دوسری عمارتیں اور مقابر، چاہے وہ کتنے بڑے اولیاء ہی کے کیوں نہ ہوں، ان کا طواف کیسے روا ہوسکتا ہے؟

عبادت کی باقی تین صورتیں عام ہیں، جو ہر مسجد میں جائز ہیں: قیام، رکوع، اور سجود، بلکہ رہائشی جگہوں پر نفل نماز ادا کرنا بہتر ہے۔ حدیث میں ہے کہ گھروں کو قبرستان نہ بنا دینا،[2] یعنی ان میں نفلی نماز پڑھنی چاہیے۔

حج کا اعلان:

﴿ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تعمیرِ کعبہ کے بعد حج کا حکم دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواباً عرض کی کہ میری آواز ساری دنیا میں کیسے پہنچ سکتی ہے، تھوڑی دور جا کر ختم ہو جائے گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ اعلان کریں، آواز کو پہنچانا ہمارا کام ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اعلان کیا اور اس اعلان کو اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا میں پہنچا دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز دریاؤں، جنگلوں اور سمندروں کو چیرتی ہوئی دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گئی۔ اسی آواز کا کرشمہ ہے کہ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں لوگ وہاں پہنچ جاتے ہیں اور کروڑوں وہاں پہنچنے کے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔

خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کی متعدد بار کوشش کی گئی، لیکن خانہ کعبہ کی رونق میں کبھی فرق نہیں پڑا۔ یہ سب اسی ﴿ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ ﴾ کے اثر کی بنا پر ہے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٨٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٨٠)

خانہ کعبہ پر حملہ اور لشکر کا انجام:

خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کی پہلی کوشش رسول اکرم ﷺ کی پیدائش کے قریبی زمانے میں ہوئی تھی۔ وہ سال ''عام الفیل'' کے نام سے مشہور ہے۔

یمن کے بادشاہ ابرہہ نے مکے پر فوج کشی کی تھی۔ ان ایام میں خانہ کعبہ کا غلاف سال میں دو مرتبہ یمن سے آتا تھا۔ ابرہہ کے زمانے میں بھی غلاف آتا رہا، لیکن اس وجہ سے ابرہہ، جس تعریف و توصیف کی توقع رکھتا تھا، وہ قریش نے نہ کی۔ اس سے اس کو خیال ہوا کہ یمن ہی میں خانہ کعبہ بنایا جائے اور غلاف مکہ روانہ کرنے کے بجائے یہیں چڑھایا جائے، چنانچہ ایک عمارت بنائی گئی اور غلاف بھی چڑھایا گیا، لیکن حج کے لیے کوئی نہ آیا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ مکے کا ایک قریشی اس عمارت میں پاخانہ کر گیا۔ یہ گویا جلتی پر تیل ڈالنا تھا۔

اس نے سوچا کہ جب تک کعبے کو زمین بوس نہ کر دیا جائے، اس سے لوگوں کی توجہ دور ہونا ممکن نہیں۔ اس ارادے سے وہ ایک لشکرِ جرار لے کر مکے پر حملہ آور ہوا، اس لشکر کے ساتھ ہاتھیوں کی بھی ایک فوج تھی۔ مکہ بالکل خالی ہو گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی حفاظت کی اور ابابیل جیسے حقیر جانوروں سے پوری فوج کو تہس نہس کرا دیا۔ سورت فیل میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔[1]

خانہ کعبہ پر شیعوں کا حملہ:

اسی طرح شیعوں کا ایک فرقہ (باطنی) نے بھی کعبے پر حملہ کیا تھا اور حجرِ اسود اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ کئی سال تک حجرِ اسود کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں میں پڑا رہا، لیکن کعبے کی رونق میں کمی نہ ہوئی اور حج بھی جاری رہا، چنانچہ وہ دوبارہ لا کر نصب کر گئے۔ یہ واقعہ 319ھ میں ہوا اور حجرِ اسود کی واپسی 339ھ میں ہوئی۔[2]

اس کے بعد فتنہ و فساد کے کئی دور آئے، لیکن خانۂ خدا ہمیشہ آباد رہا اور ﴿ اَذِّنۡ فِی النَّاسِ ﴾ کا اثر پورے طور پر قائم رہا۔

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي (١١٦/١) ط: دار الكتب، بيروت. تفسير البغوي، سورة الفيل.

[2] شفاء الغرام (٢٥٧/١)

ماضی قریب میں، جب شریف حسین مکہ اور سلطان عبدالعزیز بن سعود میں جنگ ہوئی تھی تو 1926ء میں ہندوستان کے لوگوں کا ایک طبقہ، لوگوں کو حج سے روکنے کے لیے بندرگاہوں پر کوشش کرتا رہا، لیکن لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس ﴿ اَذِّنْ فِي النَّاسِ ﴾ کا اثر دیکھیے کہ یہ طبقہ خود ہی آخری جہاز میں سوار ہو کر مکے کے لیے روانہ ہو گیا۔

بیت اللہ کی کشش:

﴿ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴾: پیدل بھی آئیں گے اور سوار بھی۔ سوار بھی ایسے جو بے سر و سامان ہوں گے۔ ان لوگوں کو سامان کی کچھ پروا نہیں ہے۔ ان اونٹنی سواروں سے موٹروں اور گاڑیوں تک اور اس کے بعد ہوائی جہاز تک لوگ آمد و رفت کے ذرائع اختیار کر کے حج کے لیے ہر سال جا رہے ہیں۔

بیت اللہ کی عمارت دنیا کی اعلیٰ ترین عمارت ہے۔ مسلمانوں کو جو قلبی تعلق بیت اللہ سے ہے، اس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ حج سے فراغت کے بعد مکہ معظّمہ سے واپسی کے موقعے پر حاجیوں کی جو کیفیت ہوتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ سے مسلمانوں کا کیا دلی لگاؤ ہے۔

حج پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہونی چاہیے اور اس راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنا درست اور جائز نہیں، بلکہ اس کے بجائے زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں۔ [1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (25 اکتوبر 1963ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قربانی اور اس کی اہمیت

﴿وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿27﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ ﴿28﴾﴾

[الحج: ۲۷، ۲۸]

”اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیدل (چل کر) اور ہر لاغر سواری پر (سوار ہو کر) آئیں گے جو ہر دور دراز رستے سے آئیں گی۔ تاکہ وہ اپنے منافع کے لیے حاضر ہوں اور معلوم ایام میں (ذبح کرتے وقت) ان چوپائے مویشیوں پر اللہ کا نام ذکر کریں، جو اللہ نے انھیں دیے ہیں، پھر تم (خود بھی) ان کا گوشت کھاؤ اور لاچار فاقہ کش فقیر کو کھلاؤ۔“

ایام فضیلت:

ان آیات میں حج کا ذکر فرمایا ہے۔ مستطیع کے لیے یہ گراں قدر نعمت ہے۔ حج کی وجہ سے ذوالحج کو بھی رمضان کی طرح بہت فضیلت حاصل ہو گئی ہے۔ ان مہینوں کی عبادت کا بہت بڑا اجر ملتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: ((شَهْرَا عِيْدٍ لَا يَنْقُصَانِ))۔[1] آپ حج کے مہینے میں روزوں کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ علی العموم عرفے کے دن کا ناغہ نہیں فرماتے تھے، اس روزے کے متعلق مروی ہے کہ اس سے دو سال کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔[2] تاہم صیامِ رمضان کی طرح یہ فرض نہیں۔

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۸۹)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۶۲)

قربانی عبادت ہے:

قربانی بھی عبادت ہے۔ عربوں کی عادت تھی آٹھویں روز اونٹوں کو پانی پلانے کے لیے گھاٹ پر لے جاتے تو اس دن کا دودھ تقسیم کر دیتے۔ رجب اور شوال میں بھی ''فرع'' اور ''عتیرہ'' جیسے ناموں سے جانوروں کو ذبح کیا جاتا تھا۔ یہ رسمیں شرک کی آمیزش سے خالی نہ تھیں۔

نبی کریم ﷺ نے قبل از نبوت اپنی چالیس سالہ زندگی میں کسی مسئلے سے تعرض نہیں فرمایا۔ بذاتِ خود آپ ﷺ طاہر، بلند اخلاق اور امین تھے۔ اس دور میں آپ ﷺ نے جو کچھ کیا، بلحاظِ محمد ﷺ کیا، نہ کہ بلحاظِ پیغمبر۔ رسالت کے بعد آپ ﷺ کی تیرہ سالہ زندگی میں جو بات فرض ہوئی، وہ صرف توحید اور نماز تھی۔ اس سے نماز کی وقعت کا پتا چلتا ہے۔ حضور ﷺ نے نماز کو کفر اور اسلام کے درمیان فارق بتایا ہے۔[1] جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ میں ہجرت فرما ہوئے تو حج، قربانی اور دیگر احکام اترنا شروع ہوئے اور سابقہ غلط باتیں اور مشرکانہ رسوم منسوخ ہونے لگیں۔

قربانی ایک دائمی سنت ہے:

آپ ﷺ نے ایک ہی حج فرمایا۔ 10 ہجری میں ''حجۃ الوداع'' آپ ﷺ کا پہلا اور آخری حج تھا۔ 9 ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارت میں مسلمانوں نے حج کیا۔ لیکن قربانی کرنا حضور ﷺ سے ہر سال ثابت ہے۔ اس کے لیے ہمیشہ اچھا جانور منتخب کرتے۔ کوئی عمرے کو جاتا تو اس کے ہاتھ بھی جانور بھیج دیتے۔ جب حج کو تشریف لے گئے تو سو اونٹ قربان کیے، تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح فرمائے۔[2] چھری چلاتے وقت آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ جاری ہوتے:

1 ﴿ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾ [الأنعام: ٧٩] ﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿162﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿163﴾ ﴾ [الأنعام: ١٦٣][3]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٢)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢١٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٧٩٥)

”بے شک میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں اسی (اللہ) کا پرستار ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ اس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھے اس (بات یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔“

2 بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ.[1]

نبی اکرم ﷺ نے مدینے میں دس سال قیام فرمایا اور ہمیشہ قربانی کی۔[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے اپنے مقام پر رہ کر قربانیاں کیں۔ تابعین نے بھی کیں۔ یہ عمل اب تک مسلسل اور متواتر چلا آ رہا ہے، اس میں کبھی کسی نے رخنہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔

ایک شبہے کا ازالہ:

اب ایک سستی شہرت کا پرستار گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ روز مرہ نت نئے شگوفے چھوڑ کر دین سے بے خبر لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لینا اس کا محبوب شیوہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ سے قربانی حج کے سوا ثابت ہی نہیں۔ کتنی بڑی جہالت ہے!

کہا جاتا ہے: قربانی اگر دینی کام ہوتا تو اس کا ذکر قرآن مجید میں ضرور ملتا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن کو ماننے کا جو ثبوت ہمارے پاس موجود ہے، وہ تواترِ امت ہی تو ہے، یہی تواتر مسئلۂ قربانی میں پایا جاتا ہے۔ اگر قربانی کے تسلسل اور تواتر سے طبیعت مکدر ہوئی جاتی ہے تو کل آپ قرآن کو بھی مشکوک ٹھہرائیں گے، کیونکہ اس میں بھی اسی قسم کا تواتر پایا جاتا ہے۔ بے جا نہ ہوگا، اگر یہ کہا جائے کہ مسئلۂ قربانی میں تواتر قرآن کے تواتر سے بھی بڑھ کر ہے، کیونکہ اس میں قول کے ساتھ عملی تواتر کا بھی اضافہ ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن فقہ کی کتاب نہیں ہے، جس میں ہر مسئلہ مذکور ہو۔ حدیثِ پیغمبر اس کی تشریح موجود ہے۔ اس پر ایمان لانا چاہیے، اسے مانے بغیر قرآن پر ایمان ناممکن ہے۔ جیسے قرآن

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٩٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٠٧) اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ راوی مدلس ہے، البتہ نبی مکرم ﷺ سے سفر و حضر میں قربانی کرنا ثابت ہے۔

میں نماز کا حکم تو ہے، لیکن اس میں ارکان ادا کرنے کی ترتیب کا کہیں ذکر نہیں، نہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رکوع و سجود اور قیام و قعدہ کا کیا طریق ہے؟

کفایت شعاری کا حیلہ:

کچھ کفایت شعار یہ بھی کہتے ہیں کہ اتنی بے تحاشا قربانیوں سے گوشت ضائع ہو جاتا ہے اور یہ اِسراف ہے۔ عام دنوں کے مقابلے میں بے شک عید کے ایام میں گوشت کی کثرت ہوتی ہے، لیکن اسے اِسراف کہنا زیادتی ہے۔ جس طرح ایک غریب کا اِسراف امیر کا بخل ہوتا ہے، اسی طرح دیگر ایام میں ذبحِ عام شروع کر دیا جائے تو ہم اسے ناجائز کہہ سکتے ہیں، لیکن اس پر قیاس کر کے سنتِ ابراہیمی کے احیا کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ ایامِ قربانی کے سوا ہم کبھی کسی کو گوشت نہیں بانٹتے ہیں۔ یہ دو چار روز محتاج بھی کھا لیں تو کسی کو کیا اعتراض ہے؟ اگر غریب کے لقمے کو ضائع ہونے کا نام دیا جاتا ہے تو پھر میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں؟!

مکہ مکرمہ میں بھی (جہاں سب سے زیادہ قربانیاں کی جاتی ہیں) گوشت ضائع نہیں ہونے دیا جاتا۔ لوگ سال بھر کے لیے سُکھا لیتے ہیں۔ بے احتیاطی کی وجہ سے ممکن ہے کہ گوشت باسی ہو جاتا ہو، لیکن یہ کشادگی اور فراخی کی علامت ہے، ایسا تو شادی بیاہ کے موقعے پر بھی ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ سنتِ ابراہیمی کو مٹانا چاہتے ہیں:

﴿ وَيَأْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ٣٢]

”اور اللہ انکار کرتا ہے، مگر یہ کہ اپنا نور پورا کرے، خواہ کافروں کو برا ہی لگے۔“

قربانی کی شرعی حیثیت:

یوں آدمی کسی وجہ سے قربانی نہ کرے تو دوسری بات ہے، کیونکہ یہ بہرحال فرض تو ہے نہیں، لیکن یہ کہنا کہ قربانی حضور ﷺ سے ثابت نہیں، یا اس سے گوشت ضائع چلا جاتا ہے، عیاری ہے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے توفیق ہوتے ہوئے قربانی نہیں کی، وہ سمجھتے تھے کہ فرض نہیں ہے۔ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اس لیے قربانی نہیں دیتے تھے کہ انھیں لوگوں کی نمائش پسند نہ تھی، کیونکہ

انھوں نے چار چار جانور ذبح کرنے شروع کر دیے تھے۔ ان کا قربانی نہ دینا قربانی کے خلاف نہیں، بلکہ نمایش کے خلاف تھا یا عدمِ فرضیت کی بنا پر تھا۔ وہ قربانی کی مسنونیت اور فضیلت کے منکر نہ تھے۔

قربانی کا جانور:

لفظ ﴿ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ میں صراحت ہے کہ قربانی کا چوپایہ جانور ہونا چاہیے۔ یہی حضور ﷺ کا عمل بھی تھا۔ مرغی یا انڈے کی قربانی، قربانی نہیں۔ جمعہ میں حاضری کے متعلق جو نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص پہلے آئے، اسے اونٹ کی قربانی کا ثواب ملتا ہے، پھر گائے، بھیڑ، مرغ اور انڈے کا علی الترتیب۔[1] اس سے مراد شریعت کی اصطلاحی قربانی نہیں، بلکہ صدقہ اور عرفاً قربانی مراد ہے۔[2]

گوشت کی تقسیم:

﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِيْرَ ﴾ صرف سوالی کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس کو غرباء کے گھروں تک پہنچانے کی کوشش کرنا چاہیے، تاکہ کوئی شخص بھوکا نہ رہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ﴾ [الحج: ٣٦]

''تو تم ان کا گوشت کھاؤ اور قناعت پسند اور سوالی (محتاج) کو بھی کھلاؤ۔''

قربانی ابراہیم علیہ السلام کی یاد اور حضور ﷺ کی وہ سنت ہے جسے آپ ﷺ نے کبھی ترک نہیں فرمایا، بلکہ فضیلت اور تاکید فرمائی ہے۔ استطاعت ہو تو اس میں سستی نہیں دکھانا چاہیے۔[3]



---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥٠)

[2] دیکھیں: نيل الأوطار (١٩٩/٥)

[3] خطبہ بتاریخ 3 مئی 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (24 مئی 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حجِ بیت اللہ اور قربانی

﴿لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ﴿28﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿29﴾﴾ [الحج: ۲۸، ۲۹]

''تاکہ وہ اپنے منافع کے لیے حاضر ہوں اور معلوم ایام میں (ذبح کرتے وقت) ان چوپائے مویشیوں پر اللہ کا نام ذکر کریں، جو اللہ نے انھیں دیے ہیں، پھر تم (خود بھی) ان کا گوشت کھاؤ اور لاچار فاقہ کش فقیر کو کھلاؤ۔ پھر چاہیے کہ وہ اپنا میل کچیل دور کریں، اور چاہیے کہ اپنی نذریں پوری کریں، اور چاہیے کہ قدیم گھر (بیت اللہ) کا طواف کریں۔''

حج کا سفر عبادت ہے:

سورت حج میں عام اعتقادی مسائل کے بیان کے بعد حج کا تذکرہ ہو رہا ہے، جیسا کہ پہلے دو خطبوں میں بیان ہو چکا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا ہے: ﴿يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ﴾ [الحج: ۲۷] اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حج کے لیے دور دراز کا سفر اور مشقت و جفاکشی اپنے اندر ایک خاص خوبی رکھتی ہے اور یہ عبادت میں داخل ہے۔

معلوم ہے کہ حج کے ارکان چار پانچ دنوں میں پورے ہو جاتے ہیں، لیکن ایک حاجی کا گھر سے روانہ ہونے سے لے کر واپسی تک کا ہر لمحہ عبادت ہے اور اجر کا مستحق، یہ سفر عبادت ہے۔

اپنی ضروریات کے لیے ہم اور بھی سفر کرتے ہیں، بعض ضرورتاً سفر ہوتے ہیں، جیسے ایک ریلوے ملازم یا ڈرائیور کرتا ہے، یہ سفر پیٹ اور کاروبار کے لیے ہوتے ہیں۔ اگر حلال ذرائع اختیار کیے

جائیں تو یہ بھی کارِ ثواب ہیں، لیکن: ﴿ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴾ حج کا سفر چونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، فرماں برداری اور ایک فرض ادا کرنے کے لیے ہوتا ہے، اس لیے یہ سراسر خیر اور عبادت ہے۔

سفرِ حج میں دنیوی کاموں کی اجازت ہے:

دوسرا پہلو سفرِ حج کا یہ ہے کہ گویا یہ سفر خالصتاً عبادت اور نیکی کا سفر ہے، لیکن اس میں دنیا کے کاموں کی ممانعت نہیں ہے۔ ﴿ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ﴾ کہہ کر اس غلط خیال کی تردید کر دی ہے کہ اس سفر میں دنیا کا کوئی کام کرنا گناہ اور ناجائز ہے۔ اس دوران میں جائز کاروبار، جس پر کسی ملک کی طرف سے کوئی قانونی پابندی نہ ہو، کیا جا سکتا ہے۔ حج کے ارکان پورے کر لینے کے بعد فارغ ایام و اوقات میں تجارت کرنا درست ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ نماز کے لیے مسجد آتے ہوئے راستے میں خرید و فروخت کی جائے۔ ﴿ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ﴾ بھی یہی تقاضا کرتا ہے۔

چھٹی صدی ہجری میں تصوف نے جو صورت اختیار کی، اس وقت کے اہلِ تصوف نے دنیا کے مال سے بالکل بے تعلقی کا اظہار اور رویہ اختیار کر لیا، یہ غلو فی الدین ہے۔ جائز ذرائع سے کمانا اور جائز طور پر خرچ کرنا چاہیے۔ دین جو تصوف سکھاتا ہے، یہ اس کی ضد نہیں، بلکہ اس کے لیے مدد و معاون ہے۔

﴿ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ﴾ سے عبادت، ذکرِ الٰہی، تجارت، خرید و فروخت، سب مراد ہے۔ تجارت جائز ہونی چاہیے، اپنے ملک کے قوانین کی پابندی کرنی چاہیے اور حج کے دوران میں سمگلنگ وغیرہ نہیں ہونی چاہیے۔

حج میں دو کام:

﴿ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ... ﴾ ایامِ مقررہ میں ذکرِ الٰہی کرنا چاہیے۔ حج میں مجموعی طور پر دو چیزیں ہیں:

① جفاکشی اور مصروفیت:

ذی الحجہ کی 8 تاریخ سے 13 تک ایک تھکا دینے والی مصروفیت اور جفاکشی ہوتی ہے۔ مسلسل سفر ہوتا ہے اور بے حد محنت ہوتی ہے۔

② ذکرِ الٰہی:

اس دوران میں ذکر اللہ برابر جاری رہتا ہے۔ نماز دل کے حضور سے پڑھنی چاہیے، صفائیِ قلب کا اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں: ﴿ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾ [العنكبوت: ٤٥]

''یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔''

ہم نماز کو رسماً اور عادتاً پڑھتے ہیں، اس لیے مذکورہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ اگر دل کے حضور اور خشوع کے ساتھ نماز پڑھیں تو یقیناً ایسا ہی ہو۔ نماز اللہ کے ذکر کے لیے پڑھنی چاہیے۔ ﴿ أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ [طٰهٰ: ١٤] نماز کی تکبیر کہتے ہی دنیا کی ہر چیز سے الگ ہو جانا چاہیے۔

رسولِ اکرم ﷺ نماز کے بعد بہت سی دعائیں پڑھا کرتے تھے اور کافی دیر تک ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ ذکرِ الٰہی سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ [الرعد: ٢٨]

''آگاہ رہو! اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔''

قربانی کا حکم:

﴿ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ أَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ ﴾ ان الفاظ میں قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ جو جانور اللہ نے تم کو دیے ہیں، ان پر اللہ کا نام لو۔ اس سے مراد اللہ کا نام لے کر ان کو ذبح کرنا ہے۔

سنتِ رسول اللہ ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم تمام مسلمانوں کے لیے عام ہے: وہ دیہاتی ہوں یا شہری، حج کے لیے گئے ہوں یا گھر میں مقیم ہوں، جانور پال رکھے ہوں یا نہ۔ رسولِ اکرم ﷺ ہجرت کے نو سال تک مسلسل مدینے میں ہر سال قربانی دیتے رہے، اس کے بعد حج کے موقعے پر سو اونٹ کی قربانی مکے میں کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر اونٹ لانے کے لیے حضرت نے یمن بھیجا۔

قربانی کے جانور:

﴿ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ ﴾ بہائم اور انعام سے مراد مویشی اور چوپائے ہیں: اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری، دنبہ۔ اس سے پرندے مراد لینا اور بٹیر، مرغی وغیرہ کی قربانی کو جائز قرار دینا درست نہیں۔

گوشت کی تقسیم:

﴿فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ﴾ عید الاضحیٰ کی نماز کے لیے رسولِ اکرم ﷺ خالی پیٹ جایا کرتے تھے اور واپسی پر قربانی کا گوشت نوش فرماتے تھے۔[1] لیکن اگر کوئی شخص اس دوران میں کچھ کھا پی لے تو ناجائز نہیں ہے۔

یہ بات عام مشہور ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کرنے چاہئیں: ایک اپنے اور اہلِ خانہ کے لیے، دوسرا رشتے داروں کے لیے اور تیسرا فقراء کے لیے۔ واضح ہو کہ شریعت میں اس کا کوئی حکم نہیں ہے، بلکہ اس طرح ہے کہ جس قدر ضرورت ہو، اپنے لیے رکھ لے اور باقی تقسیم کر دے۔

نذر کے جانوروں میں سے نذر دینے والا بالکل نہیں کھا سکتا، قربانی میں یہ پابندی نہیں ہے۔ اس کے متعلق جو الفاظ اللہ تعالیٰ نے استعمال کیے ہیں، ان پر غور کرنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے: ﴿فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ﴾ یعنی خود بھی کھاؤ اور فقراء و مساکین کو بھی کھلاؤ۔[2]



[1] مسند أحمد، رقم الحديث (٢٢٩٨٤)

[2] خطبہ بتاریخ 11 اکتوبر 1963ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (1 نومبر 1963ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کچھ بدعت کے متعلق

﴿لِيَجۡعَلَ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ فِتۡنَةً لِّلَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡقَاسِيَةِ قُلُوۡبُهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ لَفِىۡ شِقَاقٍۢ بَعِيۡدٍۙ ﴿53﴾ وَّلِيَـعۡلَمَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اَنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَيُؤۡمِنُوۡا بِهٖ فَتُخۡبِتَ لَهٗ قُلُوۡبُهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿54﴾﴾ [الحج: ۵۳،۵۴]

’’تاکہ جو (وسوسہ) شیطان نے ڈالا ہے، اللہ (اس کو) ان لوگوں کے لیے فتنہ بنا دے جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے اور ان کے دل سخت ہیں، اور بے شک ظالم تو دور کی مخالفت میں (پڑے) ہیں۔ اور تاکہ وہ لوگ جان لیں جنھیں علم دیا گیا ہے کہ بے شک یہ (قرآن) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، چنانچہ وہ اس پر ایمان لائیں، پھر ان کے دل اس (حق) کے لیے جھک جائیں، اور بے شک اللہ ایمان لانے والے لوگوں کو ضرور صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دینے والا ہے۔‘‘

شیطان کی چالیں:

انسان اپنا کام کرتے ہیں، لیکن شیطان بھی خاموش نہیں رہتا۔ وہ ان کے اثرات زائل کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ کبھی خلقِ خدا کو جرم سکھاتا ہے کہ وہ چوری، ڈکیتی اور زنا پر فخر کرنے لگتی ہے۔ کبھی شرکیہ باتوں کی تعلیم دیتا ہے اور مسلمان ایسی نامعقول حرکتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ کفارِ مکہ کو بھی نہ سوجھی ہوں گی، انھی کی طرح توحید کا درس دینے والوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور کبھی وہ لعین بدعات پیدا کر کے دین میں ایک نئے دین کا اجرا کر دیتا ہے۔

پیغمبر کی مرضی کچھ اور ہوتی ہے، لیکن شیطان پیغمبر کی مرضی کا روپ دے کر بھولے عقیدت مندوں کو اپنی مرضی کا تابع بنا لیتا ہے اور یہ سب کچھ اس خوب صورتی سے ہوتا ہے کہ لوگ اس کے جال میں

پھنس جاتے ہیں: ﴿ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ ﴾ [النمل: ٢٤] ”اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال مزین کر دیے ہیں۔“

بدعات کا غلبہ:

اب حال یہ ہو گیا کہ بدعات کو عین اسلام کہا جاتا ہے، حالانکہ خیر القرون میں ان کا سراغ تک نہیں ملتا۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین جو ہمیشہ نیکی کی تلاش میں رہے اور سنت جن کا مطمحِ نظر ہوتی، کبھی ایسے فعل نہیں کرتے تھے۔ جوں جوں زمانہ دورِ نبوت سے دور ہوتا گیا، تاریکیاں بڑھتی گئیں۔ ٹھیک جس طرح شمع سے بتدریج فاصلہ بڑھنے پر روشنی کم ہونے لگتی ہے۔

حضور علیہ السلام کی تعلیم وہ نور ہے جس کا مقابلہ نہیں۔ ہمیں اسی روشنی میں سب کچھ تلاش کرنا چاہیے، ورنہ اس روشنی سے پرے تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ نورِ نبوت سے تجاوز، نبوت کی تنقیص کو مستلزم ہے۔

ایک واقعہ:

مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں رہایش پذیر تھے۔ ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ مسجد میں کچھ لوگ حلقہ بنائے بیٹھے ہیں اور ایک آدمی کی قیادت میں، بیک آواز تسبیح وتحمید وغیرہ کر رہے ہیں۔ فرمایا: اگر کل بھی یہ ماجرا دیکھو تو مجھے بتانا۔ دوسرے دن وہی شخص آیا، آپ رضی اللہ عنہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچے اور فرمایا: ”ابھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (فِدَاهُ أَبِيْ وَأُمِّيْ) کے برتن نہیں ٹوٹے، کپڑے نہیں پھٹے، بیویاں ابھی حیات ہیں اور تم ابھی سے یہ کام کرنے لگے ہو؟ آیندہ میں یہ مجلس نہ دیکھوں۔“[1]

ہماری طرح کا کوئی ہوتا تو کہتا: جناب! کیا حرج ہے؟ ذکرِ خدا ہی تو ہے! لیکن مقامِ نبوت سمجھنے والے نے اسے حکماً بند کر دیا۔

سنت کی مخالفت پر نکیر:

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ قبل از نمازِ عید نفل پڑھ رہا ہے۔ فرمایا: ”یہ نفل تجھے جنت میں نہیں پہنچائیں گے۔“ گو وہ نماز ہی تھی، لیکن یہ ظاہری نیکی ثواب نہیں ہو جاتی، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں نہ پڑھتے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بارہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نمازِ عید ادا کی تھی، لیکن کبھی ایسا نہ دیکھا تھا۔

---

[1] سنن الدارمي (٢١٠)

دنیوی معاملات میں اباحت:

دنیوی معاملات اس سے مختلف ہیں، مثلاً: اولاً لڑائی سادہ تھی، پھر آہستہ آہستہ فنونِ حرب کو ترقی ہوئی۔ اسلامی افواج ساحلِ سمندر پر پہنچیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جرنیل سے بحری سفر کے متعلق مشورہ پوچھ بھیجا، اس نے لکھا: ”کَدُوْدٍ عَلٰی عُوْدٍ“[1] ”(یعنی اتنا خطرناک ہے) جیسے لکڑی پر کیڑا۔“ جو کسی وقت بھی نیچے گر سکتا ہے۔ پھر صورتِ حال بدلی۔ قلمرو کی حفاظت کے لیے سواحل کا تحفظ بھی ضروری ہو گیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحری بیڑہ تیار کرایا۔[2]

اسی طرح غذا، لباس اور رہن سہن ہے۔ حسبِ ضرورت ان میں تبدیلی ہوتی رہی۔ ان کے متعلق ازروئے شریعت ہمیں کسی خاص طریقے کا پابند نہیں بنایا گیا، کیوں کہ یہ کام ہی دین سے نہیں دنیا سے متعلق ہیں، ان پر قیاس کر کے دین میں جدتوں کا دروازہ نہیں کھول دینا چاہیے۔

بدعت کا نقصان:

یہ حماقت شیطانی اثر کے سبب ہوتی ہے، جس سے دو قسم کے لوگ متاثر ہوتے ہیں: مریض القلب، یعنی بدطینت لوگ اور سخت دل، جو دین میں اضافہ کرتے ہوئے نہیں شرماتے۔ گویا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت کرتے ہیں کہ آپ کے دین میں کمی ہے! لو ہم پورا کر دیں۔ حالانکہ دین مکمل ہو چکا ہے اور اب اس میں اصلاح کی گنجایش نہیں۔ دین کو محفوظ اور پختہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اس میں کوئی نئی بات نہیں جنم لے سکتی، ورنہ باقی سب اعمال بھی بیکار سمجھیے۔

پھر فرمایا: ﴿وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ﴾ بدعت کا اثر بڑا دور رس ہوتا ہے، حدیث ہے:

((مَا وَقَعَ فِيْ قَوْمٍ بِدْعَةٌ إِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ))[3]

”بدعت پیدا ہونے سے مثل اس کے سنت اٹھ جاتی ہے۔“

[1] تاريخ الإسلام للذهبي (١٠٩/٣) تاريخ الطبري (٤/ ٤٥٧_٤٥٩)

[2] تاريخ الطبري (٢٦٠/٤) عثمان بن عفان لمحمود رضا (ص: ٦٥)

[3] الشفا للقاضي عياض (٨٨/٢)

اس کی ایک مثال تو آپ اکثر دیکھا کرتے ہیں۔ اوقاتِ نماز میں مذہبی جلوس نکلا کرتے ہیں، اذانیں ہوتی ہیں اور اِلا ماشاء اللہ ہمارے بھائیوں کی نمازیں عشقِ نبوی یا یادِ حسین میں کھو جاتی ہیں!!

ہدایت کی راہ:

﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ...﴾ شیطانی شرارتوں کا اثر موحدوں پر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ کتاب وسنت کا اصل مفہوم سمجھنے کے عادی ہوتے ہیں، جو ائمۂ ہدیٰ کے زمانے تک سمجھا گیا اور اسی پر قناعت کرتے ہیں، کیونکہ "لَنْ يُّصْلِحَ آخِرُ هَذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا مَا صَلُحَ بِهِ أَوَّلُهَا"[1] اگر قرونِ مشہود لہا بخیر میں شریعت کی پابندی ضروری اور مفید تھی تو اب کیوں نہ ہو؟ اور اگر اس وقت بدعت نقصان دہ تھی تو اب کیسے مفید ہو گئی؟

جسے سنت کا ذوق نہیں وہ حبِ نبوی کا دعوے دار نہیں ہو سکتا۔ حضور ﷺ ایک کامل ترین ہستی تھے، انھیں چھوڑ کر مخدوش اور مجروح لوگوں کی اتباع سے ہماری کیا اصلاح ہو سکتی ہے؟ اہلِ حق کا یہی قصور ہے کہ وہ حق کی دعوت دیتے ہوئے اہلِ سنت کی طرف راغب کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "عَلَيْكُمْ بِالْقَدِيمِ" "پرانے طریق پر آؤ۔"[2]



[1] مسند أحمد، رقم الحديث (١٦٩٧٠)

[2] خطبہ بتاریخ 13 مارچ 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (27 مارچ 1964) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شک کی بیماری اور اس کا انجام

﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿55﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿56﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿57﴾﴾ [الحج: ۵۵-۵۷]

"اور کافر اس (قرآن) کی بابت ہمیشہ شک میں رہیں گے، حتی کہ ان پر اچانک قیامت آجائے یا ان پر نہایت بانجھ (ہر خیر سے خالی) دن کا عذاب آجائے۔ اس دن بادشاہی اللہ ہی کی ہوگی، وہ ان کے مابین فیصلہ کرے گا۔ چنانچہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، وہ نعمتوں والے باغوں میں ہوں گے۔ اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، تو وہی ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔"

حق و باطل کو آمیز کرنا شیطانی عمل ہے:

شیطان کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ انبیاء کی خواہشات میں اپنی خواہشات ملا کر تعلیمِ ربانی کو خلط ملط کر دے۔ غلط کار لوگ اس کے دامِ فریب میں آ کر خود اس فن کے استاد ہو جاتے ہیں اور حق و باطل کی آمیزش ان ہی کے دم قدم سے ہوتی ہے۔

فرمایا: ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ [آل عمران: ۷۱] "اے اہلِ کتاب! تم کیوں حق کو باطل سے خلط ملط کرتے ہو۔" کتبِ الٰہیہ سے شرک ثابت کیا جاتا ہے۔ آج بھی کئی لوگ قرآنی آیات پڑھ کر مزے سے شرک و بدعت کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ آیتوں میں کچھ اشتباہ ہوتا ہے، بلکہ وضاحتِ حق کے باوجود غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

قبولِ حق میں لوگوں کے مراتب:

غلطی کے مختلف مراتب ہیں۔ بعض فوراً مان لیتے ہیں، بس سچائی کے ظاہر ہونے کی دیر ہوتی ہے، مثلاً: ابوبکر اور خدیجہ رضی اللہ عنہا وغیرہما۔ بعض کو تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ جھگڑا بھی کرتے ہیں، لیکن جوں ہی قدرت نے موقع دیا، سنبھل گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اچانک ہمشیرہ کی زبان سے قرآن سن کر مسلمان ہوئے۔

کچھ لوگوں کا آخر تک شبہہ نہیں نکلتا۔ ہزار نصیحت کیجیے، اثر ہی نہیں۔ ﴿ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ﴾ ''اور کافر اس (قرآن) کی بابت ہمیشہ شک میں رہیں گے۔'' ہم تو خیر بے عمل اور سیاہ کار ہیں، انھیں انبیاء اور اولیاء بھی متاثر نہ کر سکے۔

معاشرے کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر فوراً علماء کو مطعون قرار دے دیا جاتا ہے کہ ان میں اثر نہیں۔ پاک بازی کا دعویٰ نہیں، بے شک جرم ثابت ہے، لیکن نہ ماننا جن کی سرشت میں داخل ہوتا ہے، وہ انبیاء سے بھی نہیں مانتے، حالانکہ وہ بندگانِ خدا ہر لحاظ سے اکمل ترین انسانی نمونہ ہوتے ہیں۔ اہلِ حق کی مساعی ہمیشہ ان کو سمجھانے پر مرکوز رہی ہیں:

((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِيْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ))[1]

''میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ حق پر غالب رہیں گے، کوئی رسوا کرنے والا انھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔''

لیکن ''اہلِ مریہ'' کا وجود بھی کبھی ختم نہ ہوا، وہ بدستور موجود رہے۔

مہلت ختم ہونے کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں:

﴿ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً ﴾ ''یہاں تک کہ اچانک ان کے پاس قیامت آئے۔'' یعنی ان کا شک قیامت ہی دور کر سکے گی۔ ﴿ اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴾ ''یا ان کے پاس یومِ عقیم کا عذاب آئے۔'' ''عقیم'' بانجھ پن کو کہتے ہیں۔ قیامت کے دن کو عقیم کہا ہے کہ اس کے بعد کوئی دن نہ ہوگا۔ ہر دن کو پہلے دن کی اولاد کہہ سکتے ہیں، جس طرح اگلا قدم پچھلے قدم سے پیدا ہوتا ہے۔ قیامت آخری دن ہوگا۔

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۲۰)

﴿السَّاعَةُ﴾ سے موت بھی مراد ہو سکتی ہے۔ مرنے کے وقت آنکھیں کھلیں تو کیا ہوا، تادمِ مرگ کفر کرتے رہے اور جب جان بہ لب ہوئے تو خدا یاد آیا، جیسے فرعون کے متعلق کہا:

﴿حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ﴾

[یونس: ۹۰،۹۱]

”حتی کہ جب اسے غرق ہونے نے پا لیا، تو پکار اُٹھا: میں ایمان لاتا ہوں کہ بے شک اس ذات کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ (اللہ نے فرمایا:) کیا اب (ایمان لاتا ہے؟) جب کہ تو پہلے نافرمان تھا اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔“

خدائی بادشاہت:

﴿اَلْمُلْكُ یَوْمَىٕذٍ لِّلّٰهِ﴾: ”اس روز صرف اللہ کی حکومت ہوگی۔“ بادشاہی یہاں بھی اسی کی ہے، تاہم اس دنیا میں کچھ انسانی نظام چلتے ہیں اور زوال پذیر ہوتے ہیں۔ تاریخ پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہاں قوموں کا قبرستان ہے۔ قوم کی عمر افراد کے مقابلے میں ذرا لمبی ہوتی ہے، لیکن ہے انتہا پذیر۔

انسانی حکومت کو اللہ کی حکومت سے وہی نسبت ہے جو انسان کی دیگر صفات کو صفاتِ الٰہیہ سے۔ جیسے رحیم، خبیر، بصیر اور سمیع بندہ بھی ہے اور خدا بھی، لیکن دونوں میں فرق ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہماری حکومتیں کمزور اور ناتمام ہوتی ہیں، عین وقتِ عروج سے زوال شروع ہوتا ہے۔ اموی حکومت اندلس، خراسان اور شام تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن ایسی قوم اس کے زوال کا سبب بن گئی جو اس وقت بظاہر کمزور نظر آتی تھی۔ اس کے برعکس خدائی حکومت کو کوئی زوال نہیں۔

﴿یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ﴾: قیامت کے دن صرف فیصلۂ الٰہی ہی ناطق ہوگا۔

ایمان اور عملِ صالح:

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾: ”پس وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے۔“ عمل کو ایمان سے متصل بیان کیا ہے کہ اسی سے اس کی تکمیل ہے۔ عمل کے لیے وقت نہ ملے تو فقط ایمان لے آنا بھی بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو جاتا ہے۔

ایک شخص نے عین جہاد کے موقعے پر حضور ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں اسلام لا کر لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں تو کیا جنتی ہوں گا؟ فرمایا: ہاں۔ بولا: اچھا یہ کھجوریں کھا لوں۔ پھر جانے اس کے جی میں کیا آیا، یکا یک دو تین کھجوریں کھا کر میدانِ جنگ میں کود پڑا، شہادت پائی اور قبل از عمل جنت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ [1] ہماری بات دوسری ہے، ہمیں عمل کے لیے وقت ملا ہے اور اس کی پرسش ہوگی۔

﴿ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾: ''نعمت کے بہشتوں میں ہوں گے۔'' یعنی اعلیٰ رہایش بھی اور اچھی معزز آسایش بھی۔

کفار کا انجام:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾: ''اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو وہی ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔'' بعض تکلیفیں روحانی طمانیت اور عزت کا باعث ہوتی ہیں، لیکن اس کے برخلاف کفار دوزخ میں ہوں گے اور ذلت بھی محسوس کریں گی، کوئی ان کی ناگفتہ بہ حالت پر ترس بھی نہ کھائے گا۔ ایک دوسرے مقام پر مومنوں کی حالت بیان فرمائی:

﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ [التحریم: ٨]

''ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑتا ہوگا۔''

منافقین کہیں گے:

﴿ انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ﴾ [الحدید: ١٣]

''تم ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمھارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں۔''

جواب ملے گا:

﴿ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ ﴾ [الحدید: ١٣]

''اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ، پھر نور تلاش کرو۔ تب ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔''

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٠١)

جیسے ایک شخص اپنی کامیابی پر خوش اور دوسرا اپنی ناکامی پر غمگین ہو تو ایک کی حالت دوسرے کے لیے مفید نہیں ہوسکتی، اسی طرح اہلِ جنت بھی کفار کے کسی کام نہ آ سکیں گے۔ منافق کہیں گے: ﴿ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۭ ﴾ ''کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟'' مومن جواب دیں گے: ﴿ بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ ﴾ [الحدید: ١٤] ''کیوں نہیں، اور لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں ڈالا اور تم انتظار کرتے رہے اور تم نے شک کیا اور (جھوٹی) آرزوؤں نے تمھیں دھوکا دیا۔''

جہنمی تنگ آ کر کہیں گے: ﴿ يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ ﴾ [الزخرف: ٧٧] ''اے مالک! تیرا رب ہمارا کام تمام ہی کر دے۔'' یعنی نجات کی سبیل نہیں تو موت ہی آ جائے۔ ایسا بھی نہ ہو سکے گا اور داروغہ کہے گا: ﴿ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴾ ''بے شک تم (یہیں) ٹھہرنے والے ہو۔''

اس رسوا کن شرمندگی کے ڈر سے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ دعا [1] کیا کرتے تھے:

''خدایا! مجھ سے پوچھ گچھ نہ کی جائے، ورنہ حشر کو اندھا اٹھا دینا، تاکہ لوگوں کے سامنے ندامت سے بچ جاؤں۔'' [2]



[1] شیخ عبدالقادر جیلانی کی یہ دعا یا اس کا مضمون، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ ہمارے لیے وہی دعائیں کافی ہیں جو قرآن و حدیث میں قیامت کے دن شرمندگی سے بچنے کے لیے بتائی گئی ہیں، مثلاً: ﴿ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰي رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ [آل عمران: ١٩٤] اور اس جیسی دوسری دعائیں۔ اس دعا کے درست نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بہت سے لوگوں کو اندھا کر کے اٹھائیں گے، مگر وہ شرمندگی سے نہ بچ سکیں گے: ﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴾ [طٰہٰ: ١٢٤] (عبدالسلام)

[2] خطبہ بتاریخ 20 مارچ 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (3 اپریل 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ہجرت

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿58﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿59﴾﴾ [الحج: ٥٨، ٥٩]

''اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، پھر وہ قتل کیے گئے یا مر گئے تو اللہ ضرور انھیں اچھا رزق دے گا اور بلاشبہ اللہ ہی سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ وہ انھیں اس مقام میں ضرور داخل کرے گا جسے وہ پسند کریں گے، اور بے شک اللہ بڑا جاننے والا، خوب بردبار ہے۔''

شیطانی آمیزش:

تعلیماتِ نبویہ میں آمیزش کئی طرح سے ہوتی ہے۔ کبھی بدعت کی شکل میں، کبھی فسق و فجور کی صورت میں، کبھی ہلکے گناہ کو خفیف سمجھ کر اس پر دلیری کرنے میں (حالانکہ جرأت و اصرار سے صغیرہ گناہ بھی کبائر میں شمار ہونے لگتے ہیں) اور کبھی امرِ مباح کو سنت یا واجب ٹھہرا لیتے ہیں۔

آزمایش کے وقت پاکباز لوگ آزمائے جاتے ہیں، لیکن دھوکے میں نہیں آتے۔ وہ ہر آن خلافِ شرع رجحانات اور میلانات کو ختم کرنے کے درپے رہتے ہیں اور اس راہ میں مصائب جھیلنے کو عین سعادت سمجھتے ہیں۔

کلمہ زبان سے کہنا آسان ہے، لیکن شرک کی پرخار وادی میں قدم رکھ کر نعرۂ حق لگانا جان جوکھوں میں ڈالنے سے کم نہیں۔ عام حالت میں سنت موجبِ اجر و ثواب ہے اور مخالفت کے جواب میں عاملِ سنت کے لیے فرمایا: ((فَلَهُ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ)) [1] ''اس کے لیے سو شہید کا ثواب ہوتا ہے۔''

[1] یہ روایت آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی حسن بن قتیبہ متروک الحدیث ہے اور اس کا شیخ ابن منذر غیر معروف ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے: مرعاۃ المفاتیح (۲۸۱/۱) اور سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة للشيخ ناصر الدين الألباني. حديث: (۳۲٦) (عبدالسلام)

تبلیغ اور سینما:

احیائے سنت کے دو طریقے ہیں: افہام وتفہیم اور اس پر کھل کر عمل کرنا۔ اور بدی کو ہٹانا ہو تو اس کی علانیہ مخالفت۔ کسی کو چڑانے کے لیے عمل نہیں کرنا چاہیے، اس طرح خلوص نہیں رہتا۔

لوگ شاکی ہیں کہ سینما بینی کا مرض عام ہے، لیکن کس کو کہیں؟ نوے فی صد اس امّ الامراض میں مبتلا ہیں ع

تنِ ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

''تمام جسم ہی زخموں سے چور ہے، کہاں کہاں مرہم رکھوں؟''

خود ہمارے مخاطبین، جو تھوڑا بہت احساسِ زیاں رکھتے ہیں، اس بارے میں ان کی پوزیشن بھی مشکوک ہے۔ اسی لیے ان فحاشیوں کے خلاف جب ہمارا ردِ عمل شدید ہونے لگتا ہے تو کچھ مصلحت اندیش اور صلح جو درمیان میں ٹپک پڑتے ہیں۔

ہجرت کی تین قسمیں:

1. بعض مسلمانوں کو شرک کی مخالفت میں توحید کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، یعنی اپنے مولد ومسکن کو چھوڑ دینا پڑتا ہے، کبھی طوعاً اور کبھی کرہاً۔
2. صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے وطن سے ہجرت کرنا پڑی۔ پہلے حبشے کی طرف اور پھر سوئے مدینہ۔

کفار نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان مکہ سے چلے جائیں۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان یہیں رہیں اور ان کے ماتحت رہیں۔ پہلے وہ حق گوئی کی پاداش میں ملنے والی سزا سے لذت وسرور پاتے رہے۔ ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روکنے سے نہ رکے۔ اسلام لاتے ہی توحید کا اعلانِ عام کیا اور متعدد دفعہ مار کھائی۔[1] آخر تنگ آ کر اور حالات سے مجبور ہو کر صحابہ کو اپنے آپ نکلنا پڑا۔

اب آسام کی سرحد پر مسلمانوں کا جبری انخلاء ہو رہا ہے، سوائے مسلمان ہونے کے بے چاروں کا کوئی قصور نہیں۔ شاید ہندوؤں کو خطرہ ہے کہ کہیں عین موقعے پر یہ پاکستان کی طرف داری نہ کر دیں:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٦١)

﴿ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ ﴾ [البروج: ٨] ''اور انھیں ان (مومنوں) کا یہی کام برا معلوم ہوا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے تھے۔''

③ بعض دفعہ دیس تو نہیں بدلتا، لیکن تبلیغ یا فتوحات کے سلسلے میں ترکِ وطن ہو جاتا ہے۔ عرب اسلامی فوجیں عراق، شام اور روم تک گئیں۔ دل میں واپسی کی نیت ہوتی، لیکن اعلائے کلمہ کا جذبہ انھیں باہر ہی مصروف رکھتا، یہاں تک کہ عزیزوں سے بچھڑے ہوئے یہ لوگ، دور افتادہ علاقوں ہی میں شہید یا فوت ہو جاتے اور کفن دفن کا انتظام بھی ساتھیوں کے ہاتھوں ہوتا۔ یہ موت گھریلو زندگی اور موت، دونوں سے بدرجہا بہتر ہے۔

فرمایا: ﴿ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ ﴾ راہِ خدا میں جان دینے والے عذابِ قبر اور حساب کتاب سے محفوظ رہتے ہیں، گو ان کی زندگی یہاں مصائب میں کٹی، لیکن عالمِ برزخ میں اللہ انھیں ناز ونعم سے رکھتا ہے اور بہترین رزق عطا فرماتا ہے۔

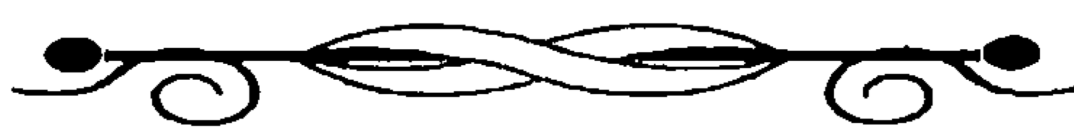
اُخروی رزق:

بعض اس سے دنیوی رزق مراد لیتے ہیں، حالانکہ طبی نقطۂ نگاہ کے علاوہ فقہی لحاظ سے بھی مرنے والے کی موجودہ زندگی اپنے تمام کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ دنیوی اناج اسی حیات سے مختص ہے، ورنہ فوت ہونے والا، خواہ شہید ہی ہو، اس کی وراثت کیونکر تقسیم ہو سکتی ہے؟

شہید کا خون:

اللہ کے ہاں شہید کا مرتبہ بہت زیادہ ہے۔ دنیا میں بھی اسے امتیازی اعزاز حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا خون بالاتفاق پاک ہے اور اسے لہو سمیت دفنانے کا حکم ہے۔[1]

ہجرت فی سبیل اللہ کرنے والا جب تک زندہ رہے، رزق سے محروم نہیں رہتا۔ فرمایا: ﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴾ یہ فقرہ تاکید کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راہِ خدا میں زندگیاں وقف کرنے والے کسمپرسی کے عالم میں نہیں ہوتے، بلکہ خود خدا ان کے اچھے رزق کا ضامن ہوتا ہے۔[2]



① سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٣٤)

② خطبہ بتاریخ 27 مارچ 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (10 اپریل 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ مومنوں کی مدد پر قادر ہے

﴿ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿60﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ ۢ بَصِيْرٌ ﴿61﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿62﴾﴾ [الحج: ٦٠۔٦٢]

''(بات) یہی ہے، اور جو شخص بدلہ لے مثل اس کے جتنی اسے تکلیف دی گئی، پھر اگر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت مغفرت والا ہے۔ یہ اس لیے کہ بے شک اللہ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور بے شک اللہ خوب سننے والا، بہت دیکھنے والا ہے۔ یہ اس لیے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے اور بلاشبہ جسے وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہی باطل ہے اور بلاشبہ اللہ ہی بلند تر، بہت بڑا ہے۔''

قرونِ اولیٰ:

مہاجرینِ مکہ نے اسلام کی خاطر وطن کو چھوڑ دیا۔ اہلِ مکہ سے ان کی ذاتی رنجش نہ تھی۔ صرف کفر کا تسلط تھا، جس سے ایمان کی حفاظت مقصود تھی۔ یہ جذبہ قلیل المیعاد ثابت نہ ہوا۔ جس عظیم مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے ہجرت کی، کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکا۔ وہ مکے کی نسبت مدینے میں کم نیک اور صالح نہیں تھے۔ وہ کلمۂ حق کی بلندی کے لیے مسلسل کوشاں رہے اور اس کے لیے جان و مال فدا کرتے رہے۔ مدینے آ کر نبی کریم ﷺ تو دس برس زندہ رہ سکے، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانثاری میں دورِ نبوت کے بعد سرِ مو فرق نہ آیا۔ ان کی کوششیں جاری ہی رہیں۔ خلافتِ راشدہ کا دور تاریخ

میں ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ تابعین بھی جنھوں نے صحابہ سے فیض حاصل کیا تھا، نہایت عمدہ انسان تھے۔ دورِ بنی امیہ کے اختتام تک ہمیں نیکی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اموی حکومت سیاسی غلطیوں سے مبرا نہ تھی۔ تاہم بحیثیت مجموعی انھوں نے دین کی خدمت کی۔ اسلامی تہذیب کو پھیلایا اور ایک دنیا کو کتاب وسنت سے متعارف کرانے کا باعث ہوئے۔

انصار کی خدمتِ دین:

اشاعتِ دین میں انصار بھی پیچھے نہ رہے تھے۔ مہاجرین اور انصار نے دوش بدوش کام کیا اور اپنی جان کو تکلیف میں ڈال کر کیا۔ وہ پیٹ پالنے کے لیے کاروبار بھی کرتے تھے، لیکن یہ شغل ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا تھا، ان کا اصل مدعا دین کی خدمت تھا اور اس کے لیے ہر لحہ تابع فرمان رہتے تھے۔ گویا وہ پیدا ہی اسی لیے ہوئے ہیں۔ وہ اس راہ میں پیش آنے والی دقتوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بے حد کٹھن مرحلے طے کیے اور عظیم تر مصیبتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔

انقلاب:

دورِ آغاز میں مسلمانوں کو مصائب میں مبتلا پا کر کافر خوش ہوتے تھے کہ اپنے ٹھاکروں کی نوازش سے مزے میں ہیں اور ان پر بتوں کا عتاب نازل ہو رہا ہے، حالانکہ شاید ان کا خیال ادھر نہیں گیا تھا کہ اب کفر کی طاقت آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہے اور ٹھاکروں کا اثر بتدریج ختم ہو رہا ہے، پھر وہی لوگ جو کبھی ذلیل ہو کر مکے سے نکلے تھے، آٹھ سال بعد گھوڑوں پر سوار فاتحانہ شان سے ام القریٰ میں داخل ہوئے اور حجۃ الوداع کے موقعے پر اسلام کی شان دیکھنے کے لائق تھی۔

استقامت:

عزت اور سربلندی حاصل ہو جانے کے بعد بھی وہ یہ نہ بھولے کہ ہمارا حقیقی سبق کیا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری میں گزرے ہوئے لمحات ہی کو حاصلِ حیات سمجھتے تھے۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو سب سے پہلے جو اعلان فرمایا، یہ دو باتیں تھیں:

1 نبی کریم ﷺ نے جسے کچھ دینے کا وعدہ کیا ہو، گواہ لے کر آئے تو میں اس کا ذمے دار ہوں۔ حالانکہ بیت المال میں اس وقت پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔

2 دوسرا اعلان اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سرکردگی میں شام کی طرف رومیوں کے مقابلے میں لشکر کی روانگی سے متعلق تھا، جسے آپ ﷺ نے تیار کیا تھا اور وفات کی وجہ سے ان کا سفر معرضِ التوا میں پڑ گیا تھا۔[1]

وفاتِ نبوی کے بعد فتنۂ ارتداد زور وشور سے پھوٹ پڑا۔ بہت سے منکرینِ زکات پیدا ہو گئے۔ مدعیانِ نبوت کو بھی پر لگ گئے اور مسلمانوں کے مرکزی مقام مدینے پر حملے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ حالات بظاہر متقاضی نہیں تھے کہ ان ایام میں لشکر باہر بھیج دیا جاتا اور وہ بھی ایک نوجوان اسامہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں جس کا باپ نبی کریم ﷺ کا غلام رہ چکا تھا، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جرأت قابلِ داد ہے۔ فرمایا:

''جو علَم حضور ﷺ نے بلند کیا تھا میں اسے کسی قیمت پر گرنے نہ دوں گا۔''[2]

چالیس روز بعد جب یہ لشکر کامیاب اور مالِ غنیمت سے لدا پھدا واپس آیا تو معترضین کو ماننا پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھول دیا ہے۔ یہ اللہ کی مدد اور اس کا وعدہ تھا جو اس آیت میں کیا گیا: ﴿ لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ﴾ [الحج: ٥٨] ''یقیناً اللہ انھیں ضرور رزق دے گا اچھا رزق۔''

خدا کا نظام:

﴿ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝60 ﴾ [الحج: ٦٠]

''یہ اور جو شخص اس کی مثل بدلہ لے جو اسے تکلیف دی گئی، پھر اگر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ ضرور ہی اس کی مدد کرے گا، یقیناً اللہ ضرور نہایت درگزر کرنے والا، بے حد بخشنے والا ہے۔''

شرارت کا بدلہ جائز ہے۔ اگر مسلمانوں کے خلاف بغاوت ہو تو ان کے لیے اللہ کی مدد واجب ہو جاتی ہے۔ یہ کسی عاجز اور بے بس کا وعدہ نہیں۔ مختارِ مطلق کا فرمان ہے۔ یعنی جس کی قدرت میں دن رات کا تصرف ہے۔ فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝61 ﴾ [الحج: ٦١]

[1] البداية والنهاية (٦/٣٣٥)

[2] تاريخ الطبري (٣/٢٢٣)

یہ نظام وہی چلا رہا ہے۔ دن کو رات اور رات کو دن بنا دینا اور ایک نپے تلے حساب کے مطابق ان میں گھنٹوں کا فرق ڈال دینا اسی کا کام ہے۔ کوئی مائی کا لال اس نظام کو نہیں بدل سکتا۔ علماء، اولیاء اور انبیاء سب عاجز ہیں۔ خدائی نظام ناقابلِ تبدیل ہے، معجزہ امرِ مستثنیٰ ہے۔ ولیوں کی طرف بعض عجیب وغریب قصے منسوب کیے جاتے ہیں، جو نرا جھوٹ کا پلندا ہوتے ہیں۔ شیعہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک شہر کی فتح کے انتظام میں دن کو کچھ دیر کے لیے روکے رکھا۔[1] معتقدین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے قرآن کی مخالفت لازم آتی ہے۔ مختارِ کل وہی ہے اور اسی بااختیار ہستی کا وعدہ ہے کہ اس کی راہ میں ترکِ وطن کرنے والوں کو کشادہ رزق عطا کرے گا، اس سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ دنیا میں جو حادثے وقوع پذیر ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں دیکھتا ہے اور جب زمین سے مومنوں کی گڑگڑاتی ہوئی دعائیں بلند ہوتی ہیں تو بارگاہِ الٰہی میں مسموع ہوتی ہیں۔ پہلی آیت دعویٰ تھی تو اس آیت میں دلیل ہے۔

معبودانِ باطلہ:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبٰطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿62﴾﴾ [الحج: ٦٢]

وہ مشرک خلوصِ دل سے اپنے دیوتاؤں کو پوجتے تھے اور یہ اگرچہ جابجا ڈھیریوں پر سر جھکاتے ہیں، لیکن اپنی حرکت کو عبادت کہنے سے انکار کرتے ہیں، یعنی توحید اور شرک دونوں میں مخلص ہوتے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی ہو، وہ ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ہے۔ اس سے حاجات طلب کرنا باطل ہے۔ ان کے خدا بھی نا جانے کیسے ہوتے ہیں، بچپن میں ناک بہتا ہے اور صاف کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہوتا، جب مشکل پڑتی ہے تو انھیں خدا ہی کا ایک دروازہ نظر آتا ہے۔

﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ [البقرۃ: ٢٥٥] اللہ کو نیند نہیں آتی۔ لیکن جب ان کے حضرت محوِ استراحت ہوتے ہیں تو زوردار خراٹوں سے اوروں کی نیند بھی حرام کر دیتے ہیں اور موت

---

[1] یہ روایت موضوع اور من گھڑت ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الموضوعات لابن الجوزي (١/٣٥٦) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٩٧١)

کے منہ میں چلے جانے کے بعد انہی کو خدا ٹھہرا لیا جاتا ہے، یعنی آج کا عاجز کل کا خدا ہوتا ہے۔ اگر مومنوں کے ایسے ہی خدا ہونے لگے تو پھر ان کے ایمان کا خدا ہی محافظ ہے۔

خدا کو دلالوں کی ضرورت نہیں ہے وہ عجز و انکسار کی صفات سے بلند تر ہے۔

ہمیں سمجھ سے کام لیتے ہوئے ہمیشہ اپنے اصلی مقاصد کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ یہی اسلام کا واجبی حق ہے۔[1]



[1] خطبہ بتاریخ 10 اپریل 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (24 اپریل 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ ہی مختارِ مطلق ہے

﴿ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصۡبِحُ الۡاَرۡضُ مُخۡضَرَّۃً ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ﴿63﴾ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ لَہُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ﴿64﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ وَالۡفُلۡکَ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِہٖ وَیُمۡسِکُ السَّمَآءَ اَنۡ تَقَعَ عَلَی الۡاَرۡضِ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿65﴾ وَہُوَ الَّذِیۡۤ اَحۡیَاکُمۡ ۫ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَکَفُوۡرٌ ﴿66﴾ ﴾ [الحج: ٦٣۔٦٦]

”کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے (مردہ زمین پر) پانی نازل کیا، پھر اس سے زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔ بے شک اللہ نہایت باریک بین، بہت باخبر ہے۔ اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، اور بلاشبہہ اللہ ہی بے نیاز، لائقِ حمد ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے تمھارے تابع فرمان کر دیا جو کچھ زمین میں ہے، اور کشتیاں جو اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہیں، اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر (نہ) گرے۔ بے شک اللہ لوگوں کے لیے البتہ بہت زیادہ شفقت کرنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔ اور وہی ہے جس نے تمھیں زندہ کیا، پھر وہ تمھیں مارے گا، پھر وہی تمھیں زندہ کرے گا، بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔“

اہلِ کفر کو عذاب ہوگا اور متقین کی اعانت ہوگی۔ سزا اور رحمت کا یہ اختیار صرف ذاتِ وحدہٗ لا شریک کو حاصل ہے، اور کسی کو اس میں دخل نہیں۔ بعض لوگوں نے یہ محکمہ خانقاہوں کے سپرد بھی کر رکھا ہے، وہ ان سے مدد کے خواہاں رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک بزرگ ہستیاں فیصلۂ الٰہی بدل دیا کرتی ہیں۔ وہ خدا کو واحد، مختار اور قوی مانتے ہیں، تاہم ان کے لیے پیروں کو بھی راضی رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ نظریہ ایسے ذہن کی پیداوار ہے جسے اللہ عزوجل پر یقینِ کامل نہیں۔

خدائی کاموں میں کس کو اختیار ہے؟

وہ ایک بات چاہے اور کوئی اسے بدل دے، ایسا نہیں ہوسکتا۔ کسی کام میں رکاوٹ کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں:

کبھی ''طاقت'' سے طاقت ٹکراتی ہے، جیسے حکومتیں آپس میں برسرِ پیکار ہوتی ہیں۔ غنیمت ہے کہ اس بارے میں مشرکین کی پوزیشن صاف ہے، وہ اپنے خداؤں کو خدا کا حریف نہیں مانتے۔

کبھی ''محبت'' ٹکراتی ہے، یعنی جوشِ محبت میں آ کر آدمی اپنا رویہ بدل لیتا ہے۔ خاوند کو بیوی پر فوقیت ہے: ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ [النساء: ٣٤] ''مرد عورتوں پر نگران ہیں۔'' لیکن اکثر اوقات مرد اپنی مرضی کے خلاف، عورت کی بات مانتا ہے، یہ محبت کی جیت ہوتی ہے۔ اولاد بھی مچل کر ماں باپ کو ہم نوا بنا لیتی ہے اور وہ ازراہِ شفقت چپ ہو رہتے ہیں۔

کبھی ''ضرورت'' متصادم ہوتی ہے۔ مالک کاریگر کو نہیں رکھنا چاہتا، پھر سوچتا ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ تو خود ہی اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

طاقت، محبت یا ضرورت، الغرض کوئی چیز بھی خدائے بے نیاز کو زیر نہیں کرسکتی۔ اس کے حق میں یہ سب کمزوری کی علامات ہیں، وہ مختارِ کل ہے۔

قدرتِ الٰہی کے چھے دلائل:

ان آیات میں یکے بعد دیگرے چھے دلائل بیان کیے ہیں، جو اس کے اختیارات کی وسعت پر دال ہیں:

1. دن رات کا نظام۔
2. ماسوائے اللہ کی دعوت کا بطلان (ان کا ذکر گذشتہ جمعہ میں ہو چکا ہے)۔
3. بارش اور اس کی برکات۔
4. زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک ہونا، کیونکہ حقوقِ ملکیت سے قانونی تصرف حاصل ہوتا ہے۔
5. انسان کے لیے تسخیرِ کائنات۔ جو کچھ ہمارے تابع ہے اور جہاں جہاں عملِ تسخیر کارفرما ہے، درحقیقت خدا ہی کی طاقت سے ہے۔ یہ خشکی پر چلنے والے جانور اور گاڑیاں، یہ سطحِ سمندر پر تیرنے والے جہاز اور کشتیاں اور یہ فضا میں پرواز کرنے والے کئی ٹن وزنی طیارے خدا ہی کے

عملِ تسخیر کا نتیجہ ہیں اور ہمیشہ اسی کے قبضے اور اختیار میں رہتے ہیں۔

وہ چاہے تو کسی وقت بھی اس تسخیر کو ختم کر سکتا ہے۔ سدھایا ہوا جانور وحشی ہو جاتا ہے، گاڑیاں کنٹرول سے باہر ہو کر حادثات سے دوچار ہو جاتی ہیں، کشتیاں ڈوب جاتی ہیں، ہوائی جہاز گر کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ کون ہے جو امرِ الٰہی میں رکاوٹ پیدا کر سکے؟ اللہ سے دعا کی جا سکتی ہے جسے وہ قبول فرماتا ہے: ﴿ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔'' لیکن وہ کسی کی خواہشوں کا پابند نہیں۔

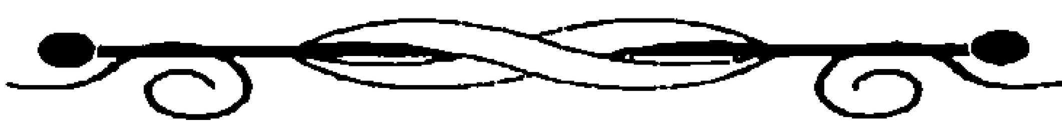
اللہ سے خلافِ منشا بات منوا لینا غلط ہے۔ ایسا مشرکین سوچ سکتے ہیں۔ وہ مرضی کا مالک ہے، چاہے شیطان کی مان لے: ﴿ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٤] ''مجھے اس دن تک مہلت دے جب یہ اٹھائے جائیں گے۔'' ﴿ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٥] فرمایا: ''بے شک تو مہلت دیے جانے والوں میں سے ہے۔'' اور چاہے تو پیغمبر کی نہ مانے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال اللہ کے دین کی خدمت کی، لیکن لختِ جگر کی سفارش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہاں کسی کی دال نہیں گلتی۔ یہ روٹھ کر منوا لینے والا قصہ بس ایسا ہی ہے۔ اس کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ کسی ستون کے بغیر اتنی بڑی جسامت والے آسمانوں کو اٹھائے ہوئے ہے اور وہ اس قدر مضبوط ہیں کہ کوئی سوراخ اور نقص ان میں نظر نہیں آتا اور جب چاہے گا تو ان کی بھی تکا بوٹی اڑ جائے گی: ﴿ اِذَا السَّمَاۗءُ انْشَقَّتْ ۝ ﴾ [الانشقاق: ١] ''جب آسمان پھٹ جائے گا۔''

6 موت و حیات کا اختیار۔ بڑے بڑے ولی ہو گزرے ہیں، جنھوں نے احکامِ الٰہی کی تعمیل کی اور چل دیے۔ انبیاء بھی موت سے ہمکنار ہو گئے، امتیں انبیاء کو زندہ رکھ سکیں نہ انبیاء امتوں کو موت کے منہ سے بچا سکے، ان کا یہی وظیفہ تھا:

((لَا نَقُوْلُ إِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا))[1]

''ہمیں زبان سے وہی کہنا ہے جس سے ہمارا مالک راضی ہو۔''[2]



[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٣)

[2] خطبہ بتاریخ 17 اپریل 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (8 مئی 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرک

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿72﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿73﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿74﴾ ﴾ [الحج: ۷۲-۷٤]

”اور جب ان پر ہماری کھلی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو آپ ان کافروں کے چہروں پر ناگواری پہچانتے ہیں، لگتا ہے کہ وہ ان لوگوں پر حملہ کر دیں گے جو ان پر ہماری آیتیں پڑھتے ہیں، کہہ دیجیے: کیا پھر میں تمھیں اس سے زیادہ بدتر کی خبر دوں؟ (وہ) آگ ہے، جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ کر رکھا ہے اور بری ہے وہ لوٹنے کی جگہ۔

”اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے، لہٰذا تم اسے غور سے سنو، بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی ہرگز نہیں پیدا کر سکتے، اگرچہ وہ (سارے بھی) اس کے لیے جمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے تو وہ اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے، طالب و مطلوب (عابد و معبود دونوں) کمزور ہیں۔ انھوں نے اللہ کی قدر (اس طرح) نہیں کی جس طرح اس کی قدر کرنے کا حق ہے، بے شک اللہ بہت قوت والا، نہایت غالب ہے۔“

مشرکین کا وتیرہ:

مشرکینِ مکہ نے دین کی ہر بات میں ملاوٹ پیدا کر دی تھی۔ ان پر قرآن کی روشن اور واضح آیات پڑھی جاتیں اور وہ تائب یا متاثر ہونے کے بجائے برا مناتے۔ بے قصور کا غصہ معقول ہے، گو غصہ کبھی کسی مرض کا علاج نہیں ہوا۔

شرک جیسی عظیم غلطی پر اصرار کرنا اور پھر بات کا برا بنانا کچھ اہلِ شرک ہی کے حصے میں آیا ہے۔ توحید کا وعظ سن کر ان کے تیور بدل جاتے، رگیں پھول جاتیں اور چہرے کی رنگت متغیر ہو جاتی اور اسی کسمساہٹ میں اہلِ حق پر جھپٹنے کی کوشش کرتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا ہمیشہ سے یہی شیوہ رہا ہے۔ آج چودہ سو سال بعد بھی اربابِ شرک کی یہ مخصوص "سیرت" نہیں بدلی۔ دلائل کا جواب نہ پا کر لڑنے بھڑنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی عبادت بھی اپنے پیشروؤں سے کافی ملتی جلتی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ﴾ [الأنفال: ۳۵]

"اور بیت اللہ کے پاس ان (مشرکین) کی نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہیں تھی۔"

اور ہمارے یہ دوست بھی موسیقی کے بہت دل دادہ واقع ہوئے ہیں، یعنی شرک ہمیشہ سے گاتا آیا ہے:

﴿ قُلْ أَفَأُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۗ اَلنَّارُ ۗ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۗ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿72﴾ ﴾ [الحج: ۷۲]

تم قرآن سن کر ابھی تک ناک بھوں چڑھا رہے ہو؟ تمھیں اس وقت پتا چلے گا جب آگ سامنے ہوگی، جو بدترین ٹھکانا ہے!

ایک مثال:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۗ ﴾ [الحج: ۷۳]

اندازِ بیان اس طرح ہے، گویا کہا جا رہا ہو: سنبھل جاؤ، بات اہم ہے، ہوش کے ناخن لو اور توجہ سے سنو!

﴿ قُلْ أَفَأُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۗ اَلنَّارُ ۗ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۗ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿72﴾ ﴾ [الحج: ۷۲]

مسئلہ سخت ہے، لیکن ہے واضح۔ لوگ غیروں کو مشکل میں کام کرنے والا سمجھتے ہیں، حالانکہ اللہ کے سوا کوئی بھی مصیبت میں کام نہیں آتا۔

توحید کے مسئلے کو الجھا دیا گیا ہے۔ یہ بے چارے لوگ قرآن اور اس کے مقصد سے آشنا نہیں۔ کچھ سمجھایا جائے تو ہم پر خفا ہوتے ہیں۔ یہ لڑائی ہم سے نہیں، بلکہ اللہ اور اس کے رسول سے ہے۔

آیت میں ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کا ذکر ہے۔ اس میں بتوں کی تخصیص نہیں، بلکہ اللہ کے سوا ہر چیز ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ہے۔ پتھر، درخت، عام انسان، انبیاء، علماء اور اولیاء، سبھی پر ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کا اطلاق ہوتا ہے۔ بلاشبہہ کسی پیغمبر نے اپنی عبادت نہیں کرائی۔ دراصل بعد میں دشمن دوست بن کر، نام کا غلط فائدہ اٹھا کر ایسی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔

عبداللہ بن سبا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا مشہور کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کر فرمایا: میں تمھیں ایسی سزا دوں گا جو کبھی کسی نے نہ دی ہوگی۔ وہ بولا: یہی تو خدا کی علامت ہے۔[1]

اہلِ شرک انبیاء کو ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے مخلوق کو خالق سے ملا دیا ہے، جیسے بھا بڑے کہا کرتے ہیں: ''آتما ترقی کر کے ماتما ہو جاتی ہے۔'' ایسے ہی انھیں بھی ''أحد'' اور ''أحمد'' میں صرف ''میم'' ہی کا فرق نظر آیا ہے۔ ﴿يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ﴾ [التوبة: ۳۰]

خدائی صفات میں کوئی شریک نہیں:

کوئی شخص درخت کو انسان کہہ دے تو اسے بتایا جائے گا کہ انسان میں یہ خوبیاں ہوتی ہیں۔ اگر اس (درخت) میں بھی یہی خوبیاں پائی جاتی ہیں تو بخوشی اسے انسان کہہ لیجیے، ورنہ نہیں۔ اس طرح کوئی شخص پیغمبر کو دائرۂ انسانیت میں رکھنے کے بجائے خدا بنا لیتا ہے تو سمجھانے کا قدرتی طریقہ یہی ہے کہ خدا میں یہ صفات ہوتی ہیں، اگر پیغمبر میں بھی موجود ہیں تو ہمیں کیا اعتراض؟

یعنی اللہ وہ ہے جو ہاتھی سے لے کر حشرات الارض تک اور شتر مرغ سے لے کر مکھی تک کا خالق ہے، جو زیادہ سے زیادہ چالیس روز تک جیتی ہے۔ فرمایا: تمھارے سارے ''حضرات'' مل کر بھی

[1] تاريخ دمشق لابن عساكر (۹/۲۹) فتح الباري لابن حجر (۱۲/۲۷۰)

ایک مکھی نہیں بنا سکتے اور اگر مکھی کچھ چھین کر لے جائے تو چھڑا نہیں سکتے۔ بڑے بڑے ''مشکل کشاؤں'' کو دیکھا ہے کہ جب مکھی ستاتی ہے تو تھپڑ مارتے ہیں، وہ اڑ جاتی ہے تو تھپڑ اپنے آپ کو لگ جاتا ہے!

﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ [الحج: ٧٤]

استادوں اور ولیوں کا کرتے ہیں ادب
لیکن خدا کا ادب بھول گئے سب!

سب قوتیں اسی کے پاس ہیں، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

معبودانِ باطلہ کی بے بسی:

اس آیت میں ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کی عاجزی، بے بسی اور بے وقعتی مراد ہے۔ وہ بھی تو ہیں جو مخلوق کی پوجا کر کے اللہ کو، جو حقیقتاً قابلِ پرستش ہے، (نعوذ باللہ) بے وقعت بناتے ہیں!

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا، باز پرس ہوئی تو فرمایا:

﴿فَسْـَٔـلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝63﴾ [الأنبياء: ٦٣]

''سو ان سے پوچھ لو، اگر وہ بولتے ہیں۔''

حالانکہ متکلم اور مخاطب دونوں جانتے ہیں کہ ان کا کوئی قصور نہیں۔ مقصود ان کی بے بسی کا اظہار ہے۔

فتح مکہ کے موقعے پر حضور ﷺ نے پہلا کام جو کیا، بت شکنی تھا۔ ہر اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کو توڑ دے۔

حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو الہیاج اسدی رحمہ اللہ کو قبہ شکنی کے لیے مامور فرمایا۔ بعد میں بھی توحید پسند حکام ایسا کرتے رہے، ہماری حکومت کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔[1]



[1] خطبہ بتاریخ 5 جون 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (19 جون 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انبیاء علیہم السلام خدا کے ہمسر نہیں، اطاعت گزار ہوتے ہیں

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿75﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿76﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿77﴾ ﴾

[الحج: ۷۵۔۷۷]

''اللہ فرشتوں میں سے کچھ پیغام رساں چن لیتا ہے اور لوگوں میں سے (بھی)، یقیناً اللہ بہت سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جاتے ہیں۔ اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو، اور اپنے رب کی عبادت کرو، اور بھلائی (کے کام) کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

نبوت ایک وہبی امر ہے:

نبی کا انتخاب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے امر و نہی میں کسی کو کوئی دخل نہیں، سب مل کر بھی کسی کے لیے پیغمبری کی دعا کریں تو فائدہ نہیں۔ کسی کسب و ریاضت سے اس منصب کے حصول کی کوشش لاحاصل ہے:

﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [الأنعام: ۱۲٤]

''اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس کو سونپے۔''

ایک موحد:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے چند سال پیشتر ''زید بن عمرو بن نفیل رحمہ اللہ'' نامی ایک پکے موحد ہو گزرے ہیں، جو بتوں کی مذمت اور شرک پر کڑی تنقید کرتے تھے اور غیر اللہ کے نام پر مشہور ہونے والے جانوروں کے متعلق کہا کرتے:

"هُوَ الَّذِيْ رَبَّاهَا وَأَنْتُمْ تَجْعَلُوْنَهَا أَصْنَامَكُمْ"

"انھیں خدا نے بنایا اور تم انھیں اپنا صنم بناتے ہو۔"

ان کا مشہور شعر ہے ع

تَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيْعاً

كَذٰلِكَ يَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِيْرُ [1]

"میں نے لات وعزیٰ کو ترک کر دیا ہے، سمجھ دار آدمی ایسے ہی کرتا ہے۔"

اس زمانے میں بچیوں کو ذبح یا زندہ درگور کر دینے کی بری رسم عام تھی، لیکن زید بن عمرو رحمہ اللہ انھیں لے کر پال لیتے اور جوان ہونے پر خود یا وارثوں سے کہہ کر ان کی شادیوں کا بندوبست کرتے۔[2] حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی بابت سوال کیا گیا تو فرمایا: ((يُبْعَثُ أُمَّةً وَّاحِدَةً))[3] "وہ قیامت کے دن تنہا ہی امت کی حیثیت سے اٹھائے جائیں گے۔" اس کے باوجود وہ نبی نہ ہو سکے۔

موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر مدین گئے، واپس آئے تو نبی تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے "آزر" کے ہاں پرورش پائی۔ سارا ماحول بت پرست تھا، لیکن ان کی زبان سے جو نکلا وہ یہ تھا: ﴿مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴾[الأنبياء: ٥٢] "یہ کیا صورتیں ہیں جن پر تم ڈیرے ڈالے رہتے ہو!"

پیغمبر عالم الغیب اور مختارِ کل نہیں ہوتے:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ تربیتِ انبیاء کی طرف اشارہ ہے، پیغمبر کی پوری زندگی خدا کی نگاہ میں ہوتی ہے۔ پیغمبر کا علم خدا سے ماخوذ اور خدا کا علم اس پر محیط ہے۔ وہ جو چاہے اسے بتا دے اور جو چاہے اسے راز میں رکھے۔ اللہ بے نیاز ہے اور پیغمبر کی ہستی اس کی محتاج۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مسئلہ پوچھا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کل بتانے کا وعدہ کیا، لیکن وہ کل بھی لمبا

---

[1] فيض القدير (٤١٧٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٢٨)

[3] المستدرك على الصحيحين للحاكم (٥٨٥٦)

ہو گیا۔ دشمنوں کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا کہ محمد ﷺ کا خدا اس سے روٹھ گیا ہے۔ ①

کسی پیغمبر نے کبھی مختارِ کل یا عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ آیت بھی خدا ہی کے علم پر گواہی دے رہی ہے۔ عالم الغیب ہونے کا دعویٰ اسی کو جچتا ہے۔ پیغمبر کو علم ہو جائے تو آسمانوں کی باتیں بتا دے، ورنہ گھر کا بھی پتا نہ ہو۔ وہ خود مختار نہیں ہوتا، وہ خدا کی مرضی سے بولتا ہے:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ [النجم: ٣،٤]

''اور وہ (اپنی) خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ وحی ہی تو ہے جو (اس کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔''

ہماری باتیں غیر ذمہ دارانہ بھی ہوتی ہیں، لیکن پیغمبر ہر بات میں خدا کے حکم کا پابند ہوتا ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝﴾ [الحاقة: ٤٤۔٤٦]

''اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا۔ تو یقیناً ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر البتہ ہم اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔''

یعنی ہمارا پیغمبر ہو کر ہمارے ساتھ ہی اس طرح کرے، نبوت اس نے دی، تربیت اور نگہداشت اس نے کی، پھر پیغمبر کے دل میں خدا کے ساتھ مقابلے کا خیال کیوں کر جنم لے سکتا ہے؟

تمام پیغمبر خدا کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ﴾ [آل عمران: ٧٩]

''کسی شخص کو لائق نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکمت اور نبوت عطا کرے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ (وہ کہے گا:) تم رب والے بن جاؤ۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے ہزار برس کے قریب اللہ کی بندگی کی، بیٹے کے بارے میں سفارش کی، نامنظور ہوئی تو ذرا بھی ملال نہ آیا۔

عوام الناس نے انہی اطاعت گزار پیغمبروں کو خدا کے مقابل لا کھڑا کر دیا ہے کہ وہ ان کی بات کو رد نہیں کر سکتا۔ فرض کیجیے! آپ مجھے دعا کے لیے کہتے ہیں اور وہ قبول ہو جاتی ہے، اس میں

① تفسیر ابن کثیر (١٣٦/٥)

میرا کوئی کمال نہیں۔ عین ممکن ہے کہ میری دعا سے پیشتر ہی بارگاہِ ایزدی میں آپ کی درخواست پہنچ کر منظور ہو چکی ہو، لیکن ظہور اس کا اس وقت ہوا ہو۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: "اَلْفُرْقَانُ بَیْنَ أَوْلِیَاءِ الرَّحْمٰنِ وَ أَوْلِیَاءِ الشَّیْطَانِ" میں لکھا ہے کہ بعض دفعہ ایک نافرمان قابو میں آ جاتا ہے، منہ سے دعا نکلتی ہے تو قدرت کو اس پر رحم آ جاتا ہے، لیکن نوح علیہ السلام جیسے فرماں بردار پیغمبر کی نہیں مانی جاتی۔

قادرِ مطلق صرف ایک اللہ ہے:

لوگوں نے کئی ٹونے ٹوٹکے بنا رکھے ہیں اور ان پر انھیں بڑا اعتماد ہوتا ہے۔ کرتا سب کچھ اللہ ہے، لیکن ظاہر بین لوگ انہی کا اثر سمجھ لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیروں کے متعلق ''کرنی والا'' کی جو اصطلاح گھڑ رکھی ہے، وہ انتہائی غلط ہے۔ سبھی کرنی والے ہوتے ہیں مثلاً: کھانا، پینا، آنا، جانا اور وعظ کرنا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ ایک بات سے روک دے، پھر کوئی کر کے دکھائے، تب پتا چلے، ''کرنی والا'' کون ہے؟

اولاد خدا دے اور کہا یوں جائے کہ فلاں حضرت صاحب کی درگاہ سے خیر ملی ہے۔ العیاذ باللہ!

ہماری ''کرنی'' اسباب کی حد تک ہے، شادی اور اس کے لوازمات طے پاتے ہیں، لیکن اولاد کا کہیں پتا نہیں: ﴿ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ ﴾ بعض لوگ اولاد کی حرص میں چار چار شادیاں کر لیتے ہیں، لیکن محرومی پیچھا نہیں چھوڑتی، اس لیے کہ خدا کی مرضی نہیں ہوتی۔ جس نے کل علم کا احاطہ کر رکھا ہے، اسی کی ''کرنی'' چلتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں، جوان بھی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ زوجیت میں آنے سے پہلے ان میں سے کچھ بااولاد بھی رہ چکی تھیں، لیکن وفاتِ نبوی سے چند روز پیشتر جو خدائی اعلان ہوا، وہ یہ تھا:

﴿ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ ﴾ [الأحزاب: ٤٠]

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔''

سب سے بڑے ولی اور رہبر، ہم جن کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں اور روزِ قیامت جن کی شفاعت پر بے شمار لوگوں کی بخشش کا انحصار ہو گا، وہ خود اولادِ نرینہ سے محروم رہتے ہیں۔ تھوڑی

سی عقل رکھنے والے کے لیے بھی اس میں بہت سبق ہے، خدا ہمیں سمجھنے اور سوچنے کی توفیق دے۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٧٧﴾ ﴾ تم اور ''کرنیاں'' چھوڑو، یہ ''کرنی'' کرو، وہ جو تمھارے مناسبِ حال ہے، تم دھیان سے نماز پڑھو۔ خشوع اور خضوع سے اللہ کی عبادت کرو اور نیکی کو لازم پکڑو اور صدقات و خیرات کے ذریعے اپنے لیے فلاح کا سامان پیدا کرو، باقی جہاں تک دینے کا تعلق ہے، وہ خدا ہی کے قبضے اور اختیار میں رہنے دیجیے![1]



[1] خطبہ بتاریخ 19 جون 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (3 جولائی 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جہاد کی ضرورت واہمیت

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۚ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۚ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾ [الحج: ۷۸]

''اور تم اللہ کی راہ میں (اس طرح) جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تمھیں (اپنے دین کے لیے) چن لیا ہے، اور اس نے دین میں تمھارے لیے کوئی تنگی نہیں رکھی، اپنے باپ ابراہیم کے دین کی (اتباع کرو)، اسی (اللہ) نے پہلے بھی تمھارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے)۔''

جو صحیح الاعتقاد ہوگا، وہ صحیح العمل بھی ہوگا اور پھر وہ نبوت کا قدر دان بھی ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی کا اعتقاد صحیح ہو اور وہ عملی لحاظ سے صفر ہو۔

جہاد کا مفہوم:

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۚ... الآیۃ﴾: اہلِ دنیا تک سچی بات پہنچانے اور دین کی گاڑی آگے چلانے کے لیے کبھی مال، کبھی جان اور کبھی زبان کے ذریعے پوری کوشش صرف کر دینے کا نام ''جہاد'' ہے۔ یہ عمل کی انتہائی منزل ہے۔ توحید و سنت سے وابستہ اور عملِ صحیح رکھنے والا مومن اس سے دریغ نہیں کرتا۔

جہاد کے مختلف مواقع:

جہاد کے مختلف مواقع ہوتے ہیں۔ کبھی کفر کے خلاف برسرِ پیکار ہونا پڑتا ہے، جب کہ وہ اسلام اور دیانت کو دبانا چاہتا ہو۔ حضور علیہ السلام نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بھرپور کوششوں سے دلدادگانِ شرک کو

توحید کا زبردست گرویدہ بنا لیا۔

کبھی حاکم، حق کو دباتا ہے تو اس سے نمٹنا پڑتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

«أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ»[1]

''بہترین جہاد ظالم حاکم کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔''

اموی حاکم مروان نے قبل از نمازِ عید خطبہ دینا چاہا تو ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر اس کو مصلیٰ کی طرف کھینچا اور فرمایا: خیر و برکت طریقِ پیغمبری کو اپنانے میں ہے۔ لوگوں نے کہا: ''أَمَّا هَذَا فَقَدْ قَضٰى مَا عَلَيْهِ''[2] ابو سعید رضی اللہ عنہ نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

بعض دفعہ کلمہ گو بھی مجاہدین کا ہدف بن جاتے ہیں۔ ایسے کلمہ گو نماز، روزہ اور زکات کے پابند کیوں نہ ہوں، لیکن نظامِ اسلامی کی مخالفت میں ان سے دو ہاتھ ہونا ضروری ہوتا ہے۔

خوارج مرتد نہیں تھے، بلکہ انھوں نے اجتماعی نظم کی مخالفت کی تھی۔ علی رضی اللہ عنہ ان سے لڑے اور انھیں قتل کیا۔ بچ رہنے والوں سے غلاموں کا سا سلوک نہ کیا، بلکہ ان کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی۔ اس انوکھے طرز پر ایک سوال کے جواب میں فرمایا: یہ ارتداد کی نہیں، بغاوت کی سزا تھی۔[3] نفسِ اسلام کے ساتھ نظمِ اسلام کی حفاظت بھی ضروری ہے۔

بدعت کے خلاف جہاد:

اہلِ بدعت سے تو اکثر ٹھن جایا کرتی ہے۔ یہ بھی جہاد ہے۔ یہ لوگ دین میں نئی اشیاء داخل کرتے ہیں۔ جذبہ صالح ہی کیوں نہ ہو، تاہم بدعتی کا کوئی عمل قابلِ قبول نہیں ہوتا!

فجر کی اذان میں ''الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کہا جاتا ہے۔[4] جسے ''تثویب'' کہتے ہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک موذن اذان کے بعد امراء کے نام لے کر تثویب کہہ رہا ہے۔ بات معمولی تھی، لیکن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''أُخْرُجْ بِنَا مِنْ عِنْدِ هَذَا

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٠٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٩)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٩)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٠)

الْمُبْتَدِعِ"[1] "ہمیں اس بدعتی کے پاس سے لے چلو۔" اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے وہاں نماز نہ پڑھی۔ بدعت کا التزام نہیں ہونا چاہیے۔ حدیث میں ہے:

((مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ))[2]

"جو ہمارے اس دین میں نئی بات پیدا کرے، وہ رد ہوگی۔"

عاشقانِ بدعت دلیل دیا کرتے ہیں کہ پھر تو موجودہ طرز کی جوتی، عینک، حتی کہ تم خود بھی بدعت ہوئے، جبکہ یہ چیزیں زمانۂ نبوت میں ناپید تھیں۔ دراصل انھوں نے ((فِي أَمْرِنَا هَذَا)) پر غور نہیں کیا۔ ضروریاتِ زندگی میں ترقی اور بڑھاؤ ہونا چاہیے، جیسا کہ ہر شعبۂ زندگی میں ہمیں فی الحقیقت ارتقا نظر آ رہا ہے، لیکن دین میں اِحداث برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو عید کے نوافل پڑھتے دیکھ کر ٹوک دیا اور فرمایا: ان سے تجھے رضائے الٰہی نہ ملے گی۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہا عیدیں پڑھیں، کوئی نوافل نہیں تھے۔[3]

ہر شخص راہِ حق میں جہاد کرنے کا ذمے دار ہے:

بدعت کے خلاف جہاد کا میدان بڑا وسیع ہو گیا ہے، یہ جہاد ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ لوگ فرض شناسی کا ثبوت دیں تو اپنے کاروبار میں مصروف رہ کر بھی یہ فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ [آل عمران: ۱۱۰]

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔"

ہر ایک کو چاہیے کہ خود کو ذمے دار سمجھے: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْؤُلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))[4]

"تم سب نگران ہو اور تم سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔"

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٣٨)، سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٩٧)

[3] مسند البزار (١٢٩/٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٩٨، ٢٤٠٩)

دعوت کی ذمے داری:

ضرورت ہے کہ ہم سب اپنے اپنے حلقے میں تبلیغِ اسلام کیا کریں، خود بھی سدھریں اور دوسروں کو سدھاریں۔ ماؤں کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو نماز، روزے کی تلقین کریں۔ والدین اپنی اولاد کو نیک تربیت نہیں دیں گے تو اور کون دے گا؟

یہ دین اس لیے ہے کہ پھیلے، یہ کسی کا پرسنل معاملہ نہیں، بلکہ قوم کا اجتماعی مسئلہ ہے۔ فواحش و منکرات تیزی سے عام ہو رہے ہیں: شراب نوشی بڑھ رہی ہے، شاعری ناپاک ہو چکی ہے، لٹریچر گندا ہو گیا ہے، سینما بینی کا مرض عروج پر ہے اور ثقافت کے نام پر زنا کاری کا درس دیا جا رہا ہے۔ نتیجتاً طرح طرح کی آزمایشیں رونما ہو رہی ہیں۔

آئے دن ملک میں زلزلے اور طوفان آتے ہیں، ہولناک بربادیاں ہوتی ہیں اور ہم ذرا بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہمیں قدرت کے انتباہوں کی مطلق پروا نہیں رہی! کوئی اعتراض کرے تو کہتے ہیں: آپ کو کیا مطلب؟ یہ خاموش بیٹھنے کا وقت نہیں، بلکہ علماء اور عوام دونوں کو چاہیے کہ زمانے کی بڑھتی ہوئی بے حیائی کے خلاف صف آرا ہو کر موثر آواز اٹھائیں اور آنے والے مہیب سیلاب کو روک دیں۔

مسلمانوں کی پستی کا سبب:

﴿ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ ﴾: پیغمبر ”مصطفیٰ“ تھا تو امت ”مجتبیٰ“ ہے۔ یہ مقام نبیِ آخر الزمان ﷺ کی غیر مشروط اطاعت سے حاصل ہوتا ہے۔ جب تک اطاعت ہوتی رہی، امت زمین کے کناروں تک پہنچ گئی اور جب دین پرسنل مسئلہ بن گیا تو ذلت اس کا مقدر ہو گئی۔ کہنے کو چھوٹی بڑی کئی اسلامی حکومتیں قائم ہیں، لیکن سب بڑے بڑے ملکوں کے سامنے بے بسی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ سوائے ایک آدھ کے کوئی بھی تو نہیں جس نے خود کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور خدمتِ اسلام کے لیے وقف کیا ہو۔ یہ طے شدہ ہے کہ مسلمان اسلام سے ہٹ کر کہیں عزت نہیں پا سکتے۔

لوگ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئے ہیں۔ امراء وظیفہ خوار ہیں اور علماء تنخواہ دار۔ دونوں دینی ذمے داریوں کو محسوس نہیں کر رہے۔ حکام کو چاہیے کہ وہی دیوار سے کان لگا کر اپنے ملک کا اخلاقی جائزہ لیں اور کوئی عملی قدم اٹھائیں۔

بعض لوگ سب کچھ سمجھتے ہیں، لیکن کچھ کر دکھانے کی جرأت ان میں مفقود ہوتی ہے۔ وہ سنگین حالات کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمزور پاتے ہیں۔ یہ ایک بہانہ ہے، کلمہ گو کے لیے مجبوریاں کیسی؟ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے بے سروسامانی کے عالم میں ثابت کر دیا کہ انسان کچھ کرنا چاہے تو قدرت اس کی مددگار ہوتی ہے۔ ''جہاد'' کے لفظ کو سن کر گھبرانا نہیں چاہیے، بلکہ یہ تو ہماری جانی بوجھی راہ ہے:

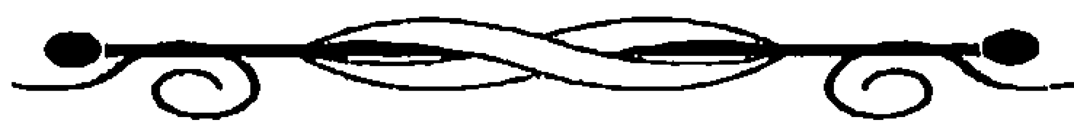
«جُعِلَ رِزْقُ أُمَّتِي تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ» [1]

''میری امت کا رزق تلواروں کے سائے میں رکھا گیا ہے۔''

دین آسان ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾: خدا نے دین کو مشکل نہیں بنایا۔ نماز، روزے کی طرح اس نے جہاد میں بھی ہماری معذوریوں کا خوب خیال رکھا ہے، لیکن مجھ جیسا چنگا بھلا اگر معذرتیں کرنے لگے تو اچھا نہیں لگتا۔

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾: دینِ حق کی سربلندی کے لیے ہمیشہ مصروفِ عمل رہیں۔ جہاد ہوتا آیا ہے اور آیندہ بھی کیا جائے گا: کفار کے خلاف، منافقین کے خلاف، ظالم حکام کے خلاف، باغیوں کے خلاف، نئی ثقافت والوں کے خلاف اور اہلِ بدعت کے خلاف۔ تب ہی یہ امتِ مسلمہ ''مجتبیٰ'' ہو سکتی ہے۔ [2]



[1] مسند أحمد، رقم الحديث (٥١١٤)

[2] خطبہ بتاریخ 26 جون 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (10 جولائی 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ملتِ اسلامیہ

﴿مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ‌ؕ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا﴾
[الحج: ۷۸]

''اپنے باپ ابراہیم کے دین کی (اتباع کرو)، اسی (اللہ) نے پہلے بھی تمھارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے)۔''

راہِ خدا میں جہاد کیجیے:

ذکر ہوا تھا جو دینِ حق کی حفاظت میں فریضۂ جہاد ادا کرتے ہیں، وہی مجتبیٰ ہوتے ہیں۔ ''جہاد'' ایک نیک کوشش ہے۔ سبھی کوشش کرتے ہیں، بری یا بھلی، بے کار کوئی نہیں بیٹھتا۔ اس دنیا میں کسی کو فرصت کہاں؟ کسی نہ کسی کام میں سب مصروف ہوتے ہیں۔ ''فرصت'' کا لفظ تو اضافی لحاظ سے بول دیا جاتا ہے۔ قرآن کا منشا ہے کہ کوشش کرنا ہی ہے تو کسی نیک کام میں کیجیے۔

اس راہ میں مجبوریاں تمھارے پاؤں نہ پکڑ لیا کریں۔ یہ دین مشکل ہرگز نہیں ہے، صرف مضبوط قوتِ ارادی کی ضرورت ہے۔ انسان عزمِ مصمم سے کسی کام کا بیڑا اٹھائے تو خدا اس کی مدد فرماتا ہے۔

ملتِ ابراہیمی کی اتباع کے تقاضے:

﴿مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ‌ؕ﴾: اہلِ مکہ کو خبردار فرمایا کہ تم ابراہیم علیہ السلام کا نام لیتے ہو اور مسلکِ حنیف کا دعویٰ کرتے ہو، اگر صدقِ دل سے ایسا کہتے ہو اور اس میں کوئی ہیرا پھیری نہیں تو محمد ﷺ کو قبول کرو۔ اصولی لحاظ سے ان کا دین بعینہٖ وہی ہے جو ابراہیم علیہ السلام لائے تھے۔ وہی نظریات اور وہی تصوراتِ حنیفیت کا دوسرا نام ہی اسلام ہے۔ نسبت اُن سے اور تعلیم بت پرستی کی! یہ

کیا تماشا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا تھا، اب انہی کے مذہب میں بت پوجے جانے لگے؟ یہ باعثِ افسوس ہے۔ بت پرستی کو چھوڑنا تمھاری قوتِ فیصلہ پر منحصر ہے، بزدلی یہاں کام نہیں دیتی۔

عزمِ مصمم کے فوائد و نتائج:

عزیمت اور ارادے کی پختگی بڑی چیز ہے، اس کے بغیر کسی قوم کی کایا نہیں پلٹتی۔ جو لوگ بزدلوں کی مانند اپنی مجبوریوں کو لے بیٹھتے ہیں، تمام عمر کچھ نہیں کر پاتے۔

حضور علیہ السلام نے جب نعرۂ توحید بلند کیا تو سارا ماحول مخالف تھا، سوائے چند ایک کے۔ اپنے، بیگانے سبھی دشمن ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی حالات سے بے خبر نہ تھے۔ ہمارے جیسا کوئی ہوتا تو کہتا: کون پہاڑ سے ٹکرائے؟ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شدید مخالفت کے احساس کو اپنے اوپر غالب نہ ہونے دیا، یہ ارادے کی بات ہے۔

آٹھ ہجری میں چند برسوں کی کوشش سے مسلمانوں کے ہاتھوں مکہ معظّمہ کی فتح ایک عجیب بات ہوئی تھی، قبائلِ عرب ششدر رہ گئے تھے۔ آس پاس کے لوگ تاڑ گئے تھے کہ اسلام کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور اہلِ اسلام کسی وقت بھی مکہ والوں کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے غیر جانبداری برتی اور کسی قسم کے معاہدے سے احتراز کیا کہ آیندہ نا جانے حالات کیسے ہوں۔

خیال تھا کہ مشرکین مکہ پر چڑھائی برداشت نہیں کریں گے اور حملے کی صورت میں کٹ مریں گے، لیکن جب گھنٹا دو گھنٹے کی معمولی پس و پیش کے بعد انھوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی تو سارا عرب حیران تھا۔ یہ ایک اعجوبہ امر تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ مسلمان بھی تھے اور صاحبِ ارادہ بھی۔ ایک صفت تو اکثر مل جاتی ہے، لیکن وہ دونوں صفات کے جامع تھے، تبھی انھوں نے اتنے عظیم کارنامے سرانجام دیے۔

مسلمان کون؟

﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾: جو خدا سے عہد کرتے ہیں، ان کا نام ''مسلمان'' ہوتا ہے۔ اللہ والوں کے اور بھی نام رہے ہیں، مثلاً: یہود، نصاریٰ وغیرہما، لیکن ان کی حیثیت جزوی ہوئی، یعنی شخصیت، اصول یا کسی مقام کی طرف منسوب ہوئے، اصل نام ان کا ''مسلمان'' ہی تھا۔ ''اسلام'' نیا

مذہب نہیں، حضرت آدم علیہ السلام بھی مسلمان تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیرِ کعبہ کے دوران میں یہی دعا مانگی تھی: ﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ﴾ [البقرۃ: ۱۲۸]

ناموں کا اختلاف لیکن اس قدر محبت:

ناموں کے لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد بھی اختلاف پایا گیا۔ شیعہ، سنی یا علوی، عثمانی کا اختلاف سرِفہرست ہے، جو نہایت سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس اختلاف کے باوجود ان خدا کے بندوں کی باہمی محبت کیسی تھی؟ ایک مثال ملاحظہ ہو:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ، جنھیں بجا طور پر نسباً علوی اور ذہناً عثمانی کہنا چاہیے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نظر بندی کے دوران میں اُن کے پاس آئے اور کہا: ''حکم ہو تو مظاہرین کو قوت کے ذریعے درست کر دیا جائے۔'' اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی آ کر درخواست گزار ہوئے، لیکن انھوں نے فرمایا: ''میں نہیں چاہتا کہ میری خاطر ایک قطرہ بھی مسلمانوں کے خون کا بہے۔''[1]

فیصلہ صحیح تھا یا غلط، تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا صبر بے مثال اور اپنی نظیر آپ تھا۔ پھر بعض لوگوں نے مسلمانوں میں جو تفریق پیدا کی ہے، اس سے آپ خوب آگاہ ہیں۔ ''خوارج'' نے گڑ بڑ مچائی تھی۔ نام سب مسلمان رکھتے ہیں۔

اکثر لوگ کہتے ہیں: ''نام کی وجہ سے سارا اختلاف پڑتا ہے۔'' حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اختلاف پہلے ابھرتا ہے، بعد میں کوئی پارٹی کسی نام سے موسوم ہوتی ہے، نام نہ رکھے جائیں تو بھی اختلاف ختم نہیں ہوتے۔ دیانت ملحوظ رکھ کر مسائل میں اختلاف کر لیا جائے تو قباحت نہیں اور اگر اختلاف کو لڑائی کے مترادف سمجھا جائے تو یہ ہماری ناسمجھی ہے۔

اختلافِ آراء کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا باہم پیار:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آراء آپس میں متصادم ہو جاتی تھیں۔ حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما حجِ تمتع کے قائل نہ تھے، جب کہ دوسروں کے نزدیک یہ سنت تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ گھٹنوں کے بیچ

[1] مقدمة ابن خلدون (ص: ۲۰۷، ۲۰۸)

میں ہاتھ دے کر رکوع کیا کرتے تھے، اسی طرح امامت بھی کرائی اور لوگوں نے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی، لیکن لڑے نہیں۔

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پریشان کر رکھا تھا، وہ کہتے تھے: فالتو روپے رکھنا جائز نہیں، کاروبار میں لگاؤ یا غریبوں کو دو۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شکایتی چٹھی لکھی: ''اگر آپ شام میں امن چاہتے ہیں تو ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو بلا لیجیے۔'' ابو ذر رضی اللہ عنہ نے مدینے آ کر بھی وہی تبلیغ جاری رکھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں حکماً بند کیا، مگر لوگوں نے ان سے لڑائی نہیں لڑی۔ بحث ضرور کی کہ زکات اسلام کا رکن ہے، اگر نقد پاس کچھ نہ ہو تو زکات کیسی؟

بس اسی طرح ان کے اختلافات چلتے تھے اور معاملہ کبھی حد سے نہیں بڑھا تھا۔ ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ [بني إسرائيل: ٨٤]

فقہائے امت کی راہ:

بعد میں فقہائے امت کی زندگی بھی اسی انداز پر تھی۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ ایک دفعہ مسجد سے نماز پڑھ کر نکلے تو کسی نے کہا: ''جس پانی سے آپ نے وضو کیا ہے، اس میں چوہیا گری تھی۔'' آپ کے نزدیک وہ پانی پلید تھا، لیکن فرمایا: "اَلْيَوْمَ نَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ الْحِجَازِ" ''آج ہم اہلِ حجاز کے مذہب پر عمل کرتے ہیں۔'' یعنی اپنا ایک اجتہاد ہوتے ہوئے بھی وہ باقی سب کو غلط نہیں سمجھتے تھے۔

ان ائمہ کے اختلافات کو بنیاد بنا کر ان کے نام سے ایسی فروعات چلائی گئی ہیں کہ اگر وہ ائمہ خود دنیا میں تشریف لے آئیں اور انھیں یہ بتایا جائے کہ یہ آپ کا مذہب ہے تو وہ اسے پہچاننے سے انکار کر دیں۔

محدثین نے فقہی اختلافات دور کرنے کی بڑی کوشش فرمائی ہے، خدا بہتر جانتا ہے کہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عالم الغیب اور نا جانے کیا کیا مشہور کیا جاتا ہے اور پھر سینہ زوری کے ساتھ اسے اہلِ سنت کا مسلک بتایا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما ہوتے تو صاف فرما دیتے: مجھے اس سے معاف رکھو!!

فروعی مسائل میں اختلافات جائز ہیں، لیکن لڑنا ناجائز ہے۔ اس لحاظ سے کوئی نام رکھنا مستحسن نہیں تو کم از کم برا بھی نہیں، بشرطیکہ دامنِ اسلام ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ البتہ بنیادی اور اصولی مسائل میں اختلاف اسلام میں گوارا نہیں، ایسا کرنے والوں کے خلاف ''جہاد'' کا حکم ہے۔[1]



[1] خطبہ بتاریخ 3 جولائی 1964ء شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (17 جولائی 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کی عدالت میں گواہی اور مسئلۂ حاضر و ناظر

﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [الحج: ٧٨]

''اسی (اللہ) نے پہلے بھی تمھارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر شہادت دینے والا ہو اور تم لوگوں پر شہادت دینے والے ہو۔''

جہاد کی راہیں:

سچائی کی حمایت میں ممکن حد تک زور لگا دینا عین جہاد اور مقصودِ زندگانی ہے۔ یہ ایسا فرض ہے کہ جس سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ ''جہاد'' لڑائی کا نام ہی نہیں، نصیحت کی بات کہہ دینا بھی ''جہاد'' ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک یہ میدان مسلسل موجود رہا ہے۔

قوموں نے دنیائے عمل میں کیا کیا جوہر دکھائے اور اللہ کو خوش کرنے کے لیے کس کس نے اپنی زندگیاں وقف کیں؟ مرنے کے بعد اس پر غور کیا جائے گا، جہاد کی پرکھ ہوگی۔ کون مخلص اور نیک نیت تھا اور کون بدنیت؟ سب نکھر کر سامنے آ جائے گا۔

مجاہد کی پرسش:

اوروں کی طرح اللہ کے سامنے مجاہد بھی پیش ہوگا، اس سے پوچھا جائے گا: ہم نے تجھے اتنی نعمتیں دیں تو تُو نے کیا کیا؟ جواب دے گا: باری تعالیٰ! میں نے تیری راہ میں لڑ کر جان دے دی، جواب ملے گا:

«كَذَبْتَ، وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُّقَالَ: إِنَّكَ جَرِيْءٌ، فَقَدْ قِيْلَ»[1]

''تو نے جھوٹ بولا، تو نے اس لیے لڑائی کی کہ بہادر کہلاؤں، پس تمھیں ''بہادر'' کہا گیا۔''

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٠٥)

نبی مکرم ﷺ کی شہادت:

پھر ہماری عملی زندگی پر حضور ﷺ کی بھی شہادت ہو گی، آپ ﷺ نے جن کو دیکھا اور جانا، ان پر ''شہادت'' کا مفہوم تو واضح ہے، یہ تفصیلاً بھی ہوسکتی ہے۔ فرمایا:

﴿ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴾ [الفرقان: ۳۰]

''اے میرے رب! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو متروک بنا دیا۔''

جو ہم عصر، لیکن غائب تھے یا جو وفاتِ نبوی ﷺ کے بعد پیدا ہوئے اور تا قیامت پیدا ہوتے رہیں گے، ان پر شہادت کیسی؟ اہلِ حق کے نزدیک یہ شہادت ''اِجمالاً'' ہو گی، شخصاً شخصاً نہ ہو گی۔ آپ ﷺ کو بذریعہ وحی بتا دیا گیا تھا کہ امت میں کیسے کیسے لوگ ہوں گے، پیش گوئیوں کی صورت میں آپ ﷺ نے جن کی نشان دہی فرمائی اور روزِ قیامت کو بھی علم ہو گا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

بعض نے ہر ہر فرد کے لیے ''تفصیلی'' شہادت مراد لی ہے۔ اس سے ان کے لیے مسئلے میں بڑی مشکل پیدا ہو گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں: آپ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، تبھی محشر میں شہادت دے سکیں گے۔ حاضر و ناظر کا مسئلہ فقہائے متقدمین میں نہیں تھا۔ قرآن و سنت سے اگر ثابت ہوتا تو ہم مان لیتے، آخر ہم نے دیگر معجزات بھی تو مانے ہیں۔

اگر شہادت ہی کی خاطر یہ مسئلہ پیدا کیا گیا ہے تو پھر اس تکلف کی ضرورت نہ تھی۔ یہ لوگ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ حضور ﷺ زندگی میں بھی ''مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ'' (جو ہو چکا اور جو ہونے والا ہے) کا علم رکھتے تھے۔ کیا شہادت کے لیے وہ علم ناکافی سمجھا گیا؟

ان کا استدلال سنیے!

❀ فرماتے ہیں: اگر حضور ﷺ ہر جگہ موجود نہ ہوں تو قبر میں آنے والے سے منکر نکیر کیسے پوچھ سکتے ہیں: ((مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟))[1] ''تیرا اس شخص (نبی ﷺ) کے متعلق کیا خیال تھا؟''

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٨)

یاد رہے! اشارے کے لیے ضروری نہیں کہ مشار الیہ ضرور سامنے موجود ہو، جب آیت: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ [البقرۃ: ۲] نازل ہوئی تھی تو سارا قرآن پورا نہ اترا تھا۔

❀ ہرقل اور ابوسفیان کا مکالمہ مشہور ہے، شاہِ روم نے اپنے ترجمان کی وساطت سے کہا تھا: "إِنِّي سَائِلٌ هَذَا عَنْ هَذَا الرَّجُلِ"[1] "میں اسے اس آدمی (نبی ﷺ) کے متعلق سوال کرنے لگا ہوں۔"

کیا خیال ہے! ہرقل اور ابوسفیان اور دیگر درباری سب حضور ﷺ کو حاضر ناظر سمجھتے تھے؟ مطلب یہ ہے کہ آپ اس وقت ان کے ذہنوں میں موجود تھے اور "ھذا" کا اشارہ اس ذات کی طرف تھا جو زیرِ بحث تھی۔

❀ سچی بات تو یہ ہے کہ ہر چیز کا علم تو آپ ﷺ کو اپنے خویش و اقارب کے بارے میں بھی نہ تھا۔ ورنہ واقعۂ افک میں اتنی طویل اور قطعی خاموشی کیوں؟ ام المومنین رضی اللہ عنہا پر بہتانِ عظیم لگ رہا ہو اور آپ ﷺ مصلحتاً خاموش بیٹھ رہے ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

❀ بقول مورخ ابن سعد رحمہ اللہ: حضور ﷺ کے زمانے میں صحابہ نے بیاسی (82) جنگیں لڑیں۔[2] کہیں کامیاب رہے اور کہیں ناکام۔ غزوۂ احد میں مسلمانوں کی فتح شکست سے تبدیل ہوگئی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کبھی شکایت نہ کی کہ حضور! آپ "مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ" (جو کچھ ہو چکا اور جو ہونے والا ہے) کا علم رکھتے ہیں، ہمیں پہلے کیوں مطلع نہ فرمایا؟

❀ آیت نازل ہوئی: ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ﴾ [الفتح: ۲۷] "تم لوگ مسجدِ حرام (کعبہ شریف) میں ضرور داخل ہوگے، ان شاء اللہ اس حال میں کہ تم سر منڈائے اور بال ترشوائے ہوئے ہوگے، کسی کا خوف تم کو نہ ہوگا۔"

آپ ﷺ قریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو ہمراہ لے کر عمرے کے لیے چلے۔ یہ حضرات منزل بہ منزل حدیبیہ پہنچے، آگے دیکھا تو داخلہ بند ہے۔ کفارِ مکہ سے کہا: ہم لڑنے نہیں آئے، عمرہ کرنے آئے ہیں۔ خیر! بات صلح پر ٹھہری، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ سے کہا: یا رسول اللہ! یہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷)

[2] غزوات الرسول ﷺ وسراياه لابن سعد رحمه الله.

کیا؟ فرمایا: فتح یقیناً ہو گی، لیکن کب؟ یہ نامعلوم ہے۔ یعنی چند دن بعد جو واقعہ ہونے والا تھا، حضور ﷺ کو اس کی تاریخ کا بھی علم نہ تھا۔

❀ ''حجۃ الوداع'' حضور ﷺ نے قِران کی شکل میں ادا کیا اور قربانی ساتھ نہ لانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عمرے سے فارغ ہو کر احرام کھول دینے، یعنی ''تمتع'' کا مشورہ دیا، انھوں نے پس و پیش کی۔ ان کے خیال میں یہ عمرہ، عمرہ ہی نہ تھا۔ انھوں نے حج کی نیت سے احرام باندھا ہوا تھا، کیونکہ ایامِ جاہلیت میں حج کے دنوں میں عمرہ برا سمجھا جاتا تھا۔ حضور ﷺ بھی خود احرام قائم رکھے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ أَنِّي اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ لَمْ أَسُقِ الْهَدْيَ))[1]

''جو کچھ مجھے بعد میں معلوم ہوا ہے، اگر پہلے معلوم ہوتا تو ہدی (قربانی) ساتھ نہ لاتا اور حج کو عمرہ کر لیتا۔''

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ یہ حاضر و ناظر اور غیب دان ہونے کی باتیں سراسر لوگوں کی اختراعات ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

مقامِ شہادت:

گواہ ہونے کی حیثیت سے نبی اکرم ﷺ کا مقام بہت اونچا ہو گیا ہے، اس سے حضور ﷺ کی عظمت و شان اور علوِ مرتبت کا پتا چلتا ہے۔ گواہی وہی دے سکتا ہے جو عادل اور صادق ہو اور پھر ایسی عظیم الشان گواہی!

صحابہ نہایت نیک نفس، پاک باطن، پابندِ شریعت اور مجسمۂ صدق و صفا تھے۔ تاہم شہادت کے معاملے میں ان کے متعلق بھی فرمایا:

﴿ وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ [الطلاق: ٢]

''اور تم اپنے میں سے دو صاحبِ عدل آدمی گواہ بنا لو۔''

اور حضور ﷺ ایک دو پر نہیں، پوری امت پر گواہ ہوں گے اور تنہا گواہ ہوں گے، دوسرے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢١٨)

تمام مسلمانوں کی شہادت:

پھر فرمایا: ﴿ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ یہ شہادت بھی اجمال اور تفصیل پر منقسم ہے۔ ہم صرف اپنے متعلقین اور شناساؤں پر گواہی نہ دیں گے، بلکہ فرمانِ نبوی کے مطابق گذشتہ اقوام پر بھی ہماری گواہی ہوگی اور اس زمانے میں ہمارے غیر موجود ہونے کے باوجود معتبر ہوگی، کیونکہ ہمیں قرآن وحدیث کے ذریعے مجملاً ان کے حالات کا پتا چل گیا ہے، پھر نا جانے ہم پر گواہی کے لیے حضور ﷺ کا موجود ہونا کیوں ضروری سمجھا گیا؟ یہ لوگ اجمال وتفصیل کے موٹے سے فرق کو بھی نہیں سمجھتے۔

منصبِ شہادت کے تقاضے:

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ کی طرح ہمیں بھی شہداء کہہ کر بہت بڑا اعزاز بخشا ہے۔ اس منصب کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ نہایت پاکیزہ زندگی بسر کریں۔ جو شخص جھوٹ بولتا اور خلافِ شرع کام کرتا ہو، شہادت کے لائق نہیں رہتا، لوگوں میں اس کا اعتماد اٹھ جاتا ہے اور ثقاہت ختم ہو جاتی ہے۔

اللہ کی عدالت میں شہادت دینے کے لیے انسان کو بہت ہی نیک اور بلند اخلاق ہونا چاہیے، لیکن افسوس ہے کہ ہم لوگ چند ٹکوں کے عوض نہایت کمینی حرکتیں کر جاتے ہیں اور دنیوی حرص و طمع کے لیے جھوٹ جیسے بدترین گناہ سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح مسلمان بننے کی توفیق دے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہم بھی شہادت کے قابل ہوسکیں۔[1]



[1] خطبہ بتاریخ 10 جولائی 1964 شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (24 جولائی 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام فحاشی کا سدِ باب کرتا ہے

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝﴾

[المؤمنون: ۵_۷]

''اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ، تو بلاشبہہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پھر جو شخص ان کے علاوہ (رستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں۔''

کامیاب مومنوں کی صفات:

کامیاب مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے نماز میں خشوع، لغو سے پرہیز اور زکات ادا کرنے کا ذکر کر کے چوتھی صفت کا تذکرہ فرمایا، جو اخلاق سے تعلق رکھتی ہے، یعنی مومن کو اپنے جذبات پر پورا پورا ضبط اور کنٹرول ہوتا ہے۔

اخلاقی تعلیم تمام اقوام کو دی گئی ہے۔ آج اس کی طرف خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، کیونکہ ماحول انتہائی ناساز گار ہو گیا ہے۔

ضبطِ نفس ایک مومن کا شیوہ ہے:

بچہ پیدا ہو کر مختلف منزلیں طے کرتا ہے اور جب نشو ونما پا کر جوانی میں قدم رکھ دیتا ہے تو اس میں بقائے نسل کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں کئی علمی خانوادے اور نامور خاندان مٹ گئے۔ کئی مشہور قومیں نابود ہو گئیں، لیکن نسلِ انسانی نہ مٹ سکی۔ یہ ہنوز زندہ اور باقی ہے، کیوں کہ ''اور نہیں تو اور سہی۔''

جوانی میں سنبھل کر رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے، لیکن مومن اس منزل سے بھی کامیاب گزر جاتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی خواہشات کے نہیں، بلکہ اللہ کے تابع بسر ہوتی ہے۔ محاسنِ اخلاق کو اپنانا اور بے راہ روی سے محفوظ رہنا، دین کی روح ہے، بلکہ صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اخلاق ہی زندگی ہے، لیکن جو لوگ اس سے عاری ہیں، ان کی زندگی کتوں اور خنزیروں سے فروتر ہوتی ہے!

ہمارا ملک گو آزاد ہو چکا ہے، لیکن ہمارے ذہن ابھی تک غلامی سے نجات نہیں پا سکے۔ مغربی تہذیب برابر ہمیں متاثر کیے جا رہی ہے۔ یہ انواع و اقسام کی عیاشیاں سب ادھر ہی سے آ رہی ہیں۔ ہم باوجود اس کے کہ ان سے متنفر ہیں، لیکن انھیں قبول کرنے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔

ذرائع اِبلاغ اور فحاشی:

اور باتوں کو جانے دیجیے! یہ ریڈیو کچھ کم مخرب الاخلاق نہیں ہے۔ اسے اِلا ماشاء اللہ فحش گانے بولنے کے سوا کچھ کام ہی نہیں ہے۔ آپ کی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں مزے لے لے کر ان کے غلیظ گانے سنتی ہیں اور آپ کی غیرت ہے کہ کبھی نہیں جاگی!!

بعض لوگ بہانہ کرتے ہیں: جی، ہم نے تو قرآن حکیم اور خبریں سننے کے لیے ریڈیو رکھا ہوا ہے۔ گزارش یہ ہے کہ دو چار آیتیں سن بھی لیں تو کیا ہوا؟ تمام دن، جو پلید گانے نشر ہوتے رہتے ہیں، ان کا بھی کوئی جواز پیش کیجیے گا!

ان آیتوں میں مذکر کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں، یعنی خصوصی طور پر مردوں کو اخلاقی تنبیہ کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا ذہن فطرتاً پاک ہوتا ہے، وہ اپنی حیا کا خیال رکھتی ہے۔ اسے اپنی عفت کا پاس ہوتا ہے اور وہ اپنی عصمت و آبرو کا لحاظ رکھتی ہے۔ یہ مرد ہیں جو پسِ پردہ اسے خراب کرتے ہیں اور بعض اوقات یہ ذات، اس شرمناک وادی میں ان سے بھی بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں عورت کی پستی:

عورت کا پستی میں گرنا دیکھیے؛ زمانۂ جاہلیت میں زنا تو زنا تھا، ان کے اکثر نکاح بھی بذاتِ خود شرم ناک قسم کے زنا تھے۔ ان میں نکاح کی سات قسمیں مروج تھیں، صرف ایک شکل معقول تھی، جسے اسلام نے رہنے دیا اور اس میں بھی کافی اصلاح کی، باقی سب کو حرام قرار دے دیا۔

حضور ﷺ کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ابو طالب نے پڑھا تھا۔[1] اس زمانے میں نکاح کیا ہوتا تھا، مجلسِ نکاح میں طرفین کے لوگ اپنی اپنی شان میں قصیدے کہتے کہ ہم یہ اور ہم وہ، لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس رسم کو خطبۂ مسنونہ اور ایجاب وقبول کی پاکیزہ ہیئت میں بدل دیا۔

اسلام نے اخلاقی لحاظ سے بھی شاندار انقلاب پیدا کیا ہے۔ نہایت گندے لوگ اعلیٰ درجے کے پاک باز ہو گئے۔ سب غلاظتیں ختم ہوئیں اور زنا کا وجود قصۂ ماضی بن گیا۔ اگر کسی سے یہ جرم سرزد ہوا بھی تو خدا کا ڈر اتنا تھا کہ اپنا قصور چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ ضمیر ملامت کرتا تھا اور سنگین سزا کے لیے از خود عدالت میں پیش ہوتے۔

دو سنہرے واقعات:

ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا تو حضور ﷺ ٹالتے رہے۔ چوتھی بار اس نے اصرار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَبِكَ جُنُوْنٌ)) ''تم پاگل تو نہیں؟''

کہا: نہیں۔

فرمایا: ((فَهَلْ أَحْصَنْتَ؟)) ''شادی شدہ ہو؟''

کہا: ہاں۔ تب رجم کا حکم فرمایا۔[2]

یعنی عدالت گناہ چھپانے کی تلقین کرتی ہے، لیکن مجرم اسے بیان کرنے پر بضد ہے اور جانتا بھی ہے کہ اس کی سزا پتھراؤ ہے۔

غامدیہ عورت کا واقعہ بھی مشہور ہے۔ اس نے بھی حضور ﷺ کے پاس آکر اپنی غلطی کا خود اقرار کیا اور ساتھ ہی کہا کہ اس کا پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وضعِ حمل کے بعد آنا۔ وہ پھر آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسے جا کر دودھ پلاؤ، جب روٹی کھانے لگے تو پھر آنا۔ وہ تیسری بار پھر آئی اور بن بلائے آئی اور رجم کو گوارا کیا۔[3]

---

[1] التلقيح لابن الجوزي (ص: ١٩) السيرة الحلبية (٢٠١/١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨١٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩٥)

صنفِ نازک اور یہ حوصلہ؟ اللہ رے شان تیری! یہی چند ایک واقعات ہوئے، جو درجِ کتب ہو گئے اور فضا بالکل صاف ستھری ہو گئی۔

ہماری معاشرتی حالت:

اپنا معاشرہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ زنا اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ اہلِ مذہب سے امید تھی کہ کچھ اقدام کریں گے، لیکن میلاد جیسی بدعتوں میں پڑ کر، انھوں نے اس فتنے کو اور ہوا دے دی ہے۔ تقدیس روبہ انحطاط ہے اور یہ حضرت گڈوں پر چڑھ کر ناچ کود رہے ہیں! نبی کریم ﷺ نے ٹھیک فرمایا کہ جتنی بدعت پھیلتی ہے، اتنی ہی سنت کی جگہ خالی کر دیتی ہے۔[1]

حدیث ہے: ((لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ))[2] یعنی زانی، زنا کے وقت مومن نہیں رہتا۔ ایمان تو بعد کی بات ہے۔ جائز صورتوں کے ہوتے ہوئے جانوروں کی طرح دائیں بائیں منہ مارنا کہاں کی انسانیت ہے؟ یہ تو معمولی اخلاق سے بھی گری ہوئی حرکت ہے۔

جو برے ہیں، وہ تو بدنام ہیں ہی، لیکن جنھیں آپ ''شرفاء'' کہتے ہیں، انھوں نے کون سی اچھی مثال قائم کی ہے؟ کلبوں میں کیا ہوتا ہے؟

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

خاندانی منصوبہ بندی کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ اخلاقی مجرموں کی بدمعاشی چھپ گئی ہے اور انھیں کھل کر گل کھلانے کا موقع مل گیا ہے۔ یہ اخلاقی کمی کا نتیجہ ہے کہ دیگر جرائم بھی بڑھ رہے ہیں۔ کسی کی جان کی بھی پروا نہیں رہ گئی، ان حادثات کا زیادہ تر یہی باعث ہے۔

حکومت کی ذمے داری:

حکومت کو چاہیے کہ زنا کے اسباب و دواعی پر غور کرے۔ ہمارا لٹریچر سمیٹے۔ تفریح گاہیں، کلب اور ریڈیو، سب نظرِ ثانی کے قابل ہیں۔ بالخصوص ریڈیو کا اثر تو بڑا ہمہ گیر ہے۔[3] اس نے تو گھر گھر

---

[1] مسند أحمد، رقم الحديث (١٦٩٧٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٧٥)

[3] ریڈیو کے بعد اب ٹیلی ویژن اور وی سی آر [ان کے بعد اب ڈش، کیبل اور انٹرنیٹ] نے بے حیائی کی اس تبلیغ کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ حکومت اسے روکنے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى (عبدالسلام)

میں فحاشی کی آگ لگا دی ہے۔ اس سے اخلاق تباہ ہو رہے ہیں۔ جب دنیا یہ جانتی ہے تو پھر کیوں اس میں اصلاح نہیں کی جاتی؟

ہمیں مغرب کی کورانہ تقلید نہیں کرنی چاہیے، ہماری اور ان کی راہیں جدا جدا ہیں۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (4 ستمبر 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مومن نماز کی حفاظت کرتے ہیں

﴿ وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۝ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ۹۔۱۱]

''اور وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہیں۔ جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

مقامِ نماز:

ایمان کا دعویٰ بہتوں کو ہوتا ہے، لیکن کامیابی سے ہم کنار وہی ہوتے ہیں جن میں مومنوں کے سے اوصاف پائے جائیں۔ اسلام میں نماز خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں سجدہ پایا جاتا ہے جو خشوع کا انتہائی مقام ہے، اسی لیے یہاں اولاً خشوعِ نماز کا ذکر کیا اور آخر میں بھی نماز کے ہی متعلق صفت بیان فرمائی کہ وہ نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں نماز کا ذکر بکثرت اور مختلف الفاظ میں ملتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں اقامت، دوام اور محافظت کا ہونا ضروری ہے۔ ضرورت کی نماز، فرصت ملے کی نماز اور بلاتسلسل یا ناغے سے پڑھی جانے والی نماز قابلِ قبول نہیں۔ ایسی نمازیں کاروباری ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں، ''عبادت'' کہلانے کی مستحق نہیں۔

نجات و فلاح کا تعلق اس نماز سے ہے جو ہمیشہ ہو۔ روزِ قیامت جن نمازیوں کو عرش کا سایہ ((یَوۡمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ)) ''جس دن اس (عرش) کے سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔'' نصیب ہوگا، ان کا وصف حضور ﷺ نے یہ فرمایا: ((وَقَلۡبُهُ مُعَلَّقٌ بِالۡمَسۡجِدِ))[1] ''دل مسجد سے وابستہ رہتا

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٦٠)

ہے۔'' یعنی وہ منتظر رہتے ہیں کب اذان ہو اور ہم بارگاہِ الٰہی میں حاضری کو پہنچیں۔

ہم لوگ نماز سے مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں۔ اس کی قدر و منزلت پوری طرح محسوس نہیں کر پاتے۔ عبادات میں سب سے پہلے نماز ہی کا پوچھا جائے گا۔[1] شریعت میں مسلمان اور کافر میں ''نماز'' کا فرق بتلایا گیا ہے۔ جو شخص نماز نہیں پڑھتا اس کے متعلق کفر کا فتویٰ ہے۔[2] ''کفر'' کے مفہوم میں بحث کی گنجایش نکالی جا سکتی ہے، لیکن کفر کا لفظ نہیں تبدیل ہو سکتا، یعنی اسلامی دنیا میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص مسلمان ہو کر پابندِ نماز نہ ہو۔

حفاظتِ نماز کا مفہوم:

یہ ٹھیک ہے کہ اسلام صرف نماز میں نہیں رہ گیا۔ مسلمان کے ذمے اور بھی بہت سے کام ہیں، لیکن جو مقام نماز کو ملا ہے، اس لحاظ سے یہ تمام عبادتوں میں سرفہرست ہو گئی ہے۔

حفاظت کا مفہوم صرف یہی نہیں کہ پانچ وقت نماز پڑھ لی جائے اور بس، بلکہ مزید بہت کچھ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے، مثلاً:

حفاظتِ وضو:

بعض دوستوں کو بے محابا پانی گرانے کی عادت ہوتی ہے۔ آدمی پانی کو اتنا کم بھی استعمال نہ کرے کہ اعضا خشک رہ جائیں اور نہ ضرورت سے زیادہ ہی۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((لَا تُسْرِفْ وَلَوْ كُنْتَ عَلٰى نَهْرٍ جَارٍ))[3] ''بہتی نہر پر بیٹھ کر بھی اِسراف نہ کرو۔'' پانی دستیاب نہ ہو تو چاہیے کہ باادب ہو کر تیمّم کرے۔

حفاظتِ وقت:

وقت کی پابندی جتنی مشکل ہے، اسی قدر ضروری ہے: ﴿ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

---

[1] مسند أحمد، رقم الحديث (١٦٦١١٤)

[2] مسند أحمد، رقم الحديث (٢٢٩٣٧)

[3] یہ روایت مسند احمد اور سنن ابن ماجہ میں مذکور ہے: ''عن عبد الله بن عمرو ﷺ قال: إن النبي ﷺ مرّ بسعد وهو يتوضأ، فقال: ((مَا هذا السَّرَفُ يا سعد؟)) قال: أفي الوضوءِ سَرَفٌ؟ قال: ((نعم وإن كنتَ على نهر جار)) (مشكاة ص: ٤٧) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تلخیص میں یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے: ''اس کی سند ضعیف ہے'' اور فتح الباری میں فرمایا: اس کی سند کمزور ہے۔ دیکھیں: مرعاة المفاتيح (٤٨٩/١) [عبدالسلام]

كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ [النساء: ۱۰۳] ”بے شک نماز مومنوں پر ہمیشہ سے ایسے فرض ہے جس کا وقت فرض کیا ہوا ہے۔“ یہ وہی اختیار کر سکتے ہیں جن میں مجاہدانہ سپرٹ پائی جاتی ہو۔ اول وقت پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ یہ رحمت ہے، آخری وقت کو عفو کہا گیا ہے۔[1] یعنی اس وقت نماز پڑھنے والا مجرم ہونے سے بچ جاتا ہے کہ اسے معافی دے دی گئی اور کوئی فضیلت حاصل نہ کر سکا۔

حفاظتِ طہارت:

نماز کی جگہ، جسم اور لباس پاک ہو، کیوں کہ نماز میں انسان خدا سے مناجات کرتا ہے اور فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں۔

حفاظتِ ارکان:

تعدیلِ ارکان ایک اہم مسئلہ ہے۔ انسان چٹ پٹ نماز سے پیچھا چھڑانے کی کوشش نہ کرے، گویا بیگار میں پکڑ لیا گیا ہو، بلکہ نماز اطمینان کے ساتھ ادا کرے۔ اس کے اعضاء میں سکون پیدا نہیں ہوگا تو دل میں سکون کہاں سے آسکے گا؟ ایک شخص نے جلدی جلدی نماز پڑھی تو اسے ”مُسِیْئُ الصلاۃ“ کا خطاب ملا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: «صَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ»[2]

”تو پھر نماز پڑھ! کیوں کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔“

تعدیلِ ارکان کے بغیر، فقہائے حنفیہ نا جانے نماز کو کیوں صحیح کہہ دیتے ہیں؟ ایسی نماز فقہی تو ہوسکتی ہے، لیکن خدا کے ہاں مقبول بھی ہوگی! یہ مسئلہ الگ ہے۔ خدا معاف کر دے تو بات دوسری ہے، وہ قادرِ مطلق ہے، لیکن جس طرح قانوناً ابلیس، منکرینِ نبوت اور منکرینِ حدیث رحمت کے مستحق

[1] یہ روایت ترمذی میں ہے، اس کے لفظ یہ ہیں: «الوقتُ الأولُ مِنَ الصلاۃِ رضوان اللّٰہ، والوقتُ الآخَرُ عفو اللّٰہ» امام بیہقی رحمہ اللہ نے ”المعرفۃ“ میں فرمایا ہے: ”یہ حدیث یعقوب بن ولید سے معروف ہے، جسے احمد بن حنبل اور دوسرے حفاظ نے جھوٹا قرار دیا ہے اور یہ حدیث جتنی سندوں کے ساتھ روایت ہوئی ہے، سب ضعیف ہیں۔“ دیکھیے: تحفۃ الأحوذي (۱/۱۵۵) حقیقت یہ ہے کہ جو نمازیں آنحضرت ﷺ اول وقت پڑھتے تھے، وہ اسی وقت افضل ہیں اور جو دیر سے پڑھنے کی فضیلت بیان کی ہے، وہ اسی وقت افضل ہیں، جیسے: عشاء کی نماز ہے۔ (عبدالسلام)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷۵۷)

نہیں، اسی طرح جب آپ ﷺ نے فرما دیا ہے کہ ((إِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ)) تو پھر بغیر تعدیل کے نماز کیوں صحیح ہو؟

حفاظتِ نوافل:

انسان کتنا ہی نیک اور پارسا ہوتا رہے، تکمیل کا دعویٰ نہیں کر سکتا: ((إِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوا)) [1] ''اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا لیکن تم تھک جاتے ہو۔'' حسبِ استطاعت کوشش جاری رکھنا چاہیے۔ صرف فرائض پر نہ رہے، نوافل پر بھی توجہ دے، تاکہ ان سے تلافی کا کام لیا جا سکے۔ حدیث میں ہے کہ فرائض میں کمی رہ جائے گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ((هَلْ لِعَبْدِي مِنْ تَطَوُّعٍ؟)) [2] ''میرے بندے کی کوئی نفلی عبادت ہے؟'' یعنی اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے فرائض کی کمی نوافل سے پورا فرما دیں گے۔

ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ نے جنت میں آنحضرت ﷺ کی مرافقت چاہی تو فرمایا: ((أَعِنِّي عَلٰى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ)) [3] ''خوب سجدے کرو۔''

ہم نوافل سے بھاگتے ہیں کہ ''چلو! وہ کون سے فرض ہیں'' لیکن ان میں فائدے کا پہلو نہیں دیکھتے اور نقصان میں رہتے ہیں۔

جنت کے وارث:

﴿ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿١٠﴾ ﴾ وراثت (ملکیت) کے متعدد ذرائع ہوتے ہیں: خرید، عطیہ، موروث کی موت وغیرہ۔ وارث کو وہی حقوقِ ملکیت حاصل ہو جاتے ہیں جو موروث کے لیے ہوتے ہیں۔ یہاں موت تو کسی کی نہیں ہوگی، صرف مکمل مالک ہونے کی وجہ سے اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

ایک اور مفہوم بھی لیا گیا ہے، حدیث کے مطابق ہر شخص کے دو ٹھکانے ہیں: جنت میں بھی اور جہنم میں بھی۔ کفار نے اپنی کوشش کو غلط راہ پر لگایا اور جنت سے محروم ہو گئے۔ مومنوں نے تحصیلِ جنت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٦١)

[2] مسند أحمد، رقم الحديث (١٦٦١٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٩)

کی سعی کی، ان کا جہنمی ٹھکانا دوزخیوں کے سپرد ہوا اور خود وہ کفار کے بہشتی ٹھکانے کے وارث اور قابض ہو گئے۔ اس لحاظ سے یہ لفظ اپنے اصلی معنوں میں مستعمل ہوا۔

﴿ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿11﴾ ﴾ عارضی خوشی سے خوشی نہیں ہوتی، جیسے لڑکا پیدا ہو اور پھر مر جائے، دائمی مسرت ہی خوشی کا باعث ہے: ﴿ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ ﴿26﴾ ﴾ [المطففين: ٢٦] لہٰذا شائقین کو اسی کا شوق ہونا چاہیے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (18 ستمبر 1964ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

یہ زندگی بے مقصد نہیں

﴿اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿115﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَـقُّ‌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡكَرِيۡمِ ﴿116﴾ وَمَنۡ يَّدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرۡهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ‌ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الۡـكٰفِرُوۡنَ ﴿117﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغۡفِرۡ وَارۡحَمۡ وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰحِمِيۡنَ ﴿118﴾﴾ [المؤمنون: ۱۱۵-۱۱۸]

''کیا تم نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمھیں بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ چنانچہ بلند و بالا اللہ حقیقی بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ معزز و مکرم عرش کا رب ہے۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو یقیناً اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، بے شک کافر فلاح نہیں پائیں گے۔ اور آپ کہیں: اے میرے رب! میری مغفرت فرما اور (مجھ پر) رحم فرما، اور تو ہی سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔''

مقصدِ زندگانی:

یہ سورت مومنون کی آخری آیات ہیں، اس سے پہلے ان لوگوں کا ذکر آرہا تھا جنھوں نے حق کا انکار کیا، انبیاء کی مخالفت کی اور اپنی زندگی کو اس کے لیے صرف کر دیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ انسان کی زندگی فقط اس کی موت تک ہے۔ آخرت کا نام سنتے تھے، لیکن دل قبولیت سے انکاری تھا۔ جب آخرت پر ایمان نہ ہو تو زندگی کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سمجھ دار اور حق پرست انسان کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس کے نتائج و عواقب پر نگاہ ڈالتا ہے، اگر ایسا نہ کرے تو وہ دانش مند نہیں کہلا سکتا۔ فطرتِ انسانی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ کام کرنے سے پہلے اس

پر خوب سوچ بچار کر لیا جائے۔ جو شخص بے مقصد سفر کر رہا ہو، وہ لوگوں کے لیے تضحیک و ملامت کا نشانہ بنے گا۔

مخالفین کی بنیادی غلطی:

انبیاء کے مخالفین کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ آخرت کی زندگی کے قائل نہ تھے، اس لیے ان کی ساری تگ و دو اور تمام تر کوششیں محض دنیاوی مفاد حاصل کرنے کے لیے تھیں۔ اہلِ حق کی مخالفت، بحث برائے بحث، شرارت برائے شرارت؛ یہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا، لیکن ایک مسلمان کے لیے اس کی زندگی بے مقصد نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے پہلے انسان کی زندگی کا مقصد واضح فرما دیا گیا کہ یہ دنیا محض ایک سفر ہے، جس کی آخری منزل دار الآخرۃ ہے۔

﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ﴾ [العكنبوت: ٦٤]

"اور بلاشبہہ دارِ آخرت (کی زندگی) ہی (اصل) زندگی ہے۔"

ہمیں زندگی میں کوئی سفر پیش آ جائے تو ہم گاڑی یا موٹر کو ذریعہ بناتے ہیں، لیکن یہ چیزیں اصل مقصد نہیں، مقصد کچھ اور ہے، یہ محض ذرائع ہیں۔ مومن کی زندگی بھی آخرت کا ایک سفر ہے، جس کی مختلف منزلیں ہیں۔ جس طرح لاہور یا ملتان جانے کے لیے گاڑی راستے میں مختلف اسٹیشنوں پر ٹھہرتی ہے، جہاں مسافر اپنی اپنی ضرورتوں کے مطابق مختلف اشیاء سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی طرح ایک مومن کی زندگی کے لیے بھی مختلف اسٹیشن ہیں، جنھیں زندگی کے مختلف مراحل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اول بچپن، پھر جوانی، پھر بڑھاپا اور موت۔

زندگی کے مراحل اور ان کی ذمے داریاں:

بچپن کا زمانہ تعلیم و تربیت کا زمانہ ہے، جس بچے کی تربیت اس کے والدین ٹھیک طور پر نہ کر سکیں، وہ عام طور پر بڑا ہو کر بری عادات کا مرتکب رہتا ہے، اس کے مزاج میں عیاشی، آوارہ مزاجی اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کا جذبہ غالب رہتا ہے اور جوانی کی یہ بے اعتدالیاں بڑھاپے پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس ایک عقل مند انسان جوانی میں اپنی زندگی کو اعتدال سے گزارتا ہے، اس کے

ذہن میں نہ عیاشی ہوتی ہے نہ آوارہ لوگوں کی مجلس۔ سمجھ دار لوگ ہمیشہ بڑھاپے کے عوارض سے بچنے کے لیے جوانی کی نزاکتوں پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ اسی طرح ایک بوڑھے آدمی کے لیے اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے احتیاط کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی خوراک میں کمی، شدت کی گرمی و سردی سے پرہیز اور اس طرح کے دیگر معاملات میں اسے نہایت احتیاط سے قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اکثر بڑھاپے کی بے اعتدالی انسان کو جلد ہی موت کے بھنور میں لے ڈوبتی ہے۔

غرض انسان زندگی کے کسی مرحلے پر بھی اپنے مقاصد سے بے خبر نہیں۔ جوانی میں انسان بقائے نسلِ انسانی کے لیے ازدواجی تعلق قائم کرتا ہے، پھر اولاد ہوتی ہے، انسان کی تمنائیں بر آتی ہیں، یہی اولاد بڑھاپے میں ماں باپ کی زندگی کا سہارا بنتی ہے۔ اگر سوچا جائے تو زندگی کے ان مختلف ادوار کا ایک مقصد ہے۔ ان مراحل میں قدرت نے تغیر و تبدل رکھا ہے۔

کفار کی تمنا:

کفار اور مشرکین تمام مراحل طے کر کے جب جہنم میں پہنچیں گے تو بارگاہِ الٰہی میں یہ دعا کریں گے: یااللہ! ہمیں اس نارِ جہنم سے نکال! اگر ہم دوبارہ ایسا کام کریں گے تو بے شک ہم ظالموں سے ہوں گے۔ ان کی یہ خواہش ایسے وقت میں بے سود ہوگی۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے بڑھاپے میں کوئی انسان بچپن کے اوصاف کی خواہش کرے، جس کا حصول یکسر ناممکن ہے۔ کفار اور مشرکین زندگی کے ان تمام مراحل اور انقلابات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور زندگی کے ان مختلف مراحل پر انسان جن مقاصد سے دوچار ہوتا ہے، اسے بھی اچھی طرح سے جانتے اور سمجھتے ہیں، اس کے باوجود آخرت کی زندگی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی کے اصلی مقصد سے بے خبر ہیں یا جان بوجھ کر بے اعتدالی کا شکار ہیں۔

عبث کے لفظی معنی خلط یا ملاوٹ کے ہیں، یعنی یہ زندگی اپنی اصلیت سے بگڑ کر خلط ہوگئی اور اپنے اصل مقصد کو کھوگئی۔

نصرتِ الٰہی کے اسباب:

جو حکومت لڑائی کے وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے، وہ اپنے مشن میں ناکام ہو جاتی

ہے۔ جب نبی کریم ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ پہنچے تو مختلف جماعتوں نے اجتماعاً اور انفراداً آپ کو تنگ کرنے کی کوشش کی۔ اہلِ مکہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے رفقاء کو شکست دینا ہمارے لیے ممکن نہیں، کیوں کہ نبی کریم ﷺ ایک اعلیٰ درجے کے قائد، نہایت راست باز اور دیانت و امانت کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے، اور آپ ﷺ کے صحابہ جو آپ ﷺ کی صحبت کے فیض یافتہ تھے، اسی رنگ میں رنگے تھے۔ اہلِ مکہ نے مکہ کے عام رؤسا کو جمع کیا اور اردگرد کے تمام قبائل کو بلایا گیا، ان کے ساتھ جو پچھلے اختلافات تھے، وہ ختم کر کے نبی کریم ﷺ کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنے کا عہد کیا گیا۔

خندق کی لڑائی جو کفار کی طرف سے ایک اجتماعی جنگ تھی، اس میں تقریباً پچیس ہزار کا لشکر مقابلے کے لیے نکلا۔ مسلمانوں کی تعداد اس وقت ایک ہزار تھی۔ بظاہر یہ تعداد موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھی، لیکن اس موقعے پر مسلمان ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہیں رہے، تمام مسلمانوں کو جمع کیا، ہر پچیس کے مقابلے میں ایک مسلمان، لیکن مسلمانوں کے تدبر، سوچ، عزم اور توکل علی اللہ نے پچیس ہزار کے لشکرِ باطل کو شکست دے دی۔ دنیا حیرت زدہ تھی کہ ایک ہزار کی تعداد پچیس ہزار پر کس طرح غالب آ سکتی ہے۔ سو لوگ آتے اور سوال کرتے۔

غرض نبی کریم ﷺ نے نبوت کی تیئس سالہ زندگی میں ایک لمحہ بھی بے مقصد نہیں گزارا۔ جتنا وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی شکر گزاری میں صرف کرتے، اتنا ہی وقت صحابہ کی عزت و آبرو اور دنیا میں ان کی برتری کے لے صرف کرتے۔ بھلا جس کی زندگی کا یہ نصب العین ہو، اس سے ایک بے مقصد لشکر کس طرح مقابلہ کر سکتا ہے؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آخرت اور آخرت کے حالات سنتے تو خاموش رہتے۔ جب قبر کا ذکر آتا تو بے اختیار رو دیتے۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی کہ قبر کا خیال آتے ہی آپ زار و قطار کیوں روتے ہیں تو آپ نے فرمایا: یہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔[1]

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٠٨)

شرک کی مذمت:

﴿ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ ﴾: ان دو تین لفظوں میں اہلِ شرک کے تمام اوہام کے قلعوں کو گرا دیا اور ان کے باطل عقائد کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا۔ مشرک خانقاہوں کا طواف کرتے، ان پر غلاف چڑھاتے اور وہاں سجدہ ریز ہوتے ہیں، نیز اہلِ قبور سے استغفار کرتے اور بارگاہِ الٰہی میں ان کو سفارشی جانتے، جس طرح آج ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ فقیروں کو خدائی میں شریک کرتے ہیں، ان سے حاجات طلب کرتے اور ان کے نام کی نذریں نیازیں مانتے ہیں، لیکن خود فقیروں کی زندگی پر غور نہیں کرتے۔

زندگی کے مختلف ادوار جیسے ایک عام انسان کے لیے ضروری ہیں، اسی طرح یہ فقیر اور سید لوگ بھی ان مراحل سے الگ نہیں ہیں۔ بچپن کا خاصہ ہے، ناک بہہ رہی ہے، لیکن کچھ پروا نہیں، اسی طرح یہی بزرگ جب بڑھاپے کی منزل میں پہنچتا ہے تو چہرہ لٹک جاتا ہے، جھریاں نمایاں ہو جاتی ہیں، ہاتھ کانپنے لگتے ہیں، ٹانگیں معذوری کا اظہار کرتی ہیں، جس بزرگ یا فقیر کی اپنی یہ کیفیت ہو، وہ خدا کے فیصلے کے آگے کس طرح اَڑ سکتا ہے اور کون ہے جو فیصلہ خداوندی کے آگے چوں و چرا بھی کر سکے؟

یہ فقیر جب موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے تو مرید اپنے ہاتھوں سے غسل دیتے ہیں۔ فقیر بے چارے کی بے بسی کی انتہا ہے۔ اب اتنی بھی سکت نہیں کہ خود چل کر قبر میں لیٹ سکے۔ مرید ساتھ نہ دیں تو جنازہ پڑا خراب ہوتا رہے۔ اپنے ہاتھوں سے دفنا لینے کے بعد اب تمام اختیارات اور تصرف کا مالک فقیر کی قبر کو بنا لیا جاتا ہے۔ یہ مشرک کے ذہن کی کجی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب سے پاک ہے۔ اسے نہ کوئی کمزوری لاحق ہے اور نہ ہی حوائج کا کوئی حلقہ اس کے گرد ہے، وہاں نہ بڑھاپے کا گزر ہے نہ موت کا۔ ﴿ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات نہایت بلند مقام، عیوب سے منزہ اور کمزوریوں سے پاک ہے۔

زیارتِ قبور کا مقصد:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قبروں کی زیارت کرو، اس لیے کہ ان سے انسان کو موت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ قبرستان ایک ایسا مقام ہے، جہاں ویرانی کا مبہوت عالم ہر وقت چھایا رہتا ہے۔ ایک

مسلمان کے لیے قبروں کی زیارت اس لیے ضروری ہے کہ اس ویرانی کو دیکھ کر اسے اپنی موت کا خیال رہے اور زندگی کا اصل مقصود ''دار الآخرۃ'' آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے، لیکن مشرکین کی حالت جدا ہے۔ یہ قبروں کی زیارت اس لیے نہیں کرتے کہ خود اپنی موت یاد آئے یا اہلِ قبور کے لیے مغفرت کی دعا کی جائے، بلکہ یہ ان سے کچھ لینے کے لیے جاتے ہیں، ان کا یہ طریقہ اہلِ سنت کے مسلک کے یکسر خلاف ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قبروں کی زیارت کرتے تھے، لیکن اس زیارت سے مقصود ایک تو اپنی موت کو یاد کرنا تھا اور دوسرا اہلِ قبور کے لیے مغفرت کی دعا کرنا تھا۔ کسی ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ ثابت نہیں کہ انھوں نے قبر پر حاضری دی اور ان سے کچھ طلب کیا ہو۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (11 مارچ 1966ء) مرتب: جناب قاضی محمد عبداللہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

① اسلام کا نظامِ اخلاق

﴿سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ① اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ②﴾ [النور:۱،۲]

”(یہ) ایک سورت ہے، ہم نے اسے نازل کیا اور ہم نے اس (کے احکام) کو فرض کیا ہے، اور ہم نے اس میں واضح آیات نازل کیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ چنانچہ زانیہ عورت اور زانی مرد، ان دونوں میں سے ہر ایک کو تم سو کوڑے مارو، اور اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے دین (پر عمل کرنے) کے معاملے میں تمھیں ان دونوں (زانی اور زانیہ) پر قطعاً ترس نہیں آنا چاہیے اور مومنوں میں سے ایک گروہ ان دونوں کی سزا کے وقت موجود ہونا چاہیے۔“

اس سے پہلے سورۃ المومنون میں ایمان اور عملِ صالح کا بالتفصیل تذکرہ ہو چکا ہے۔ قرآنِ مجید کی تعلیم عموماً ان امور پر مشتمل ہے:

1 عبادات۔ 2 معاملات۔

3 احکام۔ 4 اخلاق۔

سنتِ نبوی میں ان امور کو پوری شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ دیگر دینی علمی ذخیرے میں ان کی تمام جزئیات پر بحث کی گئی ہے۔

مکی سورتوں میں عموماً عقائد کے علاوہ ذیل کے عنوانات کو بیان کیا گیا ہے: توحید کیا ہے؟

نبوت کا خدا اور مخلوق سے تعلق، جزا و سزا، تصورِ آخرت اور اس کے عقلی دلائل۔ لیکن نبی کریم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو صورتِ حال بدل گئی۔ وہاں مشرکین کے بجائے ایک پڑھی لکھی اور روشن خیال قوم، اہلِ کتاب سے واسطہ پڑا، وہاں زیادہ زور اخلاق اور معاملات پر دیا گیا۔ تمام مدنی سورتوں میں ایسے ہی احکام ہیں۔

معاملات کی درستی پر زور:

عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات اور اخلاق کی درستی بے حد اہم ہے، اس کو نظر انداز کرنا بے حد غلط اور مہلک ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مدنی زندگی میں معاملات کی درستی اور اخلاق کی پاکیزگی پر بہت زور دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عملی تربیت اسی نہج پر فرمائی۔ مدینہ میں اہلِ کتاب کے لا تعداد صوفیہ و رہبان تھے۔ درس و تدریس کے بے شمار ادارے تھے، لیکن عملی لحاظ سے کورے تھے۔ ہر طرح کی اخلاقی برائیاں ان میں موجود تھیں۔ جھوٹ، سود، مالِ ناحق ہضم کر جانا، ان کے لیے معمولی بات تھی:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾﴾

[التوبة: ٣٤]

”اے ایمان والو! بے شک اکثر علماء اور درویش لوگوں کا مال ناحق ہی کھاتے ہیں اور وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، تو آپ انھیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیں۔“

اس لیے صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ دنیا کے سامنے بہترین سیرت اور اعلیٰ اخلاق کے نمونے پیش کیے جائیں۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت اس انداز سے کی اور ان کی زندگیوں کی یکسر کایا پلٹ گئی۔ دل، دماغ، زبان اور اعمال تمام چیزوں میں تغیر رونما ہو گیا۔ معاملات درست اور کھرے ہو گئے۔ اس انقلاب کا اثر پورے عرب پر نہایت خوشگوار ہوا۔ بہت ہی قلیل مدت میں اس اخلاقی انقلاب نے وہ کام کیا کہ برسوں کے وعظ اور تقاریر سے یہ ناممکن تھا۔

اخلاق کی اصلاح سے برائیوں کا خاتمہ:

مدینہ جہاں اخلاق و اعمال کا دیوالا نکل چکا تھا، رسولِ کریم ﷺ نے وہاں اخلاق کو زندہ کیا اور دس سال کی مدت میں دل کی حالت بدل کر رکھ دی۔ تمام اخلاقی برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا۔ سود، جھوٹ، زنا، بے پردگی اور حرام کاری کا نام ونشان نہ رہا، لیکن آج ہماری بھی بعینہٖ وہی حالت ہو چکی ہے۔ ہم نے اسلام کو صرف چند رسومات میں منحصر کر دیا ہے اور اسلام کو بھی ایک کاروبای شے بنا دیا ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ دین کا ٹھیک ٹھیک مفہوم ذہن نشین ہو اور ہم لوگ معاملات اور اخلاق کی طرف پوری توجہ دیں۔

سنت کی نسبت خدا کی طرف:

﴿ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا ﴾: سورت کو ہم نے نازل کیا ہے۔ مقامِ رسول تو یہ ہے: ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴾ وہ تو اپنی خواہش سے کلام بھی نہیں کرتے۔ سنت کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف ہے۔ قرآن ہم نے نازل کیا ہے، سورت کو ہم نے اتارا ہے۔ گویا رسولِ اکرم ﷺ کے فرامین کی نسبت خدا کی طرف ہے۔ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ ”تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔“ اب اگر آپ نے مسئلے کو خوب سمجھ لیا، لیکن عمل نہ کیا تو ﴿ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ نہ ہوا۔ فہم کے بعد عمل بے حد ضروری ہے۔ تذکّر کا معنی ہے زندگی کو درست کرو۔

بدکاری کا مکمل خاتمہ:

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ ﴾: اسلام کا منشا یہ ہے کہ بدکاری کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔ زنا اور حرام کاری کا مکمل استیصال ہو۔ انسانی نسل کا بقا ضروری ہے، اگر انسان کی قوت پر مکمل انضباط اور کنٹرول نہ کیا جائے تو یہ بقا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اس لیے اس کو بے موقع استعمال کرنے سے منع کر دیا ہے:

﴿ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ۷]

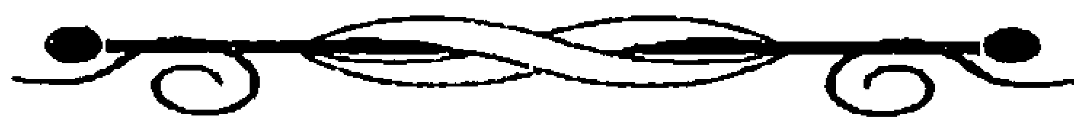
”پھر جو شخص ان کے علاوہ (رستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں۔“

صرف جائز صورت ہی میں جنسی خواہش کو پورا کرنے کی اجازت ہے۔ ناجائز طور پر اپنی خواہشات کو پورا کرنے والے زانی اور زانیہ ہوں گے۔ غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں ان کی سزا سو دُرے ہیں اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں سزائے موت، یعنی اسے سنگسار کیا جائے گا۔[1] جب مقدمہ عدالت میں چلا جائے گا تو معافی ممکن نہیں۔ سزا مل کر رہے گی، مرد، عورت، وارث یا عدالت اسے معاف نہیں کرسکتی۔

بدکاری کی سزا:

﴿ تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ ﴾: سزا دینے میں نرمی اختیار نہ کی جائے۔ علاوہ ازیں سزا بر سرِ عام دی جائے گی اور کھلے میدان میں ان کو ان کے کیے کا مزا چکھایا جائے گا۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ذات ستار العیوب ہے، لیکن زنا کی سزا کے بارے میں حکم ہے کہ اسے پوری سختی اور بے حجابی سے نافذ کیا جائے۔ اس سے اس کی سنگینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ دراصل بدکاری کا روکنا اسلام کا فرض ہے۔[2]



---

[1] دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٣٣)

[2] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (3 جون 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

② اسلام کا نظامِ اخلاق

اسلام میں وجہِ فضیلت:

اسلام نے مسلمانوں کو ایک برادری کی حیثیت دی ہے۔ کوئی شخص دوسرے سے اس بنا پر افضل نہیں کہ وہ کسی خاص قبیلے یا نسب سے تعلق رکھتا ہو۔ ((لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ)) [1] ''کسی عربی کو غیر عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٣] ''تم میں سے اللہ کے نزدیک وہی زیادہ عزت والا ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

وجہِ فضیلت علم، اخلاق اور پرہیز گاری ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عظمت اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ قریشی ہیں، بلکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کی وجہ سے آپ کو یہ شرف حاصل ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو شیر و شکر کر کے انھیں ایک بڑی برادری میں تبدیل کر دیا، لیکن اس کے اندر ایک عائلی نظام ہے اور اس کے کچھ تقاضے ہیں، جنھیں پورا کرنا چاہیے۔

اقرباء سے حسنِ سلوک کی تلقین:

صدقات کی تقسیم میں رشتے داروں کا خاص طور پر حصہ ذکر کیا گیا ہے۔ ماں سے حسنِ سلوک کی بہت تاکید فرمائی گئی ہے۔ یہاں تک کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار ماں سے احسان کی تلقین کی اور چہارم بار باپ سے۔ [2] دوسرے قریبی رشتے داروں سے بھی حسنِ سلوک کا حکم ہے۔

---

[1] مسند أحمد، رقم الحديث (٢٣٤٨٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٨)

عائلی نظام کا تحفظ:

اللہ تعالیٰ نے تقدیسِ قرابت داری کو قائم رکھنے کے لیے کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ قرابت داری کی بنیاد نسب اور خون پر ہے۔ اس کے تین بڑے سلسلے ہیں: دادا، نانا اور خسر۔ یہ تینوں قرابت داری اور نسب کے بہترین ذرائع ہیں۔ وراثت بھی انہی میں تقسیم ہوگی۔ اس عائلی نظام کے تحفظ کے لیے اسلام نے چند ضابطے مقرر کیے ہیں اور نسب کو مشتبہ ہونے سے بچانے کے لیے پوری کوشش کی ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے بدکاری کو حرام قرار دیا ہے، کیوں کہ اگر لڑکی یا لڑکے کے اخلاق مشتبہ ہوں گے تو خاندان مشکوک ٹھہرے گا۔ اس بنا پر رحم اور پشت کی حفاظت کو واجب قرار دیا ہے: ﴿ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ ﴾ [النساء: ٢٥]

یعنی نکاح کے لیے اس عورت کا انتخاب ہونا چاہیے جو بلند اخلاق ہو اور اس میں کھلی اور چھپی کوئی اخلاقی کمزوری نہ ہو، اسی طرح مردوں کے بارے میں بھی یہی حکم ہے: ﴿ مُحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ ۚ ﴾ [النساء: ٢٤]

بلند اخلاق کی اہمیت:

لیکن بدقسمتی سے موجودہ دور میں رشتے ناتے کرتے وقت مالی اور ظاہری شکل و شباہت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، لیکن اخلاق کی بلندی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، حالانکہ اخلاق کو اولیت حاصل ہونی چاہیے، کیوں کہ دینِ اسلام میں اخلاق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ رحم اور پشت کی عفت و عصمت کو بلند درجہ قرار دیا ہے۔ بدمعاشوں کی صحبت و رفاقت تک قابلِ مواخذہ ہے۔

ایک واقعہ:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دورِ خلافت میں ایک جگہ سے چند شرابی گرفتار کیے گئے۔ ان کے ہمراہ ایک حافظ کلام اللہ کو بھی حراست میں لے لیا گیا جو ان کی مجلس میں شریک تھا۔ لوگوں نے اس کے شرابی نہ ہونے کی شہادت دی اور یہ بھی ثابت کیا کہ وہ روزے سے تھا، لیکن خلیفۂ راشد نے اس پر سب سے پہلے حد جاری کرائی۔

بدکاری کے قریب جانا بھی ممنوع ہے:

عائلی نظام کو محفوظ رکھنے کے لیے صرف زنا ہی سے بچنے کی تلقین نہیں کی، بلکہ اس کے قریب تک جانے سے منع کر دیا گیا:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى ﴾ [بني إسرائيل: ٣٢] ''اور تم زنا کے قریب مت جاؤ۔''

پردے کا حکم:

مومن مردوں اور عورتوں کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم ہے، نیز عورتوں کو یہ بھی حکم ہے کہ وہ اپنی زینت چھپائیں اور پردے کا پورا پورا اہتمام کریں۔

پردے کے خلاف عموماً دو طرح کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ ایک آزادی پسند لڑکیوں کی طرف سے اور دوسری مردوں کی طرف سے۔ لڑکیاں یہ کہتی ہیں کہ پردے کے حکم کی تہہ میں ہم پر بے اعتباری کا اظہار ہے، ورنہ مردوں پر بھی یہی حکم ہوتا۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ پردے کے حکم کی بنیادی وجہ جاذبیت ہے۔ عورت کا چہرہ زیادہ جاذبِ نظر ہوتا ہے، اس لیے فطرت کے تقاضے کے طور پر پردہ عورت کو کرنا چاہیے، نیز معاشرے کی ذمے داری بھی عورت پر نہیں، بلکہ مرد پر ڈالی گئی ہے۔

معاش کی تلاش میں مرد کو کوشش کرنا ہے، اس لیے پردے کی پابندی اس پر عائد کرنا غلط ہے۔ ترقی کے اس دور میں جب کہ یورپ نے پردے کو بالکل خیر باد کہہ دیا ہوا ہے اور عورتوں کو خود ساختہ برابری کا درجہ دے دیا ہے، آج بھی وہاں معاش کی ذمے داری مرد پر ہی ہے۔ میدانِ جنگ میں لڑائی کے لیے جانا مردوں ہی کا کام ہے، اگرچہ چند عورتیں بھی کبھی یہ کام کر لیں تو اس سے یہ اصول بدل نہیں جائے گا۔ نظامِ زندگی یہی ہے کہ یہ کام مردوں کے کرنے کا ہے، اس لیے پردے کی پابندی عورتوں پر ہے۔ عورتوں کے لیے پردہ فطرت کا تقاضا ہے۔

پردے پر ایک مضحکہ خیز اعتراض:

بعض مرد پردے کے حکم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بعض پردہ دار عورتیں بھی بدمعاش ہوتی ہیں، اس لیے پردہ برائی کی راہ میں حتمی رکاوٹ نہیں ہے۔ لیکن یہ اعتراض مہمل ہے۔ یہ بالکل ایسے

ہے کہ کوئی آدمی گھر سے نکلتے وقت اپنے مکان کو تالا لگاتا ہے تو اس کا پڑوسی اعتراض کرے کہ اس طرح اس پر بے اعتمادی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ نیز تالا لگانے کی کیا ضرورت ہے، کیوں کہ بعض مقفل مکان بھی لوٹ لیے جاتے ہیں اور تالے چوری کی راہ میں حائل نہیں ہوتے۔

کیا آپ یہ تسلیم کریں گے کہ یہ دونوں اعتراض بجا ہیں؟ بالکل غلط ہیں۔ یہ تو اپنی طرف سے ایک احتیاط ہے اور ہر معاملے میں جس قدر بھی احتیاط کی جائے، نقصان کم سے کم ہوگا۔ احتیاط سے خطرہ کم ہوتا ہے۔ پردے کی بنیاد ایک پر حسنِ ظن اور دوسرے پر بدگمانی نہیں ہے۔

عورت اپنا تحفظ خود کرنے پر عام طور پر قادر نہیں ہے، اسی لیے اس پر یہ پابندی ہے کہ سفر محرم کے بغیر نہ کرے، اس کے لیے اپنی حفاظت مشکل ہے۔

زنا کی روک تھام اور اس کی سزا:

یہ تمام پابندیاں زنا کو روکنے کے لیے عائد کی گئی ہیں کہ عائلی نظام قائم رہے۔ ان تمام پابندیوں کے باوجود زنا ممکن ہے، اس لیے اس کی سخت سے سخت سزا رکھی گئی ہے۔ چار عینی شاہدوں کی موجودگی، اعترافِ گناہ یا حمل کی صورت میں یہ سزا عائد کی جائے گی۔ غیر شادی شدہ کے لیے سو (100) کوڑے کی سزا ہے۔ یہ سزا برسرِ عام دی جائے کہ لوگ عبرت پکڑیں۔ یہ ہے عائلی نظام اور نسب کو بگاڑنے کی کوشش کرنے والے کا انجام۔

زانی کو جیل بھیجنا کوئی علاج نہیں ہے۔ اسلام نے جو علاج تجویز کیا ہے، وہی اصل علاج ہے، اس سزا کے بغیر اس برائی کا کوئی سدِباب نہیں ہوسکتا۔ زنا کی سزا میں نرمی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ زنا کی حد کے جاری ہونے کے راستے میں جو حائل ہو، اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اس پر خدا، رسول اور فرشتوں کی لعنت ہو۔ اس معاملے میں کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ جس معاشرے میں بھی زنا سے چشم پوشی کی گئی اور سزا میں نرمی برتی گئی، وہاں بداخلاقی بڑھ گئی۔

سزا کے نفاذ میں نرمی کرنا ایمان کے منافی ہے:

جرم ثابت ہونے سے قبل پوری نرمی ہے، لیکن جرم ثابت ہو جائے تو سزا میں پوری سختی ہے۔ اگر خدا پر ایمان ہے تو یہ کام کرنا پڑے گا: ﴿إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ﴾ [النساء: ۵۹] ”اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر زنا کی سزا نہ دی جائے تو معاشرہ اور حکومت ایمان سے محروم ہیں۔ آیت کی ترتیب سے یہ امر بالکل ظاہر ہے: ﴿إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ ''اگر آخرت اور خدا پر ایمان ہے۔'' سزا کی شدت کو ایمان سے ملا دیا ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلامی سزائیں سخت ہیں، لیکن قرآن کا حکم پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ زنا کی سزا علیٰ رؤس الاشہاد دی جانی چاہیے۔ لڑکا ہو یا لڑکی، زانی کو کھلے میدان میں بے حجابی میں برسرِ عام یہ سزا دی جائے۔ زانی کے لیے رحم درست نہیں، بلکہ اس کو عبرت کا سامان بنانا ہے۔ یہ کوڑھ کی بیماری ہے، جسے ختم کرنا ہے۔

نسل کا تحفظ بے حد ضروری ہے، یہ تحفظ زنا کے خاتمے سے حاصل ہوسکتا ہے، اس سزا کے نفاذ کو ایمان اور بے ایمانی کا معیار قرار دیا ہے اور اس معاملے میں کمزوری کو ایمان کی کمزوری قرار دے کر اس معاملے کی اہمیت واضح کی ہے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (10 جون 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

③ اسلام کا نظامِ اخلاق

﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ③ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ④ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑤ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑥ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ⑦ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ⑧ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑨ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ⑩﴾ [النور: ۳۔۱۰]

’’زانی مرد نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ عورت ہی سے اور زانیہ عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر زانی یا مشرک مرد ہی، اور مومنوں پر یہ (زنا کار سے نکاح) حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، پھر وہ چار گواہ نہیں لاتے تو تم انھیں اسّی کوڑے مارو، اور تم ان کی شہادت (گواہی) کبھی قبول نہ کرو، اور یہی لوگ نافرمان ہیں۔ مگر اس کے بعد جن لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی، تو بلاشبہ اللہ غفور رحیم ہے۔ اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور ان کے پاس اپنے سوا کوئی گواہ نہ ہوں، تو ان میں سے ایک کی شہادت اس طرح ہو گی کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بے شک وہ

سچوں میں سے ہے۔ اور پانچویں بار یہ کہے: اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ اور عورت سے سزا کو (یہ شے) ٹالتی ہے کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بلاشبہ وہ (اس کا خاوند) جھوٹوں میں سے ہے۔ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ (اس کا خاوند) سچوں میں سے ہو تو اس (عورت) پر اللہ کا غضب ہو۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو جھوٹوں کو سزا ملتی) اور یہ کہ بلاشبہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور خوب حکمت والا ہے۔''

سابقہ آیات میں زنا کی حد اور اسے نافذ کرنے کا طریقہ بیان ہو چکا ہے۔ اب زانیہ مرد اور زانیہ عورت کے نکاح کا ذکر ہے، یعنی ان کا نکاح ہم جنسوں (زانیوں) سے ہونا چاہیے یا پھر مشرکین سے۔

قذف اور لعان:

مذکورہ بالا آیات میں دو اہم مسائل قذف اور لعان بیان ہوئے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ...﴾ جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور چار گواہ نہ لا سکیں تو ان کو اسّی درے مارو۔

اسلام نے زنا کی سزا سنگین مقرر کی ہے، تاکہ یہ معاشرے کو تباہ کر دینے والی برائی کلیتاً ختم ہو جائے۔ جہاں زنا کے الزام لگانے سے منع کیا گیا ہے، وہاں اس کی تشہیر کی بھی ممانعت ہے۔ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ بلا ثبوت اس کا چرچا کرتا پھرے۔ اس کے لیے چار عینی شاہدوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر الزام لگانے والے کے پاس چار گواہ نہیں ہوں گے تو اسے اسّی کوڑوں کی سزا دی جائے گی اور مستقبل میں کبھی کسی معاملے میں اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی:

﴿وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهٰدَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ ....﴾
[النور: ٤-٦]

زنا کی سزا چونکہ بہت سخت ہے، اس لیے اس کے بارے میں لب کشائی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ایک شخص دوسرے کو زنا میں مبتلا دیکھ لے، لیکن چار گواہوں کے نہ ہونے کی بنا پر اپنی زبان بند رکھنی چاہیے، ورنہ حدِ قذف اس پر جاری ہوگی۔ دوسرے کے معاملے میں خاموشی ممکن ہے، لیکن اگر

کوئی اپنی بیوی کو اس گناہ میں ملوث دیکھ لے تو اس کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خاموش رہ سکے اور اس کے ساتھ پرسکون زندگی گزار سکے۔

سببِ نزول:

ایک صحابی ہلال بن امیہ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگایا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کا ثبوت بہم پہنچاؤ، ورنہ تم پر حدِ قذف لگائی جائے گی۔ ہلال بن امیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ ایسا حکم نازل کرے گا جس سے ان کی پیٹھ بچ جائے گی۔ یہ آیات اس موقع ہی پر نازل ہوئیں۔[1]

لعان میں قسم:

ایک عام قاعدہ ہے کہ جس معاملے کا آپس میں فریقین باہمی گفتگو سے کوئی تصفیہ نہ کر سکیں اور نہ کوئی عدالت یا پنچایت اس معاملے کو حل کر سکے تو آخری چارہ کار کے طور پر معاملہ قسم ہی سے طے ہوتا ہے۔ اسی طرح اس معاملے کا حل بھی قسم ہی قرار دیا گیا ہے۔

ایک صحابی نے کہا: اگر میں اپنی بیوی پر تہمت لگاتا ہوں تو آپ اسّی درے کی سزا مجھے دیں گے اور اگر اس کو میں بتقاضائے غیرت قتل کر دوں تو آپ مجھے قتل کر دیں گے اور اگر خاموش رہتا ہوں تو بے غیرتی اور دیوثی ہے، اسی الجھن کا حل ''لعان'' ہے۔ مرد اگر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو چار گواہ پیش کرے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو قسم اٹھائے۔

عام دستور ہے کہ مدعی ایک دعویٰ کرتا ہے اور اس دعوے میں اگر فیصلہ قسم پر ہی آجائے تو قسم مدعی نہیں، بلکہ مدعا علیہ اٹھائے گا، لیکن یہاں مدعی خود حلف اٹھاتا ہے۔ مدعی چار مرتبہ خدا کی قسم اٹھا کر کہے کہ میں سچا ہوں۔ یہ چار قسمیں بمنزلہ چار گواہ ہوں گی اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔

مدعی جب ایسا کر چکے تو حدِ قذف اس سے ختم ہو جائے گی اور اس کے جواب میں مدعا علیہ اگر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٤٧)

اقرار کرے یا انکار چھوڑ دے تو زنا کی سزا اس کو دی جائے گی، لیکن اگر وہ بدستور انکار کرتی رہے تو چار مرتبہ خدا کی قسم کھا کر یہ کہے گی کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو، اگر یہ سچا ہو۔

لعان کرنے والوں میں تفریق:

اب ان دونوں کا نکاح خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ لعان کرنے والوں کے درمیان تفریق کر دیا کرتے تھے اور اس کے بعد پھر کبھی دوبارہ ان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

شریعت نے اس طرح سچ اور جھوٹ کو الگ الگ کر دیا ہے۔غور کیجیے کہ اسلام کو بدکاری اور بدکاری کے چرچے سے کس قدر نفرت ہے۔ انسانی غیرت کے تقاضے کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، بلکہ دیوثی کو ختم کیا ہے اور غیرت کو پورا تحفظ دیا گیا ہے۔شریعت کا قانون ناقص نہیں ہے۔ اس میں ضرورت اور احوال کے ہر پہلو کا لحاظ کیا گیا ہے اور ہر مشکل کا حل موجود ہے۔

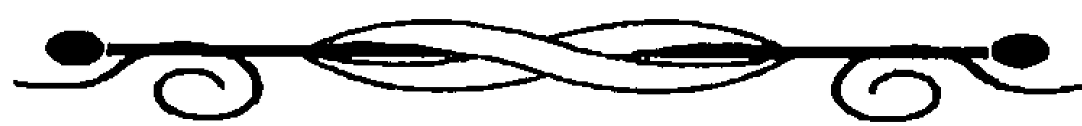
بعض لوگ اپنی بے علمی اور کم مائیگی سے یہ بات کہتے ہیں کہ اس دور میں تو اسلام کا قانون چل نہیں سکتا۔

دیوثی سے نجات:

﴿ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ ﴾ [النساء: ٨٣] یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے دیوثی میں مبتلا ہونے سے بچایا۔ رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''دیوث جنت میں نہیں جائے گا۔''[1]

بیوی بدکار ہو اور خاوند کو اس کا علم ہو، یا گھر میں بدکاری ہوتی ہو اور اس کو علم ہو اور وہ خاموش رہے اور چشم پوشی کرے تو ایسا شخص دیوث ہے۔

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠﴾ ﴾ توبہ کے دروازے ہر آن کھلے ہیں اور اللہ تعالیٰ حکمتوں کا جاننے والا ہے۔[2]



[1] مسند أحمد، رقم الحديث (٦١٨٠)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (17 جون 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

④ اسلام کا نظامِ اخلاق

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ [النور: ۱۱]

''بے شک جو لوگ (ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر) بہتان گھڑ لائے وہ تمھی میں سے ایک گروہ ہیں، تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، ان میں سے ہر شخص کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جو اس نے کمایا، اور ان میں سے وہ شخص جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اٹھایا، اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

ربطِ آیات:

سورت نور کا جو حصہ اس سے پہلے گزر چکا ہے، اس میں موزوں ترین الفاظ میں زنا کی مذمت کی گئی ہے۔ نیز اس میں بداَخلاقی کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس علت کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں اور انھیں کس طرح روکا جا سکتا ہے؟ جب معاشرے میں بدکاری عام ہو جائے تو اس کا حل کیا ہے اور جب گھروں میں اس طرح کے واقعات رونما ہونا شروع ہو جائیں تو ان کا تدراک کیسے کیا جا سکتا ہے؟

واقعۂ افک:

اس کے بعد مندرجہ بالا آیت میں ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے، جس کا تعلق خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے۔

''افک'' کے لفظی معنی الٹ دینا، یا حالت بدل دینا کے ہیں۔ جھوٹ میں بھی زبان کی مدد سے حقیقت کو بدل دیا جاتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مقام:

رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھروں کا ماحول اتنا پاکیزہ تھا کہ ان میں بدکاری کے راہ پانے کا سرے سے کوئی موقع نہ تھا۔ ازواجِ مطہرات میں سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مقام بلند وارفع ہے۔ تقدیس اور پاکیزگی کے لحاظ سے بھی اور علم وفن کے لحاظ سے بھی۔

علمِ دین کی اشاعت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جو حصہ ہے، اس میں ان کا کوئی مدِمقابل نہیں۔ عورتوں کے خصوصی مسائل میں ان کا مقام منفرد ہے، یہاں تک کہ فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی طرف مسائل کے لیے رجوع کرتے تھے۔ اگر ایسی مقدس ذات کے بارے میں بدگمانی کی جائے تو گردنیں شرم کے مارے جھک جاتی ہیں۔

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی ایک مثالی زندگی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسلام کے لیے ہر تکلیف کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ مالی ایثار میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اخلاقی اعتبار سے بھی آپ بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ خلافت پر فائز ہوئے تو ایک مثال قائم کر دی۔ اب ایسے بندگانِ خدا کے گھر میں بدکاری کا امکان تو کجا وہم بھی نہیں ہوسکتا۔

پسِ منظر:

5،6 ھ میں ایک لشکر بنی مصطلق کے مقابلے کے لیے گیا۔ یہ مقام مدینے سے قریب ہے، اس لیے منافقین کی ایک بہت بڑی کھیپ ان میں شامل ہوگئی۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بھی ان میں شریک تھا۔

منافقین حسبِ دستور پوری کوشش میں رہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیں۔ اس کا ذکر سورت منافقون میں موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ نے غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ وہاں سے صبح سویرے آپ نے لشکر کو روانگی کا حکم دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رفع حاجت کے لیے باہر گئی ہوئی تھیں۔ جہاں آپ کے گلے سے ہار ٹوٹ کر گر گیا، جسے تلاش کرنے میں آپ رضی اللہ عنہا کو دیر ہوگئی اور آپ رضی اللہ عنہا کی واپسی سے قبل قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا وزن چونکہ بہت ہلکا تھا، لہٰذا ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھنے والوں کو یہ احساس نہ ہوا کہ ہودج خالی ہے۔ صرف ایک صحابی صفوان بن معطل سلمی رضی اللہ عنہ جن کے ذمے فوج کی گری پڑی اشیاء سنبھالنا تھا، وہاں موجود تھے۔ پردے کے احکام نازل ہونے سے پہلے صفوان رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پہچان لیا اور اونٹ قریب لا کر بٹھا دیا، جس پر آپ رضی اللہ عنہا سوار ہو گئیں۔

صفوان اپنی سواری لے کر چل دیے اور قافلے میں جا ملے، جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عدمِ موجودگی سے بے خبر ایک جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔

اس سواری کو دیکھتے ہی منافقین نے بہتان طرازی شروع کر دی، جس کا سلسلہ ان آیات کے نزول تک چلتا رہا۔ ان آیات کے نازل ہونے سے قبل پورا ایک مہینا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بے حد ذہنی اذیت میں مبتلا رہے۔ اس سفر سے واپسی کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فوراً بیمار ہو گئیں اور انھیں مطلق پتا نہ تھا کہ باہر کون سا ہنگامہ بپا ہے۔

علمِ غیب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے اس معاملے میں مشورہ کیا اور لونڈی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق تحقیق کی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شہادت لی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے سوکن ہونے کے باوجود انھیں بے عیب قرار دیا اور اس بہتان کی تردید کی۔

یہاں ان لوگوں کو سوچنا چاہیے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف علمِ غیب منسوب کرتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک عالم الغیب اپنی بیوی کے بارے میں دوسروں سے گواہی لے، تحقیقات کرے اور منافقین کو باتیں بنانے کا موقع فراہم کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیب کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی علمِ غیب ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ اس قدر طول نہ پکڑتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً ہی اس افتراء کی تردید کر دیتے۔

﴿ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ﴾ وہ گروہ جس نے ان افواہوں کو پھیلانے میں حصہ لیا، حسبِ ذیل لوگوں پر مشتمل تھا: مسلمانوں میں سے حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہم۔ منافقین میں سے زید بن رفاعہ اور عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین۔

واقعۂ افک کے فوائد وثمرات:

واقعۂ افک کی وجہ سے مسلمان بے حد اذیت اور مصیبت میں مبتلا رہے، لیکن اس واقعے سے بے شمار اخلاقی فوائد حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو برائیوں سے بچانے کے لیے اور ان کی اشاعت روکنے کے لیے واضح احکام نازل فرمائے۔ چنانچہ اس واقعے کے متعلق فرمایا ہے: ﴿ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ ''بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے۔'' عبداللہ بن اُبی ہی اس جھوٹ کو گھڑنے اور بڑھانے والا تھا، اس لیے: ﴿ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۱ ﴾ کا مصداق بھی وہی ہے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (24 جون 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

⑤ اسلام کا نظامِ اَخلاق

﴿ لَوۡ لَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡہُ ظَنَّ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتُ بِاَنۡفُسِہِمۡ خَیۡرًا ۙ وَّ قَالُوۡا ہٰذَاۤ اِفۡکٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۲﴾ لَوۡ لَا جَآءُوۡ عَلَیۡہِ بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ ۚ فَاِذۡ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِالشُّہَدَآءِ فَاُولٰٓئِکَ عِنۡدَ اللّٰہِ ہُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ رَحۡمَتُہٗ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ لَمَسَّکُمۡ فِیۡ مَاۤ اَفَضۡتُمۡ فِیۡہِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۴﴾ اِذۡ تَلَقَّوۡنَہٗ بِاَلۡسِنَتِکُمۡ وَ تَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاہِکُمۡ مَّا لَیۡسَ لَکُمۡ بِہٖ عِلۡمٌ وَّ تَحۡسَبُوۡنَہٗ ہَیِّنًا ٭ۖ وَّ ہُوَ عِنۡدَ اللّٰہِ عَظِیۡمٌ ﴿۱۵﴾ ﴾ [النور: ۱۲-۱۵]

’’جب تم نے یہ (جھوٹ) سنا تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔ وہ اس (الزام) پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ پھر جب وہ گواہ نہیں لائے تو وہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔ اور اگر تم پر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم جن باتوں میں پڑ گئے تھے اس پر تمھیں بہت بڑا عذاب آ لیتا۔ جب تم اسے ایک دوسرے سے اپنی زبانوں کے ساتھ لیتے تھے اور اپنے مونہوں سے (وہ بات) کہہ رہے تھے جس کا تمھیں علم نہ تھا اور تم اسے معمولی سمجھ رہے تھے، جبکہ وہ اللہ کے ہاں بہت بڑی بات ہے۔‘‘

بہتان کی سزا:

منافقین نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے اس قصۂ افک کو گھڑا۔اور پھر اس کی نشر و اشاعت کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اس الزام تراشی کی مہم میں منافقین کے علاوہ تین سادہ لوح مسلمان بھی شامل ہو گئے، جنھیں بعد میں حد لگائی گئی۔ عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین کے بارے میں کسی واضح

حدیث سے ثابت نہیں ہوتا کہ اسے حد لگی ہو، اور یہ حد کیوں نہ لگی؟ اس میں مصلحت تھی اور پھر حق والوں (رسولِ اکرم ﷺ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) نے بھی اس کا کوئی مطالبہ نہ کیا، بلکہ معاف کر دیا۔

حسنِ ظن کی تلقین:

ان آیات کو ﴿ لَوْ لَآ ﴾ کے الفاظ سے شروع کیا ہے جو تاسف اور افسوس کے اظہار کے لیے ہوتے ہیں۔ ایسے واقعے کے بارے میں افسوس اور خواہش کا اظہار کیا جا رہا ہے، جو وقوع پذیر ہو چکا ہے کہ مومن مرد اور مومن عورتوں کو خود اپنے ہی بارے میں اچھا گمان کیوں نہ ہوا۔ (کیوں کہ تمام مومنین کی مثال ایک جان کی ہے) اور کیوں نہ اس بہتان کے بارے سنتے ہی انھوں نے کہہ دیا: ﴿ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ⑫ ﴾ ''یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے۔'' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عصمت و عزت خود مسلمانوں کی اپنی عصمت و عزت تھی، اس لیے اس الزام کو سنتے ہی انھیں اس کی تردید کر دینی چاہیے تھی۔ یہ الزام اس قابل نہ تھا کہ اس پر غور بھی کیا جاتا۔

عام مسلمان تو یہ سن کر خاموش رہے کہ چونکہ یہ معاملہ نبی کریم ﷺ کے گھر کا ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ کی طرف سے کوئی بیان جاری ہو، لیکن نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس بنا پر خاموش رہے کہ ہم اس کی تردید کیا کریں، کیوں کہ ایک خاوند کی بیوی کے حق میں اور ایک والد کی اپنی بیٹی کے بارے میں شہادت زیادہ وزن نہیں رکھتی، اس صورتِ حال پر ہی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ایسا الزام سنتے ہی فوراً تردید ہو جانی چاہیے تھی اور اس فتنے کے سر اٹھانے سے پیشتر اسے کچل دینا چاہیے تھا۔

الزام تراشی کی مذمت:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمارے معاشرے کو جو برائیاں گھن کی طرح کھا رہی ہیں، ان میں الزام تراشی سرِفہرست ہے۔ زنا اور بد اخلاقی کے معاملات کو تو بہت ہی معمولی چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ نہایت آسانی سے اٹکل پچو ہی سے ایسے الزام مڈھ دیے جاتے ہیں اور کسی تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے جس انداز سے اس کی مذمت فرمائی ہے، اس میں ہمارے لیے سامانِ عبرت ہے۔

قانونِ الٰہی اور اس کی خصوصیات:

﴿ لَوۡ لَا جَآءُوۡ عَلَيۡهِ بِاَرۡبَعَةِ .... ﴾: حکومت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک جس کے قانون کی بنیاد آسمانی ہدایات پر ہوتی ہے، دوسری وہ جس کے قانون کی بنیاد خود اس کی اپنی مرضی پر ہوتی ہے۔ ہر حکومت میں قانون کی ضرورت ہے، لیکن ان میں سے ایک کے اندر زیادہ انحصار اخلاق کی پاکیزگی پر ہے۔ قانون اس وقت حرکت میں آتا ہے جب ضمائر مردہ ہو جائیں اور وہ انسان کو اپنے کیے پر ملامت نہ کریں۔ انسان مختلف النوع مزاج کا حامل ہے۔ بعض فطری طور پر ہی صالح ہوتے ہیں اور کسی حالت میں بھی راستی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ اپنے ضمیر ہی کی آواز پر تمام امور انجام دیتے ہیں۔ آسمانی قانون زیادہ تر دل اور ضمیر سے اپیل کرتا ہے۔

دل اگر مطمئن ہو جائے تو کسی قانون کی مدد کے بغیر ہی اخلاق درست ہو جاتے ہیں، لیکن کچھ لوگ قانون ہی کی زبان سمجھتے ہیں، وہ حکومت کے ڈر اور طاقت ہی سے خائف رہ کر درست رہ سکتے ہیں، اس آیت میں ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جن میں جذبۂ ندامت ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید نے تہمتِ زنا اور زنا سے روکنے کے لیے اخلاق پر زور دیا ہے۔ تہمتِ زنا کے بارے میں چار گواہ پیش کرنے چاہئیں، یا پھر خاموشی اختیار کی جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا کہ ان لوگوں کا چار گواہ نہ لانا اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ان کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے۔

جھوٹ اور زبان کی بے احتیاطی:

﴿ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰهِ ... ﴾: اس معاملے میں اللہ کی رحمت اور اس کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو مسلمان عذاب میں مبتلا ہو جاتے۔ اس باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کتنا مبنی برحقیقت ہے: ((كَفىٰ بِالۡمَرۡءِ كَذِباً أَنۡ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ))[1] یعنی جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ آدمی ہر سنی ہوئی بات کو آگے نقل کرتا پھرے اور بیان کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کی تکلیف گوارا ہی نہ کرے۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ زبان کی بے احتیاطی انسان کو منہ کے بل جہنم میں گرائے گی۔[2]

ایک اور حدیث میں زبان کی درستی پر جنت کی خوش خبری دی گئی ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٠٨)

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ))[1]

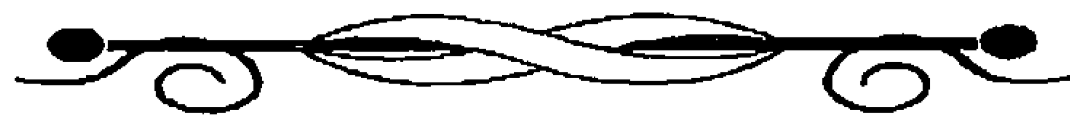
''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔''

جھوٹی خبر کی اشاعت کی مذمت:

بغیر تحقیق کے کسی خبر کی اشاعت سے پرہیز کرنا چاہیے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا ﴾ [الحجرات: ٦]

''اے ایمان والو! اگر کوئی نافرمان تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو۔''

اور جب یہ خبر پھیلانے اور سنانے والا فاسق ہو تو سننے والے کی ذمے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ زبان کی بے احتیاطی سے سختی سے روکا گیا ہے۔ قطعی علم کے بغیر زبان کو حرکت میں نہیں لانا چاہیے۔ ﴿ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ زبان سے وہی بات نکلنی چاہیے جس کے بارے میں پوری معلومات ہوں اور جب معاملہ کسی کی عزت و عصمت کا ہو تو اس جرم کی سنگینی اور بھی بڑھ جاتی ہے، اس بات کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی بہت اہمیت ہے۔ ﴿ وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿15﴾ ﴾[2]



---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (1 جولائی 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

⑥ اسلام کا نظامِ اخلاق

﴿وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿16﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿17﴾ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿18﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿19﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿20﴾﴾ [النور: ١٦-٢٠]

”اور جب تم نے اسے سنا تھا تو کیوں نہ کہا: یہ ہمارے لائق نہیں کہ ہم اس کے متعلق بولیں (یا اللہ!) تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو دوبارہ کبھی اس جیسی بات نہ کرنا۔ اور اللہ تمھارے لیے (اپنی) آیات بیان کرتا ہے، اور اللہ بڑا جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔ بے شک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو اللہ بہتان لگانے والوں کو فوراً عذاب دیتا) اور یہ کہ بلاشبہ اللہ نہایت شفقت کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔“

غیبت اور بہتان کا تذکرہ:

جب کسی شخص میں کوئی عیب ہو اور اس عیب کا تذکرہ اس کی غیر موجودگی میں کیا جائے تو یہ غیبت ہے اور اگر یہ عیب اس میں نہیں تو یہ بہتان ہے۔ بہتان کے عام تذکرے سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے روکا ہے۔ اگر چار گواہ موجود ہوں تو اس کا ذکر شرعی عدالت کے سامنے کرنا چاہیے، تاکہ مجرم کو سزا

دی جا سکے۔ اگر ایسا نظام ہو کہ شرعی عدالت نہ ہو تو اس صورت میں برادری کے معتبر بزرگوں کے سامنے اصلاح کی غرض سے اس کا ذکر کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ زنا کے الزام پر عام گفتگو اور بہتان کا چرچا کرنا بے حد غلط ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''کیوں نہ اس بہتان کے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ یہ زیب ہی نہیں کہ ایسی بات زبان سے نکالیں۔ سبحان اللہ یہ تو ایک بڑا بہتان ہے''

معاشرے کے اندر زنا کا تذکرہ اور بہتان طرازی کی کثرت، اخلاق کے لیے سخت تباہ کن ہے، اس سے زنا کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور فحاشی کو عروج، چنانچہ کہا ہے: ﴿ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ﴾ قیاس، قیافہ اور قرائن کی بنیاد پر فحاشی کا ذکر غلط ہے۔ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ غلطی ہوئی تھی، ان کو سزا دی گئی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان قائم کرنے والوں پر اسّی کوڑے فی کس مارے گئے تھے اور منافقین کے ساتھ ان میں دو تین مسلمان بھی تھے۔

تنقیصِ عائشہ رضی اللہ عنہا ایمان کی ضد ہے:

﴿ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ [النور: ١٧]

''اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو دوبارہ کبھی اس جیسی بات نہ کرنا۔''

تنقیصِ عائشہ رضی اللہ عنہا ایمان کی ضد ہے: ﴿ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا ﴾ اس کا اعادہ پھر نہیں ہونا چاہیے۔ علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ جو شخص، فرقہ یا جماعت اس براءت کے نزول کے بعد بھی بہتان طرازی کرے، اس کے کفر میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر عیب لگانا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کا ثبوت مانگنا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء دینا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء رسانی سے سختی سے روکا گیا ہے:

﴿ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ۚ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۚ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾ [التوبة: ٦١]

''اور ان (منافقوں) میں سے بعض وہ ہیں جو نبی کو تکلیف دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ (تو صرف) کان ہے۔ (ہر ایک کی سن اور مان لیتا ہے) آپ کہہ دیجیے: وہ تمھارے

لیے خیر کا کان ہے، وہ اللہ پر یقین رکھتا ہے اور مومنوں (کی باتوں) پر یقین رکھتا ہے، اور تم میں سے جو ایمان لائے ان کے لیے رحمت ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

فحاشی کا فروغ:

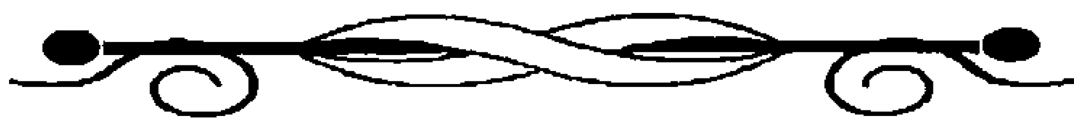
﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفٰحِشَةُ ... ﴾: ایمان والوں میں فواحش کی اشاعت کرنے والے مجرم ہیں۔ ان لوگوں کو سخت سزا ملنی چاہیے۔ زبان وقلم سے بے حیائی پھیلانا، بداخلاقی اور بے حیائی کے جذبات کو ابھارنے والے شعر اور کہانیاں، گانے اور فحش تصاویر اس ضمن میں آتے ہیں۔ بداخلاقی کے اڈے، جنسی لٹریچر اور قحبہ خانے وغیرہ سب فحاشی کے فروغ کے ضمن میں آتے ہیں۔ ایسے کام کرنے والوں کو آخرت میں تو سزا اللہ تعالیٰ دیں گے ہی، لیکن اس دنیا میں بھی ان کو اس جرم سے روکنا ضروری ہے اور اس کے ارتکاب پر سزا دینی چاہیے۔

اسلامی حکومت کا فریضہ:

﴿ فِي الدُّنْيَا ... ﴾: حکومت اور خاص طور پر ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اشاعتِ فواحش کو روکے اور اس کے لیے سزا مقرر کرے اور ان جرائم کو قابلِ دست اندازی پولیس قرار دے۔ فحاشی کی دعوت دینا اور عمل کرنا، اس معاملے میں معاونت کرنا اور فحاشی کے معاملے میں مداہنت اور خاموشی اختیار کرنا گناہ ہے، جس کے لیے عذابِ الیم کی بشارت دی گئی ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ زنا پھیلے تو وبائی امراض پھوٹتے ہیں اور اگر ناپ تول میں کمی کی جائے تو اس کی سزا قحط کی صورت میں دی جاتی ہے۔[1]

﴿ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ ... ﴾: یہ جرم اس قدر بڑا تھا کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو مسلمان بھی نہ بچتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان طرازی کس قدر سنگین ہے، اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ اب بھی اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، ان کی سزا عذابِ الیم کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے؟![2]



① سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (٤٠١٩)

② ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (8 جولائی 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

⑦ اسلام کا نظامِ اخلاق

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ‌ؕ وَمَنۡ يَّتَّبِعۡ خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنۡكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰـكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۝21﴾
[النور: ٢١]

''اے ایمان والو! تم شیطان کے قدموں کی اتباع نہ کرو، اور جو کوئی شیطان کے قدموں کی اتباع کرتا ہے تو بلاشبہ وہ (شیطان) تو بے حیائی اور برے کام ہی کا حکم دیتا ہے، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی ایک کبھی پاک نہ ہوتا، لیکن اللہ جسے چاہے پاک کرتا ہے، اور اللہ خوب سننے والا، بڑا جاننے والا ہے۔''

﴿خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ‌ؕ﴾:

غزوۂ بنی مصطلق سے واپس آتے ہوئے منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی براءت کے لیے اٹھارہ آیات نازل فرمائیں۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں تو بس یہی سمجھتی تھی کہ نبی کریم ﷺ کو خواب میں میری پاک دامنی بتلا دی جائے گی، لیکن یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے متعلق قرآن کی اتنی آیات نازل فرما دیں گے۔[1]

اللہ تعالیٰ کے لیے یہ معاملہ بہت زیادہ اہم تھا، اسی لیے پوری اٹھارہ آیات نازل کر کے اس واقعے کے تمام پہلوؤں پر بحث کی۔ یہ تفصیل اس لیے بھی بیان کرنے کی ضرورت تھی کہ متاثر لوگوں کے اَذہان صاف ہو جائیں۔ منافقین نے اس قصے کو شرارتاً شروع کیا تھا، لیکن کچھ سادہ لوح مسلمان بھی اس میں شریک ہو گئے۔ اسی صورتِ حال کو قرآنِ مجید نے شیطان کے قدموں پر چلنا کہا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٦١)

ہے: ﴿ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ﴾ ''شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو۔''

''خطوات'' ''خطوۃ'' کی جمع ہے، جس سے مراد چلتے ہوئے دونوں پاؤں کے درمیان کی جگہ ہے۔ یعنی پوری پوری پیروی کرنا۔ یہاں خطاب عام لوگوں سے ہے کہ عادات و خصائل اور قول و فعل میں شیطان کی پیروی نہ کرو۔

فحشاء اور منکر:

اب یہ کیسے معلوم ہو کہ شیطان کی پیروی کس سے تعبیر ہے؟ اس کی تصریح بھی قرآن مجید نے خود ہی کر دی ہے: ﴿ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾

1. فحشاء: بے حیائی اور بداخلاقی کے راستے اختیار کرنا فحش ہے۔
2. منکر: ایسا کام ہے جو معروف کے خلاف ہو۔ دستورِ عامہ کے منافی ہو۔ اسلام کے عام برتاؤ کے مطابق نہ ہو، انسانیت کے چلن کے خلاف ہو۔ اب جو شخص منکر یا فحش کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ دراصل شیطان کی پیروی کرتا ہے۔

فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان یادِ الٰہی میں مشغول رہے، لیکن اگر کوئی ایسے دوست کے پاس بیٹھے جو اسے اس کارِ خیر سے غافل کر دے تو وہ دوست معناً شیطان ہے۔

﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۷] میاں بیوی ایک دوسرے کا پردہ اور لباس ہیں، لیکن اگر بیوی خاوند سے غلط سلوک کرے، یا خاوند اس سے بدسلوکی کا مظاہرہ کرے تو یہ متعارف دستور کے خلاف ہے اور یہ منکر ہے۔ میاں اور بیوی میں تو الفت و محبت اور مؤدت و رحمت ہونی چاہیے۔ ﴿ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ﴾ [الروم: ۲۱] اب جو مجلس، دوست یا رشتے دار اس جذبے کو ہلکا کرے یا سرے سے ختم کرنا چاہے تو یہ کام منکر کی تعریف میں آئے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے معاملے میں بھی یہی صورتِ حال ہوئی کہ یہ منکر مدینہ میں عام ہو گیا اور اس کو شیطان کی پیروی کہا گیا۔

فحشاء کی تعریف:

زبان و سماعت کا فحش ہے، نیز زنا بھی اسی کے ذیل میں آتا ہے۔ آج کل کے ماحول میں

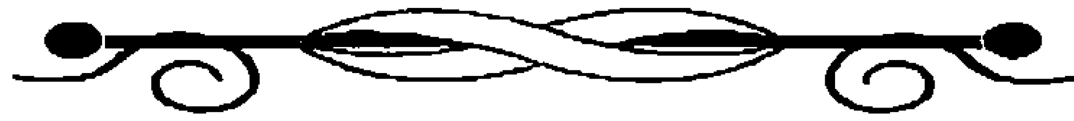
سینما، تھیٹر، آرٹ کونسلیں، ناچ گھر، نام نہاد ثقافتی سرگرمیاں، گندہ اور فحش لٹریچر، زنا کی دعوت اور رغبت دلانے والے اخبارات و رسائل، عورتوں پر آوازے کسنا اور ان کا تعاقب کرنا، جیسا کہ دستور چل نکلا ہے، یہ سب فحش اور منکر ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے اندر ایک ایسا طبقہ بھی معرضِ وجود میں آ چکا ہے جو ان چیزوں کو کھیل اور تماشے سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔ ان غلط افعال کی حمایت کرتا ہے خصوصاً سینما کو ترقی کا مظہر قرار دیتا ہے، حالانکہ ان کے منکر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

﴿ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ ﴾: اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہوسکتا۔

ان آیات کے نزول پر وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنھوں نے جزوی طور پر بھی کوئی حصہ لیا، یا ذہن میں کوئی غلط خیال لائے تھے، سب نے توبہ کی۔ ہر ایک نے اپنا محاسبہ کیا۔ نیکی کے لیے توفیق اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے۔

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۱ ﴾: کیا اللہ ایسے ہی جسے چاہتا ہے نیکی کی توفیق دے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے برائی کی جانب دھکیل دیتا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ﴿ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ ﴾ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ توفیق اندھا دھند اور بے سمجھے سوچے عطا کی جاتی ہے۔ یہ امر علم پر مبنی ہے۔ وہ ﴿ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ خوب جانتا ہے کہ کس کس میں طلبِ صادق موجود ہے۔ اسی علم کی بنا پر یہ توفیق ارزانی کی جاتی ہے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (15 جولائی 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخلاقِ الٰہی سے اپنے آپ کو مزین کیجیے

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿22﴾﴾ [النور: ٢٢]

''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

دو گروہ:

عموماً ہر معاشرے میں اخلاق و کردار کے لحاظ سے دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں: ایک گروہ تو وہ ہے جن کی زندگی آوارگی، غلط کاری، بے پروائی، بے غیرتی اور فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک نیک و بد کا امتیاز اٹھ جاتا ہے، وہ انسان نما حیوان ہوتے ہیں، ان کی زندگی کا کوئی اصول و ضابطہ نہیں ہوتا۔ ان کے گھر اور باہر کا نقشہ انھی چیزوں کا پتا دیتا ہے۔

دوسرا گروہ جو مجسمہ شرافت و پاکبازی ہوتا ہے، برائی اور بداخلاقی سے کلیتًا اجتناب کرتا ہے اور ان چیزوں کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتا۔ گناہ میں ملوث ہونا تو کجا رہا، یہ طبقہ برائی کو سننے کا روادار نہیں اور ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے گوش فحش اور بے حیائی کی بھنک سے بھی محفوظ رہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں شرافت اور پاکیزگی کی مثالیں:

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی دونوں قسم کے لوگ تھے، جیسا کہ تاریخ سے پتا چلتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت کو عموماً برائی اور بداخلاقی سے منسوب کیا جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ جاہلیت میں بھی پاکباز لوگ موجود تھے، ان میں ایسے افراد بھی تھے جن کی غیرت وحمیت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ فواحش سے مجتنب تھے۔ سچ بولنا، معاملے میں کھرا ہونا اور اس طرح کے دوسرے محاسن تھے جن سے وہ آراستہ تھے۔

قریش کی لڑکیاں عام طور پر عفیف اور پاکباز ہوتی تھیں۔ اسلام نے اس پاکبازی کو قائم رکھنے، نسل و قبیلے کی تقدیس کے لیے اور معاشرے کے تحفظ کے لیے بہت سے قانون دیے۔ سورت نور میں ان قوانین کا بیشتر حصہ بیان ہوا ہے جو واقعۂ افک کے سلسلے میں مذکور ہے۔

واقعۂ افک کے ذمے داران:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت آ جانے کے بعد جن لوگوں کو اس بہتانِ عظیم کے پھیلانے کے سلسلے میں سزا دی گئی، ان میں حسان، مسطح اور حمنہ رضی اللہ عنہم کی سزا کا ذکر واضح طور پر احادیث میں ملتا ہے۔ عبداللہ بن اُبی جو اس واقعے کا محرک تھا، اس کی سزا کا کوئی ذکر نہیں۔ ((اَلْحُدُوْدُ كَفَّارَةٌ))[1] کے مطابق (جس پر حد لگائی جائے اس کے لیے وہ کفارہ بن جاتی ہے) چونکہ بوجہ نفاق عبداللہ بن ابی کو پاک کرنا مقصود نہ تھا، اس لیے اس پر حد نہ لگائی گئی۔ زید بن رفاعہ منافق بھی اس میں شامل تھا، لیکن اس نے عبداللہ بن اُبی کی طرح اس معاملے میں زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی، اس لیے اسے چھوڑ دیا گیا۔[2]

شانِ نزول:

جن تین مسلمانوں کو حدِ قذف، یعنی اسّی دُرے لگائے گئے، ان میں ایک مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ تھے، جو صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمیشہ ان کی مالی اعانت کرتے، کیوں کہ ان کا خرچ عام طور پر ان کی آمدنی سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ مسطح نے اس بہتان طرازی میں پورا حصہ لیا تھا۔ جب براءت کی آیات نازل ہوئیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھا لی کہ وہ آیندہ مسطح کی مالی امداد بالکل نہیں کریں گے کہ اس نے تو رشتے داری کا پاس کیا اور نہ مالی امداد کا کچھ لحاظ، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٩)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسير ابن كثير (٢٨/٦)

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢﴾﴾ [النور: ٢٢]

فضل سے مراد مال ہے۔ حلال مال ہو تو یہ اس کا فضل ہے، اگر حرام ہو تو یہ جیفہ (مردار) ہے۔ یہاں اولوا الفضل سے مراد مال والے اصحابِ فضیلت ہیں۔ ﴿وَالسَّعَةِ﴾: کا معنی ''وسعت و کشایش'' ہے۔

① اولی القربیٰ:

رشتے داروں میں سے جو لوگ مستحق ہوں، سب سے پہلے ان کی مدد کرنی چاہیے۔ یہاں یہ امر یاد رہے کہ معصیت کے لیے مدد نہیں کی جانی چاہیے۔ مالی امداد اگر برے آدمی کی برائی میں ممد و معاون ہو تو ایسی مدد بند کر دینی چاہیے۔ اچھے اور نیک آدمیوں کی مدد کرنی چاہیے:

«لَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ»[1] ''تیرا دستر خوان متقی کے لیے بچھے۔''

لیکن کسی معاملے میں ناراضی اور رنجش کی بنا پر قریبی رشتے داروں کی امداد بند نہ کرنی چاہیے۔ قرابت داروں سے اگر کچھ ایذاء بھی پہنچے تو ان کو محروم کرنا درست نہیں۔ اس آیت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے: ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا﴾ قرابت داروں کی غلطیوں سے چشم پوشی کرنی چاہیے، انھیں معاف کر کے ان کی غلطیوں سے درگزر کرنا چاہیے۔

② مساکین:

کھلا مانگت جو ہر دروازے پر جا کر سوال کرنے والا ہو، مسکین نہیں ہوتا۔ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا، لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ آمدنی کم ہے اور خرچ زیادہ۔

③ مہاجر فی سبیل اللہ:

اسلام کی محبت کی وجہ سے مکہ سے مدینہ آنے والے۔

حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قرابت دار بھی تھے، مسکین بھی تھے اور مہاجر بھی،

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٣٢)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیت: ﴿ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ [النور: ۲۲] ''کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے۔'' سنی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ فوراً بولے: "بَلىٰ وَاللّٰهِ إِنَّا نُحِبُّ أَنْ يَغْفِرَلَنَا رَبُّنَا" [1] ''خدا کی قسم! ہم ضرور چاہتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں معاف کر دے۔''

رحم دلی اور درگزر کی تلقین:

دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کوئی غلطی نہ ہوئی ہو۔ ہم اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی بھی کر بیٹھتے ہیں اور نافرمانی بھی، لیکن خدا تعالیٰ کا ہمارے ساتھ کیا سلوک ہے۔ وہ ہمیں بلا روک ٹوک رزق دے رہا ہے۔

کسی کے بُرے سلوک کی وجہ سے اس کی امداد سے ہاتھ کھینچنا غلط ہے۔ ہر حال میں احسان کرنا چاہیے۔ اخلاقی برتری اسی میں ہے کہ غلط اور برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کیا جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر اپنی ذات کا کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ ایک حدیث میں ہے: ((اِرْحَمُوْا مَنْ فِيْ الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِيْ السَّمَاءِ)) [2] تم دنیا والوں پر رحم کرو، خدا تم پر مہربان ہوگا۔

ان آیات کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسطح رضی اللہ عنہ کی امداد پھر شروع کر دی اور پہلے سے بڑھ چڑھ کر۔

﴿ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾:

غلطی سے کون محفوظ ہے کہ اس سے عمر بھر کوئی گناہ نہ ہو۔ معاف کر دینا انتقام لینے سے بہتر ہے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بھی معاملے کی تشہیر میں حصہ لیا تھا۔ آخری عمر میں جب نابینا ہو گئے تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عفت اور پاک دامنی کے متعلق بے مثال اشعار کہے۔ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو آپ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ ان سے اگر یہ غلطی ہوئی ہے تو کیا ہوا، انھوں نے کفار کے مقابلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں بہت سے اشعار کہے ہیں۔ [3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٥٧)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٢٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٨٨)

ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (22 جولائی 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تہمت لگانے کی حرمت و شناعت

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَٰتِ الْغَٰفِلَٰتِ الْمُؤْمِنَٰتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿23﴾ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿24﴾﴾ [النور: ٢٣،٢٤]

''بلاشبہ جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی، اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر ان کے خلاف، ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔''

رمی:

اینٹ یا پتھر پھینکنا یا ڈھیلا مارنا۔ الفاظ کی رمی سے مراد یہ ہے کہ بلا سوچے سمجھے باتیں بنائی جائیں، تہمتیں گھڑی جائیں اور پھر واقعے کی حقیقت معلوم کیے بغیر انھیں بار بار سنایا جائے۔

﴿ اَلْمُحْصَنٰتِ ﴾:

''محصن'' لفظِ ''حصن'' سے مشتق ہے اور اس کے معنی قلعہ کے ہیں۔ قلعہ کے اندر پہنچ جانے والا شخص ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ شادی بھی ایک قلعہ ہے، کیوں کہ شادی شدہ شخص عموماً اخلاقی خطرات سے محفوظ ہوتا ہے۔ شادی اور نکاح انسان کے اخلاق کی حفاظت کرتے ہیں، اسے بدکاری سے بچاتے اور شرم و حیا کے محافظ ہوتے ہیں۔ پاکباز اور شادی شدہ کو ''محصن'' قرار دیا گیا ہے۔

﴿ اَلْمُحْصَنٰتِ ﴾ سے مراد شادی شدہ اور پاکباز عورتیں ہیں۔ عفت اور پاکبازی عورت میں

فطرتی طور پر ہوتی ہے، لیکن عورتوں کے ساتھ ساتھ مرد بھی ''مُحْصِن'' ہیں، جیسا کہ سورت مائدہ میں فرمایا ہے: ﴿ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ [المائدۃ: ٥] محصن مرد اور عورت، ہر دو پر تہمت لگانا گناہ ہے۔

﴿ اَلْغٰفِلٰتِ ﴾:

بے خبر، یعنی وہ جن کو کچھ خبر نہیں کہ بدکاری کیا ہوتی ہے؟ کس طرح کی جاتی ہے؟ برائی کی تہمت سے بھی بے خبر ہوں، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ تھا۔ مدینہ بھر میں ان کے متعلق ہنگامہ برپا تھا، لیکن ان کو اس کی کوئی خبر نہ تھی کہ ان کے متعلق کیا باتیں بنائی جا رہی ہیں۔

ان کو مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کی زبانی اس کا علم ہوا، جب وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہمراہ رفعِ حاجت کے لیے جا رہی تھیں کہ راستے میں ٹھوکر لگنے پر انھوں نے مسطح کے لیے بددعا کی، جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس ہنگامے کا علم ہوا۔[1]

تذکرۂ فواحش ''غفلت'' کی عین ضد ہے۔ اسی طرح اختلاطِ مرد و زن بھی درست اور جائز نہیں ہے۔ غیر محرم مردوں کا اندرونِ خانہ بلا روک ٹوک آنا تقاضائے ''غفلت'' کے خلاف ہے۔ عورتوں کا بلا ضرورت گھروں سے باہر رہنا یا زیادہ دیر تک پھرنا بھی ﴿ اَلْغٰفِلٰتِ ﴾ کی صفت نہیں ہے۔ برائی سے ناآشنائی کا دوسرا نام ''غفلت'' ہے۔

﴿ اَلْمُؤْمِنٰتِ ﴾:

''إِحْصَانٌ'' اور ''غَفْلَةٌ'' کے ساتھ ایمان کا بھی ذکر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان اور خشیتِ الٰہی ہی برائی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ایک مومن زانی ہوسکتا ہے اور نہ ''مشرک'' ہی، اس لیے ایک زانی کا نکاح زانیہ یا مشرکہ کے ساتھ اور ایک زانیہ کا نکاح زانی یا مشرک کے ساتھ درست ہوسکتا ہے: ﴿ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ لیکن یہ مومنوں پر حرام ہے۔

بدکار اور مشرک کا کردار ایک جیسا ہوتا ہے۔ مشرک کا ذہن عفیف نہیں ہوتا، بالکل جیسے زانی عفیف نہیں ہوتا۔ مشرک خدا کے حقِ خاص میں مخلوق کو شامل کر لیتا ہے اور اسی طرح زانی مرد یا عورت ایک خاص فرد کے حقِ خاص میں کسی دوسرے کو شامل کر لیتے ہیں۔ یہ قدر دونوں میں مشترک ہے، جس کی بنا پر کہا گیا ہے:

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٦٦١، ٤١٤١)

﴿ اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ [النور: ۳]

''زانی مرد نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ عورت ہی سے اور زانیہ عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر زانی یا مشرک مرد ہی اور مومنوں پر یہ (زنا کار سے نکاح) حرام ٹھہرایا گیا ہے۔''

﴿ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ﴾: ''ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے۔'' اس سے قبل زنا کی تہمت لگانے والے کے لیے 80 دُرے کی سزا کا ذکر گزر چکا ہے اور یہاں اس سزا کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ان پر لعنت کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صرف جسمانی سزا کافی نہیں ہے، بلکہ ان پر پھٹکار بھی کی گئی ہے۔ خدا کی حمد وثنا سے یہ لوگ محروم ہیں۔ خدا تعالیٰ کی عبادت سے محرومی لعنت ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ سے قرب، زیادہ عبادت میں ہوتا ہے۔ سجدے کی حالت میں ایک بندہ اپنے رب کے بالکل قریب ہوتا ہے۔[1] پاک دامن، شریف اور سیدھی سادھی عورتوں پر الزام لگانے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔

برائی کی تہمت ایک معاشرتی ناسور ہے:

ہمارے معاشرے میں زنا کی تہمت وبا کی طرح پھیل چکی ہے۔ زنا کے تذکرے عام ہوتے ہیں۔ یہ گھروں سے لے کر دفتروں تک، ہر جگہ جاری ہیں۔ بدگمانی کا مرض عام ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ اس لعنت کا مصداق کیا ہم تو نہیں بن رہے ہیں؟

تمام علماء اس امر پر متفق ہیں کہ عورت اور مرد، دونوں پر تہمت لگانی حرام ہے۔ بعض مفسرین نے ان آیات کو امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے لیے خاص کہا ہے۔[2] شانِ نزول کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے جو یہی ہے، لیکن الفاظِ آیات عام ہیں۔ اس ضمن میں سب شامل ہیں، جس میں بھی یہ تین صفات ہوں گی:

1 احصان 2 غفلت 3 ایمان

اس کے خلاف بدگمانی کرنے والا لعنت کا مصداق ہوگا، البتہ مشہور عام بدکردار اور بداخلاق کے خلاف زبان کھولنا جرم نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینے کی ایک عورت کے متعلق کہا تھا کہ اگر چار گواہوں کی پابندی نہ ہوتی تو میں اس عورت کو رجم کرا دیتا۔[3]

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٥)

[2] تفسير ابن كثير (٣٠/٦) تفسير البغوي (٣٩٦/٣)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٦٩)

﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾: ایسے لوگ، جو پاکباز عورتوں پر الزام لگا دیں، ان کے لیے عذابِ عظیم ہے۔ زبان کی خرابی بھی بہت بڑی برائی ہے۔ اس میں عملی غلطی کوئی نہیں ہے، لیکن صرف زبان کی وجہ سے آخرت کے عذاب کا مستحق ہو جائے گا۔

1 ایک حدیث میں ذکر آتا ہے کہ جہنم میں منہ کے بل گرنے والے زبان کی وجہ سے گریں گے۔[1]

2 ایک دوسری حدیث میں ذکر ہے کہ پاک دامن عورتوں پر بہتان لگانا، سو سال کے اعمال کو برباد کر دیتا ہے۔[2]

3 ایک اور حدیث میں عفیف عورتوں پر الزام کو سات کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔[3]

4 ایک حدیث میں ذکر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو جہنم میں دیکھا کہ ساری زبان لٹک رہی ہے اور اس سے خون جاری ہے۔ استفسار پر بتایا گیا کہ یہ تہمت لگانے والا ہے۔

اعضاء کی گواہی:

﴿ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ ﴾: تہمت لگانے والے آخرت میں اپنے اس جرم سے انکار کریں گے تو ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ یہ بے بسی کی شہادت ہوگی کہ جسم کے جس حصے نے کوئی کام کیا ہوگا اور حظ اٹھایا ہوگا، وہ اس کی شہادت دے گا: زبان باتوں کی، ہاتھ پکڑنے کی، پاؤں چل کر جانے کی۔

﴿ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾: اس روز ان کو بالکل درست سزا ملے گی اور ان کو یقین ہو جائے گا کہ یہی ان کا حق ہے۔[4]



---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦١٦)

[2] مسند البزار (٢٩٢٩) المعجم الكبير للطبراني (٣٠٢٣) اس کی سند میں لیث بن ابی سلیم ضعیف ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٦٦)

[4] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (12 اگست 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پاکیزگی اور خباثت کے نتائج

﴿اَلۡخَبِیۡثٰتُ لِلۡخَبِیۡثِیۡنَ وَالۡخَبِیۡثُوۡنَ لِلۡخَبِیۡثٰتِ ۚ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیۡنَ وَالطَّیِّبُوۡنَ لِلطَّیِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوۡنَ مِمَّا یَقُوۡلُوۡنَ ؕ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّرِزۡقٌ کَرِیۡمٌ﴾ [النور: ٢٦]

''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے، اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے، یہ (پاکیزہ) لوگ ان باتوں سے بری ہیں جو وہ (خبیث لوگ ان کی بابت) کہتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بہت اچھا رزق ہے۔''

ربطِ آیات:

سورت نور کے آغاز ہی سے اصلاحِ اخلاق کا تذکرہ آرہا ہے۔ اخلاقیات کے باب میں خاص طور پر زنا اور بدکاری کا پوری طرح سدِ باب کیا ہے۔ نسب اور قبائلی زندگی کی حفاظت، نسل کی بقا اور تقدیس کے لیے عصمت اور پاکبازی کی ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ بہتان تراشی اور برائی کا تذکرہ کرنے، فواحش کی طرف میلان اور ترغیب دینے سے روکا ہے، کھلی، بیّن اور واضح شہادت کے بغیر کسی پاکباز کے متعلق زبان کھولنے سے روکا ہے اور اس جرم پر سزا عائد کی ہے۔

واقعۂ افک:

ان عمومی احکام میں ایک خاص واقعہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات سے تعلق رکھتا تھا، اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ منافقین نے اس لیے گھڑا تھا کہ ایک تو اس کی تشہیر سے خاندانِ نبوت کو داغ دار کر دیا جائے، دوسرا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خاندان کو بھی بدنام کیا جائے۔ مسلمانوں کی اخلاقی برتری کو ختم کرنا بھی ان کے پیشِ نظر تھا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء رسانی بھی، لیکن ان آیات کے

نزول سے ان کی ساری کوششوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بریت کر دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فخر یہ کہا کرتی تھیں کہ میری براءت اللہ تعالیٰ نے خود آسمان سے نازل کی ہے۔[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ہے کہ توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے، مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بدگمانی کرنے والے کی معافی نہیں ہوگی۔

افک کی سنگینی:

تمام علماء کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ توبہ سے ہر گناہ کی معافی ہو جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کو اس قدر سنگین سمجھتے تھے کہ وہ مندرجہ بالا فتویٰ دیتے تھے۔ پوری طرح غور کیا جائے تو اس امر کی سنگینی سمجھ میں آتی ہے۔

واقعۂ افک کے وقت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی عمر نو، دس سال تھی، انھوں نے یہ واقعہ سنا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جو واقعات پیش آئے، اس وقت آپ جوان تھے۔ علمی طور پر بھی آپ کے عروج کا زمانہ تھا اور ان کے علم و فضل سے بے شمار لوگ مستفید ہو رہے تھے۔ جنگِ جمل اور صفین کا واقعہ ان کے سامنے ہوا۔ غالی شیعوں نے اس وقت دوبارہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بدگمانی کی اور زبان درازی کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جھگڑے کا معاملہ ان کے سامنے ہوا تھا۔ جنگِ جمل کے واقعات پر ان کی نظر تھی، دوسری طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بے داغ اور پاک زندگی ان کے سامنے تھی، مزید برآں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ براءت کی آیات بھی سامنے تھیں، ان حالات میں وہ بدگمانی کرنے والے کے متعلق کہتے تھے کہ توبہ کے باوجود ان کا گناہ معاف نہیں ہوگا۔

انبیاء کی معجزانہ بریت:

تین چار واقعات ایسے ہیں جن میں بعض انبیاء کی بریت معجزانہ طور پر ہوئی ہے:

1. حضرت یوسف علیہ السلام پر عزیزِ مصر کی بیوی نے دست درازی کا الزام لگایا: ﴿مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا﴾ [یوسف: ٢٥] ”کیا جزا ہے اس کی جس نے تیری گھر والی کے ساتھ برائی کا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٦١)

ارادہ کیا؟'' یہاں ایک شیر خوار بچے نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکبازی کی گواہی دی تھی:

﴿ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ﴾ [یوسف: ۲٦] ''اس (عورت) کے گھر والوں سے ایک گواہ نے گواہی دی۔''

زنا کا ارادہ کرنے والا پشت نہیں دکھاتا اور بھاگنے والے کا دامن آگے سے چاک نہیں ہوتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن پیچھے سے چاک تھا، اس لیے بریت ہوگئی: ﴿ إِنَّهُ مِن كَيْدِكُنَّ ﴾ [یوسف: ۲۸] ''یقیناً یہ تم عورتوں کے فریب سے ہے۔''

② حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام کہ وہ کسی مردانہ مرض میں مبتلا ہیں، اس واقعے کا ذکر حدیث میں آتا ہے:

بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے قبل عام طور پر کھڑے ہو کر پیشاب کرتے اور دوسرے لوگوں کے سامنے ننگے ہو جاتے تھے۔ رفعِ حاجت کے لیے عام رستوں میں بیٹھ جاتے تھے، ستر پوشی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے باپردہ اور شرمیلے تھے، اس لیے رفعِ حاجت کے وقت بنی اسرائیل کی عادت کے خلاف پردہ اور خلوت کا پورا اہتمام کرتے تھے۔ اس سے قوم کے اندر یہ مشہور ہوگیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی جنسی مرض میں مبتلا ہیں۔ جنسی امراض اعصاب کو براہِ راست متاثر کرتے ہیں اور چونکہ کوئی اعصاب کا مریض نبی نہیں ہوسکتا، اس لیے اس شک کو معجزانہ طور پر رفع کیا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جنگل میں گئے، نہانے کے لیے کپڑے اتارے اور ایک پتھر پر رکھ دیے۔ پتھر نے کپڑوں سمیت لڑھکنا شروع کیا اور بھاگتا ہوا بنی اسرائیل کے ایک ہجوم کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی برہنگی کی حالت میں اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے، چنانچہ ان کو دیکھ کر قوم کا شک رفع ہوگیا۔[1]

منکرینِ حدیث نے اپنی عادت کے مطابق اس حدیث پر مختلف انداز سے اعتراضات کیے ہیں۔ پتھر کے بھاگنے کو اس معاملے میں خاص طور پر ہدف بنایا گیا ہے۔ یہ لوگ قرآنِ مجید ہی میں اگر کچھ غور وفکر کرتے تو اس کا جواب ان کو مل جاتا۔ انسان کو مٹی سے بنایا گیا اور مٹی کے تودے کو اللہ تعالیٰ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۷۸)

نے تمام حواس سے نوازا۔ جو اللہ مٹی سے انسان بنا سکتا ہے، کیا وہ اس امر پر قادر نہیں ہے کہ پتھر کو ایسی قوت عطا کر دے کہ وہ چل سکے؟ قرآن مجید میں پتھروں کی اقسام کے ذکر میں فرمایا ہے:

﴿ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٧٤]

''اور بے شک ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔''

کہاں پتھر اور کہاں خوفِ خدا! منکرینِ حدیث کے لیے یہ مقامِ غور ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''میں ایسے پتھروں کو جانتا ہوں جو مجھے سلام کرتے ہیں۔''[1] کوہِ احد کو مجھ سے اور مجھے کوہِ احد سے محبت ہے۔''[2]

3 حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان کا واقعہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد حضرت مریم علیہا السلام واپس قوم کی طرف گئیں تو انھوں نے سوال کیا تھا:

﴿ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۗ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴾ [مریم: ٢٨۔٣٠]

''اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدکار تھی۔ چنانچہ اس نے اس (بچے) کی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگے: ہم اس سے کیسے کلام کریں جو گود میں بچہ ہے؟ وہ (بچہ) بول اٹھا: بلاشبہہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے۔''

حضرت مریم علیہا السلام نے جواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا تھا اور انھوں نے شیرخوارگی ہی میں ان کی براءت کا اعلان کیا۔

4 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے۔ یہ معاملہ اس قدر سنگین تھا کہ آسمان لرز اٹھا۔ وحی کے ذریعے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت آئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی پاک دامنی کی گواہی دی۔ جبرائیل علیہ السلام نے پڑھ کر سنایا اور رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو پڑھ کر سنایا۔[3]

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٢٧٧)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٠٨٤)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤١٤١)

بدکاری:

اسی واقعہ کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ ﴾ کوئی پاک باز اپنے گھر میں بدکار بیوی کو نہیں رکھ سکتا۔ عام انسانوں کا یہ دستور ہے کہ نیک، نیکی اور نیکو کاروں کو پسند کرتے ہیں، جب معاملہ ایک پیغمبر کا ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک بدکار عورت کو گھر میں رکھ سکے اور پھر محمد ﷺ کے گھر میں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اس آیت کا ایک مطلب بعض مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بری باتیں برے لوگوں ہی کو سزاوار ہیں۔[1] فواحش میں اسی طرح کے لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ برے اعمال برے لوگوں ہی کو سجتے ہیں اور نیک اعمال نیک لوگوں کو۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ایک نبی کے گھر میں بدعقیدہ بیوی تو رہ سکتی ہے (حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی طرح) لیکن بدکار بیوی ایک نبی کے گھر میں نہیں رہ سکتی۔[2]

مزید برآں ایک بدکار بیوی اور پاکباز مرد کے درمیان ﴿ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ﴾ [الروم: ٢١] جو نکاح کا ایک فائدہ ہے مودت اور رحمت، کسی طرح بھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ دوسری جگہ قرآن میں ﴿ لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ﴾ [الأعراف: ١٨٩] کہا ہے، لیکن ایک عفیف کے لیے ایک اخلاق باختہ عورت میں تسکین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ اس کے برعکس ایک بدکار مرد کے لیے بدکار عورت میں یہ سب کچھ ہے:

﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ [النور: ٣]

''زانی مرد نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ عورت ہی سے اور زانیہ عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر زانی یا مشرک مرد ہی اور مومنوں پر یہ (زنا کار سے نکاح) حرام ٹھہرایا گیا ہے۔''

پاکدامنی رزق میں اضافے کا سبب ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ ﴾: زنا کی مذمت کے بعد

[1] تفسیر مجاهد (ص: ٤٩١)

[2] الفتاوى الكبرى لابن تيمية (١٠٢/٣)

مغفرت کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی رزق کا تذکرہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زنا کے ساتھ معاشی پریشانی لازمی ہے۔ بدمعاش اور بدکار عام طور پر مالی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں، ان پر خدا کا غضب ہوتا ہے، بدکاری رزق کا گھاٹا ہے۔ زنا قحط کی دعوت دیتا ہے، اس کے برعکس طیبات اور طیبون (نیک مرد اور عورتوں) کو رزق کی خوش خبری دی گئی ہے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (19 اگست 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(1) آدابِ معاشرت

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿27﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا ۚ هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿28﴾﴾ [النور: ۲۷، ۲۸]

”اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، حتی کہ تم اجازت لے لو اور ان گھر والوں کو سلام کرو، یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ پھر اگر تم ان میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں داخل نہ ہو، حتی کہ تمھیں اجازت دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ آؤ، یہ تمھارے لیے بہت پاکیزہ (عمل) ہے، اور جو تم عمل کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔“

ربطِ آیات:

ان آیات سے قبل سورت کا جو حصہ گزر چکا ہے، اس میں زنا اور بداخلاقی کی مذمت کی گئی ہے اور اس بداخلاقی کے رونما ہو جانے پر کیا کرنا چاہیے، اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ جھوٹی تہمت پر کیا سزا ہے؟ اس کے ذکر کے علاوہ اس سلسلے میں تہمت کے ایک خاص واقعے کو بیان کر کے مختلف ہدایات دی ہیں۔ اب ان آیات سے ان ہدایات اور احکام کا ذکر شروع ہو رہا ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ جرائم کا سدِ باب ہو اور ان اسباب کو ختم کیا جائے جو ان برائیوں کو پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں خطاب اہلِ ایمان سے شروع کیا ہے اور واقعتاً اس خطاب کے حق دار ایمان دار ہی ہیں۔ جو اللہ اور رسول پر ایمان نہ رکھتا ہو، اُس کا اس خطاب سے تعلق ہی کیا ہے؟

اسلامی اخلاق:

ان آیات سے اسلامی اخلاق کا پورا قانون شروع ہو رہا ہے، جس کا پہلا اصول مندرجہ بالا

آیات میں بیان کیا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا ﴾ ''اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، حتی کہ تم اجازت لے لو۔''

﴿ تَسْتَاْنِسُوْا ﴾ ''استیناس'' یہ ''انس'' سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک دوسرے کے مکان میں داخل نہ ہو، جب تک تم اس سے انس پیدا نہ کر لو، یا وہ تم سے مانوس نہ ہو جائیں، اُن سے واقفیت نہ ہو جائے اور اُن سے اجازت نہ لے لو۔

استیناس کی مختلف صورتیں ہیں: باہر سے آواز دینا، دروازہ کھٹکھٹانا، دروازے میں کھڑے ہو کر سلام کہنا۔ حدیث میں ہے کہ تین مرتبہ سلام کہنا چاہیے، جواب ملے تو مکان میں داخل ہونا چاہیے، ورنہ واپس ہو جانا چاہیے۔[1]

بغیر اجازت کسی کے رہایشی مکان میں داخل ہونے سے مختلف فتنے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر مکان خالی ہے تو چوری وغیرہ کی بدگمانی ہو سکتی ہے اور اگر اندر اہلِ خانہ موجود ہیں تو عین ممکن ہے کہ کسی نادیدنی حالت میں ہوں اور اگر گھر میں صرف عورت موجود ہو اور مرد موجود نہ ہو تو یہ مزید فتنے کا باعث ہو گا۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے: ''تہمت کے مواقع سے بچو۔''[2]

سلام کریں:

﴿ وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿27﴾ ﴾

''اور ان گھر والوں کو سلام کرو، یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے، تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

سلام اندر جانے سے پہلے کرنا چاہیے۔ حضرت کلدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے تو سلام نہ کیا اور اجازت مانگی۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ لوٹ جاؤ اور باہر جا کر یہ الفاظ کہو: ''السلام علیکم! کیا میں اندر آ جاؤں؟''[3]

﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾: اجازت سے داخل ہونا اور سلام کہنا ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ دین ہی نہیں، بلکہ یہ دنیا اور تمھاری ذات کے لیے بھی مفید اور بہتر ہے۔ بدگمانی سے ہر ایک بچتا ہے اور یہ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٥٤)

[2] یہ روایت بے اصل ہے۔ الضعيفة (١١٣)

[3] مسند أحمد (٤١٤/٣)

بدگمانی کو روکنے کا بہترین طریق ہے۔

بدگمانی کا سدِباب:

رسول اللہ ﷺ اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے، اس حالت میں گھر والوں کی عام آمد و رفت بند ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کی بیوی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کسی کام کے سلسلے میں آپ ﷺ کے پاس آئیں، وہ جب واپس جانے لگیں تو آپ ﷺ ان سے گفتگو کرتے ہوئے دروازے تک پہنچ گئے۔ سامنے سے دو آدمی اپنی کسی غرض کے لیے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے، اُن کو دیکھتے ہی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آرام سے آؤ، یہ میری بیوی صفیہ ہے۔''[1]

اسلام نے بدگمانی سے سختی سے روکا ہے:

﴿ اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ﴾ [الحجرات: ١٢] ''بہت بدگمانیوں سے بچو۔''

﴿ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى ﴾ [بني إسرائيل: ٣٢] ''زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔''

برائی کی ترغیب کے مواقع سے بھی بچو، اسلام نے اخلاق کا معیار ساری دنیا سے بلند رکھا ہے۔ خالی گھر میں مت جاؤ اور اگر جانا ضروری ہو تو اجازت طلب کرو۔

﴿ غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ ﴾: ''وہ مکان جہاں تمھاری سکونت نہیں ہے۔'' تمام قریبی رشتے داروں کے گھر ﴿ غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ ﴾ ہیں، وہاں کھانس کر اور اجازت طلب کر کے داخل ہونے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہے، لیکن یہاں بھی دوپہر اور عشاء کے وقت اجازت لینی چاہیے یا کھانس کر جانا چاہیے۔

﴿ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾: تذکر یہ نصیحت کو قبول کرنا، حکم پر عمل کرنا اور اچھی بات کو ماننا ہے اور یہی دانش مندی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ ایک دفعہ جنگل میں نماز پڑھ رہے تھے اور آگے سترہ رکھا ہوا تھا، لیکن خود سترہ سے کچھ دور تھے۔ ایک آدمی پاس سے گزرا اور اس نے آواز دی۔ ''اے نمازی اپنے سترے کے قریب ہو جاؤ، تم سترے سے بہت دور ہو۔'' امام شافعی رحمہ اللہ نے فوراً تعمیل کی اور اپنے علم کی خامی کو فوراً محسوس کیا۔[2]



[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٥)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (26 اگست 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(2) آدابِ معاشرت

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿27﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿28﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿29﴾﴾ [النور: ۲۷-۲۹]

”اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، حتیٰ کہ تم اجازت لے لو، اور ان گھر والوں کو سلام کرو، یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ پھر اگر تم ان میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں داخل نہ ہو، حتیٰ کہ تمھیں اجازت دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ آؤ، یہ تمھارے لیے بہت پاکیزہ (عمل) ہے، اور جو تم عمل کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان گھروں میں داخل ہو جہاں رہایش نہ ہو (اور) ان میں تمھارے لیے کوئی فائدہ ہو اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔“

بلا اجازت کسی کے گھر جانا:

اللہ تعالیٰ نے بد اخلاقی کو روکنے کے لیے جو ہدایات دی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بلا اجازت کسی کے گھر میں داخل نہ ہوا جائے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ امر سرِفہرست ہے۔

ایک دوسرے کے گھروں میں بلا تکلف گھس جانا کسی لحاظ سے بھی پسندیدہ نہیں، خواہ وہ قریبی رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔ اس معاملے میں ذرا سی بے پروائی معصیت کے بہت بڑے دروازوں کو

کشادہ کر دیتی ہے۔ اگر اجازت نہ ملے تو اس پر کبیدہ خاطر ہونا چاہیے اور نہ اجازت طلب کرنے پر اصرار کرنا چاہیے۔

﴿ فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِيۡهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدۡخُلُوۡهَا حَتّٰى يُؤۡذَنَ لَـكُمۡ ﴾: خالی گھروں میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ اجازت طلب کی گئی، لیکن کوئی جواب نہیں مل رہا تو مکان میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ اجازت دینے والا اگر موجود نہ ہو تو محض قیافہ یا اندازے سے کہ مکان میں کوئی موجود ہے، داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ چاہے اندر سے آواز ہی کیوں نہ آ رہی ہو۔ ایسی صورت میں واپس ہو جانا چاہیے۔ اگر صاف صاف کہہ دیا جائے کہ واپس ہو جاؤ تو اس پر بُرا منائے بغیر اپنے گھر کو چلے جانا چاہیے: ﴿ وَاِنۡ قِيۡلَ لَـكُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا‌ هُوَ اَزۡكٰى لَـكُمۡ‌ ﴾ اس جواب پر ناراضی بالکل غلط ہے۔

کسی کو ملاقات پر مجبور کرنا یا تن کر دروازے پر کھڑے ہو جانا کہ مل کر ہی جانا ہے، جائز نہیں ہے۔ ایسی صورت میں واپس ہو جانا بہت بہتر ہے۔ ﴿ هُوَ اَزۡكٰى لَـكُمۡ‌ ﴾ اس طرح کرنا زیادہ پاکیزہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ:

مدینے میں ایک مرتبہ یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سب بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس امر کی تحقیق کے لیے بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچے۔ آپ نے اجازت مانگی تو نہ ملی۔ دوسری مرتبہ کچھ توقف سے اجازت طلب کی، پھر بھی اجازت نہ ملی۔ تیسری مرتبہ ملاقات کی اجازت مل سکی تو آپ نے گفتگو کی۔[1] آپ نے اس پر برا نہیں منایا۔ ہماری طرح ہوتے تو روٹھ کر گھر آ بیٹھتے۔ ہم لوگ اسلام کے اخلاقیات کو اپنے تابع کرنا چاہتے ہیں اور خود اسلام کی اتباع سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

چنانچہ اکثر مسلمان ملکوں میں یہ کام ایک مہم کے طور پر ہو رہا ہے کہ اسلام کی ایسی تشریح کر دو جو حالات کے مطابق ہو، یعنی اپنے آپ کو بدلنے کے بجائے قرآن کو بدل دو۔

﴿ هُوَ اَزۡكٰى لَـكُمۡ‌ ﴾ اگر اذن نہ ہو تو فوراً واپس ہو جانا چاہیے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٩١)

سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل:

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی یہ عادت تھی کہ آپ اجازت بھی طلب نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ مکان کے قریب ایک طرف بیٹھ جاتے تھے اور اجازت کے لیے کسی فردِ خانہ کے باہر نکلنے تک انتظار کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک انصاری کے ہاں آپ کسی مسئلے کی دریافت کے لیے گئے اور مکان کے باہر کافی دیر ٹھہرے رہے۔ کافی دیر کے بعد صاحبِ خانہ باہر آئے تو آپ کی موجودگی اور انتظار کا علم ہوا۔[1]

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ ﴾ [الحجرات: ٤] ''بے شک جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجروں کے باہر سے آوازیں دیتے ہیں۔'' اس معاملے میں آوازیں دینا بھی پسندیدہ نہیں ہے، کسی کے باہر آنے تک انتظار بہتر ہے۔ البتہ جہاں کسی کی رہایش نہ ہو، وہاں داخل ہونے کے لیے اجازت کی پابندی نہیں ہے۔

غیر مسکونہ مقامات:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ﴾ [النور: ٢٩]

''غیر مسکونہ'' سے تمام وہ مقامات مراد ہیں جہاں عام لوگوں کو آنے جانے کی اجازت ہو، اس میں حسبِ ذیل مقامات شامل ہیں:

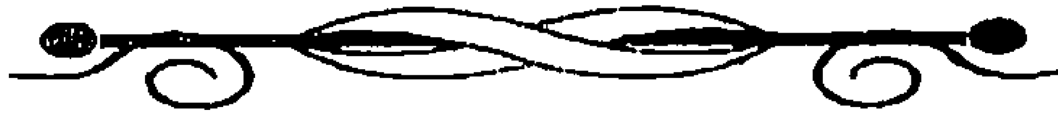
1. مساجد: جہاں کسی کی قیام گاہ نہیں ہے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے سلام کہنا چاہیے، لیکن یہ سلام اجازت کے لیے نہیں ہے۔
2. ایک مکان میں کئی خاندان رہ رہے ہوں تو بڑے دروازے میں داخل ہونے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔
3. دکانیں: جہاں کاروبار ہوتا ہے، یا ایسے گیراج جہاں سامان رکھا جاتا ہے۔
4. کھنڈرات اور خرابات۔
5. مسافر خانے اور سرائے وغیرہ۔

[1] سنن الدارمي (٨٥)

مکہ کے مکانات کی شرعی حیثیت:

بعض احناف نے ''غیر مسکونہ'' سے مراد بیت اللہ کے مکان لیے ہیں کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں ہیں، لہٰذا بیوتِ مکہ غیر مسکونہ ہیں۔[1] لیکن احادیث سے مکہ کے مکانوں کی خرید وفروخت ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے وقت میں بھی ایسا ہوا ہے۔[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی بعض مکان خرید کر حرم کی توسیع کی تھی،[3] لیکن حج کے ایام میں مکانات کے اکثر حصے کو کھلا چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ حاجیوں کو رہایش کی دقت نہ ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿سَوَآءً الْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ﴾ [الحج: ٢٥] ''اس میں رہنے والے اور باہر سے آنے والے، برابر ہیں۔''

اجازت سے کسی کے گھر میں داخل ہونا چاہیے۔ اگر اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا جائے تو بہت سی خرابیاں اور برائیاں ختم ہوسکتی ہیں۔ بہت سے مسائل جو سنگین صورت اختیار کر گئے ہیں، از خود حل ہو جائیں گے۔ افسوس کہ ہم ایک بہتر نظامِ زندگی اپنے پاس رکھتے ہیں، اس کو مانتے بھی ہیں، لیکن عملاً اس کو معطل کر رہے ہیں۔[4]



① تفسير الطبري (١٥٢/١٩)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٨٨)

③ أخبار مكة للأرزقي (٦٩/٢)

④ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (2 ستمبر 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پردہ اور اس کے متعلقات (1)

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ
فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي
جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ
اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ
اَوْ نِسَاۗىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ
اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَاۗءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ
مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

[النور: ۳۰،۳۱]

”(اے نبی!) آپ مومن مردوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے بہت پاکیزہ (عمل) ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں، بلاشبہ اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ اور آپ مومن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو (ازخود) اس میں سے ظاہر ہو اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں اور اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں، مگر اپنے خاوندوں پر یا اپنے باپ دادا پر یا اپنے خاوندوں کے باپ دادا پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں (سوتیلے بیٹوں) پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھتیجوں پر یا اپنے بھانجوں پر یا اپنی (مسلمان) عورتوں پر یا اپنے دائیں

ہاتھ کی ملکیت (کنیزوں) پر یا عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے نوکر چاکر مردوں پر یا ان لڑکوں پر جو عورتوں کے پردوں (کی چیزوں) سے واقف نہ ہوں اور وہ (عورتیں) اپنے پاؤں (زور زور سے) زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے وہ (لوگوں کو) معلوم ہو جائے، اور اے مومنو! تم مجموعی طور پر اللہ سے توبہ کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

اسلامی ضابطۂ حیات:

اسلام زندگی کا ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق قرآن مجید میں ہدایات موجود ہیں۔ اسلامی اخلاق کے متعلق سورت نور میں واضح ہدایات ہیں۔ اس رکوع کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان گھر کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے یا کسی کے مکان میں داخل ہوتے ہوئے کیا طریقہ اختیار کرے۔

پچھلے دو خطبوں میں ان امور کا تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ کسی کے رہایشی مکان میں داخل ہونے کا کیا طریقہ ہے، اپنے مکان میں کیسے داخل ہونا چاہیے اور جس جگہ کسی انسان کی رہایش نہ ہو، وہاں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ یعنی استیناس، استیذان اور بیوتِ غیرِ مسکونہ کی وضاحت ہو چکی ہے۔

گھر سے باہر ایک مسلمان کا طرزِ بود و باش:

اب ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ گھر سے باہر ایک مسلمان کو کس طرح رہنا چاہیے اور عام آمد و رفت کے آداب کیا ہیں۔

دنیا کے کسی معاشرے میں بھی برائی اور نہ کبھی نیکی ہی ناپید ہوئی ہے۔ تمام انسان فرشتے کبھی نہیں بنے، ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے اور ہو گا کہ کبھی شر غالب، کبھی نیکی غالب اور کبھی برائی عام، کبھی نیکی عام۔

رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا میں سب سے زیادہ اندھیرا عرب میں تھا۔ عربوں کی حالت اس وقت بے حد خراب تھی۔ اخلاق کی کون سی برائی ہے جو ان میں پوری طرح نہ تھی؟ اس کے باوجود نیک لوگ بالکل ناپید نہ تھے۔ ورقہ بن نوفل جیسے آدمی اور دیگر اچھے اخلاق کے بہت لوگ موجود تھے۔ قیامت کے قریب جب اللہ کا نام لینا بند ہو جائے گا تو صرف اسی وقت مکمل غلبۂ شر ہو گا۔

بعثتِ نبوی کے بعد حالات بدل گئے تھے۔ مدینے میں اخلاقی انقلاب ہوا، جس سے مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں میں تبدیلی آئی۔ پاکیزگی اور نیکی کا دور دورہ ہوا، اس کے باوجود زنا کے مقدمات آئے۔ مقذوف بھی ملتے ہیں۔ سزائے تازیانہ بھی دی گئی اور رجم کی سزا بھی نافذ ہوتی رہی۔ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے میں برائی کا مکمل قلع قمع ہو۔ اس مقصد کے لیے مختلف احکام دیے ہیں، ان میں سے ایک غضِ بصر ہے، جس کا حکم ان آیات میں دیا گیا ہے۔

غضِ بصر کا حکم:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾ ''اور آپ مومن مردوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔''

مطلب یہ کہ نظر اور ستر کے اعضاء کی حفاظت کرو۔ نظر کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ نظر کو جائز طور پر استعمال کیا جائے اور نظر بازی سے بچا جائے۔ ایک حدیث میں اس کو نظر کا ''زنا'' کہا گیا ہے۔[1] دیدہ بازی، زنا کی منزل کی پہلی سیڑھی ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

« إِنَّ النَّظْرَةَ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ إِبْلِيسَ مَسْمُومٌ، مَنْ تَرَكَهَا مَخَافَتِي، أَبْدَلْتُهُ إِيْمَاناً يَجِدُ حَلَاوَتَهُ فِي قَلْبِهِ »[2]

''نگاہ، شیطان کے زہر سے بجھے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ جو آدمی میرے خوف سے اس سے بچے گا، اس کو اس کے بدلے میں ایسا ایمان عطا کروں گا، جس کی مٹھاس وہ اپنے دل میں پائے گا۔''

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ پہلی نظر تو معاف ہے، لیکن دوسری نظر پر مواخذہ ہوگا۔[3]

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٤٣)

② المعجم الكبير للطبراني (١٠٣٦٢) اس کی سند میں عبدالرحمان بن اسحاق الواسطی ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١٠٦٥)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٩)

عورتوں کو پردے کی تلقین:

عورتوں کو پردے کی تلقین کی ہے۔ بد اخلاقی کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ مرد اپنی نظریں نیچی رکھیں۔ مدینہ منورہ میں غیر مسلم عورتیں کھلے منہ پھرتی تھیں، اس لیے مسلمان مردوں کو حکم دیا گیا کہ وہ نگاہ بھر کر نہ دیکھیں۔ کسی نامحرم عورت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا ناجائز ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی پردے کی سختی سے تلقین کی گئی ہے۔ غلام اور آزاد عورت کے پردے میں فرق ہے۔ پاؤں سے سر کے بالوں تک، آزاد عورت کو پردہ کرنا چاہیے، یعنی اس کو سارا جسم ڈھانپنا چاہیے۔ لونڈی کا پردہ بالغ مرد کی طرح ہے۔

استثنائی صورتیں:

ہر قانون میں کچھ مستثنیات ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ ایسی لچک کے بغیر قانون کا پورا احترام ممکن نہیں ہے اور یہی صورت پردے کے قانون و احکام کی ہے۔ معاشرے کے اندر کچھ لوگ ایسے ہیں، جن کے لیے پورا پردہ ممکن ہی نہیں، مثلاً: بوڑھی عورتیں، اس کے علاوہ ایسی عورتیں جن کے مرد اُن عورتوں کی مدد کے بغیر اپنے کام کاج کر ہی نہیں سکتے، ایسی عورتوں پر ویسی پابندی نہیں ہے، بلکہ شریعت نے ان کو رعایت دی ہے۔

ایک صحابی رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں فوت ہو گئے۔ ان کی بیوی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بتایا کہ باغ کا پھل پک چکا ہے اور بچے چھوٹے ہیں۔ اگر وہ خود کھیت اور باغ میں جا کر کام نہ کرے گی تو سخت نقصان ہوگا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو اجازت دے دی۔[1]

ایسے ہی اور بھی ناگزیر حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ پردے کی وجہ سے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں، جیسا کہ 1947ء کے فسادات کے دوران میں بعض مواقع پر ہوا تھا۔ ایسے مواقع پر حجاب کو مناسب حد تک رکھتے ہوئے یہ کام کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح جنگ کے زمانے میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، پانی پلانا اور رسد وغیرہ کے پہنچانے میں فوج کی مدد کے سلسلے میں بے شمار واقعات تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ کام حضرت عائشہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہما جیسی باحیا، پردہ دار اور خانوادۂ رسول ﷺ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۸۳)

کے افراد پائینچے اٹھائے کرتے رہے۔[1] آج کوئی موقع ایسا آئے تو یہ امور سرانجام دینا بالکل روا ہیں، بلکہ ضروری ہیں۔

غضِ بصر کا معنیٰ:

﴿ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَٰرِهِمْ ﴾: یہاں ﴿ مِنْ ﴾ ''تبعیض'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بعض نظروں کو نیچی کرو یا پھیر لو۔ ایسا نہیں ہے کہ نظر پر پوری پابندی ہے کہ کسی چیز کو بھی نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتے، بلکہ ایک خاص حد مقرر کی گئی ہے۔ دوسرے لوگوں کی شرم گاہ کو دیکھنا، غیر محرم عورتوں کو تاکنا، بے حیائی کے دوسرے مناظر اور تصاویر دیکھنا بھی اس ممانعت میں شامل ہیں۔

ہمارا معاشرہ بالکل غیر شرعی ہو گیا ہے۔ عورتیں سرِ عام کھلے منہ پھرتی رہتی ہیں اور مرد پوری پوری نظر بازی کرتے ہیں۔ اسی کے نتیجے میں بد اخلاقی وبا کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہے۔ حکم یہ ہے کہ عورتیں ''مٹر گشت'' نہ کریں اور جب بھی مردوں کا سامنا عورتوں سے ہو تو نظریں نیچی کر لی جائیں، یا ایک طرف کر لی جائیں، کیوں کہ ﴿ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ ﴾ اسی طرح زندگی گزارنا پاکیزہ ہے۔ نیز فرمایا: ﴿ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝٣٠ ﴾ ''جو کچھ وہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔''[2]



---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٨٠، ٤٠٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٦٤)

② ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (9 ستمبر 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پردہ اور اس کے متعلقات (2)

دنیا میں برائی کو روکنے کے لیے تین امور سے کوشش کی جاتی ہے:

1 قانون 2 اخلاق 3 شریعت

قانون:

برائی اور گناہ سے معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لیے قانون نافذ کیا جاتا ہے اور اس کی مدد سے برے لوگوں کی سرکوبی کی جاتی ہے۔

اخلاق:

اخلاق کی مدد سے بھی ایک انسان برائیوں سے بچتا ہے۔ اخلاقِ فاضلہ انسان کو فطرت کے تقاضے پر چلاتے ہیں۔ فطرت جس امر کا تقاضا کرتی ہے، اخلاقی قوت اس کو پورا کرتی ہے۔

شریعت:

دین اور شریعت کا بھی یہی کام ہے کہ انسان کو برائی سے روکتی ہے اور نیکی کی ترغیب دیتی ہے۔ حدیث میں ہے: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ... الخ)) ''دین خیر خواہی کا نام ہے۔'' کس کی خیر خواہی؟ اللہ، رسول، عام مسلمانوں اور ان کے پیشواؤں کی۔[1]

قانون اور شریعت میں فرق:

انسانی قانون اور شریعت کا ایک ہی کام ہے: ''برائی کی روک تھام'' لیکن دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ عام قانون انسان بناتے ہیں، جس میں ان کی کئی مصلحتیں بھی ہوتی ہیں۔ انسانوں

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٥)

کی عقل ناقص ہے اور ہمہ دان بھی نہیں۔ اس لیے انسانی قانون کی موجودگی میں بھی برائی ہوتی ہے۔

غور کیجیے! ہمارے ملک میں موجود قانون زنا کو روکتا ہے۔ زنا خلافِ قانون اور ایک جرم ہے، لیکن زنا بند ہونے کے بجائے بڑھ رہا ہے۔ اس میں انسانی علم کے نقص کا قصور ہے، جس نے یہ قانون بنایا ہے۔ اس میں بعض پہلوؤں پر قدغن لگا دی گئی ہے اور بعض کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اس وجہ سے ملک میں زنا بند نہیں ہو رہا۔

اسی طرح شراب کا معاملہ ہے۔ تمام بندشوں، قانونی پابندیوں کے باوجود اس کے استعمال میں ہوش ربا اضافہ ہو رہا ہے۔

قتل، ڈاکا اور چوری کو دنیا کی تمام حکومتیں روکتی ہیں، لیکن انسانی قانون کے نقائص اور ''چور دروازوں'' کی وجہ سے ان میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اس کے برعکس دین اور شریعت نے کوئی چور دروازہ اور رخنہ باقی نہیں رکھا۔ بعض لوگوں نے سینہ زوری ہی سے ایسے جرائم کا ارتکاب کیا ہے، لیکن جب بھی قانونِ شریعت کا نفاذ ہوا ہے، ان جرائم کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔

زنا کی روک تھام کے لیے شریعت کے راہنما اصول:

شریعت نے ایسے احکام دیے ہیں کہ زنا پیدا ہی نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے عورتوں کو پردے کا حکم دیا ہے۔ گھروں میں بلا اجازت آنے پر پابندی لگائی ہے، مرد و زن کو آزادانہ اختلاط سے روکا ہے اور عورتوں کو سفر و حضر میں کس طرح رہنا چاہیے، اس کے متعلق بہت سے تفصیلی احکام دیے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ بہتان طرازی سے منع کیا ہے، بلکہ اس کے لیے سخت سزا مقرر کی۔ مردوں اور عورتوں کو غضِ بصر اور حفاظتِ ستر کی تلقین کی ہے۔ اس کے بعد اگر زنا کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اس پر فوراً سخت سزا دی گئی ہے۔

﴿ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ ﴾ [النور: ٣١]

مذکورہ بالا آیت میں عورتوں کو غضِ بصر اور حفاظتِ ستر کی تلقین کی ہے۔ یہی حکم اس سے پہلے مردوں کو دیا گیا ہے، جس کا بیان گزر چکا ہے، یعنی مردوں کی طرح عورتوں کو بھی بعینہٖ یہی حکم ہے۔

نظر کی حفاظت:

ہر معاشرے میں نیک و بد، دونوں طرح کے لوگ موجود رہے ہیں۔ عورتیں جب گھروں سے کسی کام کی غرض سے نکلیں گی تو ہر قسم کے لوگوں سے سامنا ہوگا، اس لیے حکم دیا ہے کہ نظر کی حفاظت کریں۔

نظر شیطنت کا تیر ہے۔ اس کے زہر سے بچنا ضروری ہے۔ شادی بیاہ اور دوسرے اجتماعات میں، جہاں مرد موجود ہوں، وہاں عورتوں کو خاص احتیاط کرنی چاہیے۔ نماز کے لیے عورتیں مسجد میں آئیں، ان کو اجازت دی ہے اور مردوں کو حکم دیا ہے: ((لَا تَمْنَعُوْا إِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ))[1]

"اللہ کی بندیوں کو مسجد میں آنے سے مت روکو۔"

لیکن اس کے ساتھ عورتوں کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ مسجد میں سادہ لباس پہن کر آئیں، زیب و زینت نہ کریں اور خوشبو لگا کر آنے کی سخت مذمت فرمائی ہے۔[2] عید کے لیے تمام عورتوں کو حکم دیا کہ عید گاہ میں پہنچیں، لیکن ان پابندیوں کا لحاظ کرتے ہوئے۔ ان تمام مواقع پر غضِ بصر کا خاص طور پر خیال ہونا چاہیے۔

شرم گاہ کی حفاظت:

مردوں کی طرح عورتوں کو بھی غضِ بصر کے ساتھ حفاظتِ فرج کا حکم دیا ہے۔ شرم گاہ کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ زنا سے بچیں۔ احادیث میں مذکور ہے کہ اس کے ساتھ حفاظتِ ستر یہ بھی ہے کہ کسی کے ستر پر نگاہ نہ ڈالی جائے۔ ایک حدیث میں ہے:

"کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو نہ دیکھے۔"[3]

مخالف صنف کے ستر کو دیکھنا اور بھی زیادہ قبیح ہے۔ اس معاملے میں یہاں تک حکم ہے کہ تنہائی میں بھی کوئی آدمی ننگا نہ بیٹھے، کیوں کہ فرشتے ہر وقت ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ فرشتے صرف رفعِ حاجت اور بیویوں کے پاس جانے کے وقت الگ ہوتے ہیں۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٠٠)

② دیکھیں: المجموع للنووي (١٩٨/٤)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٣٨)

اظہارِ زینت کی ممانعت:

﴿ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾: ''اور نہ ظاہر کریں اپنا بناؤ مگر جو اس میں سے ظاہر ہو۔''

مرد کی زینت اور خوب صورتی، اس کی سادگی اور اچھی صحت و جسم میں ہے۔ عورتوں کی زینت، اچھا لباس اور سنگار وغیرہ ہے۔ عورتوں کے لیے یہ فطرت کا ایک تقاضا ہے، لیکن اس کی نمایش کرنے سے پوری سختی سے منع کیا گیا ہے۔

زینت میں کپڑے، زیور، چہرے کے خدوخال، سر کے بال اور ان کی ساخت، پاؤں کی زینت اور بناؤ سنگار وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی غیر محرم کے سامنے کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔

برقع اور چادر، جو پردے کے لیے استعمال کی جاتی ہے، وہ زینت میں شامل نہیں ہے، لیکن ان کو بھی مزین نہیں کرنا چاہیے، بلکہ سادہ رکھنا چاہیے۔

اسلامی تعلیمات سے روگردانی کے نتائج:

غضِ بصر، حفاظتِ ستر اور زینت کے چھپانے پر اگر مکمل عمل کیا جائے تو زنا تقریباً ختم ہوسکتا ہے۔ جن علاقوں میں آج بھی پردہ اور حیا کا چلن باقی ہے، وہاں زنا اور بداخلاقی بے حد کم ہے، لیکن جن ملکوں میں ان کی پابندی کو ختم کر دیا گیا ہے، وہاں بداخلاقی ایک ''وبا'' کی طرح پھیل چکی ہے۔

امریکہ اور یورپ کے حالات اس پر شاہد ہیں۔ اب تو وہاں کا سنجیدہ طبقہ اور اہلِ علم ''حرامی بچوں'' کے تناسب میں روز بروز کے اضافے سے چیخ اٹھے ہیں اور عفیف عورتوں کی شدید کمی، بلکہ فقدان ان کے لیے سوہانِ روح بن گیا ہے۔ اس صورتِ حال کا پیدا ہونا غضِ بصر سے اِغماض کا نتیجہ ہے اور پردے کو ترک کرنے کی سزا ہے۔

کن کے سامنے عورت بے پردہ ہوسکتی ہے؟

﴿ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ ... ﴾: اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک عورت کن لوگوں کے سامنے زینت کا اظہار کرسکتی ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ ایک مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی

دوسرے کے سامنے زینت کے ساتھ پھرے، خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں۔

اس معاملے میں ہم غفلت اور چشم پوشی کا شکار ہو چکے ہیں اور اس کے برے اثرات و نتائج بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر عورت اس معاملے کو پوری طرح سمجھے اور اس پر عمل پیرا ہو۔ وہ رشتے دار حسبِ ذیل ہیں، جن کے سامنے ایک عورت اظہارِ زینت کر سکتی ہے:

1. خاوند۔
2. باپ (دادا اور نانا بھی)۔
3. خاوند کا باپ اور اس کے دادا نانا۔
4. بیٹے۔
5. خاوندوں کے بیٹے۔
6. بھائی (سگے اور سوتیلے)۔
7. بھائیوں کے بیٹے۔
8. بہنوں کے بیٹے۔
9. اپنی عورتیں، یعنی مسلمان عورتیں۔ مردوں کی طرح غیر مسلم عورتوں سے بھی پردہ ہے، البتہ وہ غیر مسلم عورتیں اس میں شامل نہیں، جو کام کاج کے سلسلے میں گھروں میں آتی جاتی ہیں۔
10. لونڈی اور غلام۔
11. ایسے مرد، جن کے دماغ خراب ہوں۔ یعنی وہ بے وقوف جن کا عورتوں کی طرف میلان نہ ہو اور بری نیت کی جرأت نہ ہو۔ مخنث (ہیجڑے) اس میں شامل نہیں ہیں۔ مدینے میں پہلے ان لوگوں کو گھروں میں جانے کی عام اجازت تھی، لیکن بعد میں رسول اکرم ﷺ نے منع فرما دیا۔[1]
12. نابالغ بچے۔

زینت چھپانے اور توبہ کرنے کا حکم:

﴿ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ ﴾ [النور: ٣١]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٢٤)

''اور وہ (عورتیں) اپنے پاؤں (زور زور سے) زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے، وہ معلوم ہو جائے۔''

ہاتھ اور پاؤں ہلا کر زیور کی جھنکار پیدا کرنا، کپڑوں کو اٹھا کر نمایش کرنا، یا کسی اور طریقے سے مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنا، ناجائز ہے۔

﴿ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿31﴾ ﴾ ''اور اے مومنو! تم مجموعی طور پر اللہ سے توبہ کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

غضِ بصر، حفاظتِ ستر اور پردہ وحجاب کے معاملے میں جو کچھ غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، ان سے توبہ کرو اور اپنے رویے کو خدا تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق درست کر لو، اسی میں تمھاری فلاح ہے![1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (16 ستمبر 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نکاح کی برکات

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۚ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿32﴾ ﴾ [النور: ۳۲]

''اورتم اپنے بے نکاح مردوں، عورتوں کے نکاح کر دو اور (ان کے بھی) جو تمھارے غلام اور لونڈیاں نیک ہوں، اگر وہ فقیر ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے انھیں غنی کر دے گا اور اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔''

زنا سے بچاؤ کی تدابیر:

بدکاری کو روکنے کے لیے اخلاقی اور تعلیمی ذمے داریوں کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔ اصل احکام کا بھی ذکر ہوا ہے اور وہ راستے کون سے ہیں جن سے یہ اخلاقی برائیاں آتی ہیں، ان کا بھی ذکر ہو رہا ہے۔ رہن سہن، آمد و رفت اور مرد و زن کی مشترکہ مجلسوں میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، اس کے متعلق بھی احکام دیے ہیں۔ یہاں تک کہ رفتار اور چلنے کے متعلق بھی خاص حکم دیا ہے۔ یہ تمام احکام اس مسئلے کے اِثباتی پہلو تھے۔

برائی کے راستے میں ایک طرح کے بند باندھے گئے ہیں۔ بداخلاقی کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں۔ مندرجہ بالا آیت سے اس معاملے اور مسئلے کی ایجابی حقیقتوں کا ذکر شروع کیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کون سی تدابیر ہیں جن کو اختیار کرنے سے یہ برائیاں پیدا ہی نہیں ہوتیں!

حلال ذرائع کی فراوانی اور سہولت ضروری ہے:

کھانا انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ آپ ایک آدمی کے سامنے حرام چیزوں کی تفصیل رکھتے ہیں،

اس کو اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور ان کے کھانے پر حد جاری کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی اس معاملے میں یہ امر بھی بے حد ضروری ہے کہ حلال روزی کے ذرائع کھلے ہوں اور حلال کمانے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ دوسروں کا مال کھانا بے حد برا ہے، لیکن اس کے ساتھ اصل راہ بھی بتانی چاہیے۔

اسی طرح جنسی تعلق اور بقائے نسل کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ جب اس خواہش کو پورا کرنے کے فطری طریقے آسان نہ ہوں یا مسدود ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ برائی پیدا نہ ہو۔ اسلام نے جہاں زنا پر سخت سزا دی ہے، وہاں نکاح کے لیے بھی آسانی پیدا کی ہے اور حکم دیا ہے کہ کوئی شخص مجرد نہ رہے۔ تمام بالغوں کا نکاح ہونا چاہیے۔ اگر ایسا کسی کے معاملے میں ممکن نہ ہو تو اس کو کس طرح زندگی گزارنی چاہیے، اس کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

نکاح کا حکم:

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾: ''اور نکاح کرو بن بیاہوں کا اپنے میں سے۔''

﴿ اَلْاَيَامٰى ﴾ یہ ''أَيِّمٌ'' کی جمع ہے، اس سے وہ تمام مرد مراد ہیں، جن کی بیویاں نہ ہوں، یعنی بالغ مرد و زن، خواہ کنوارے ہوں یا بیوہ و مطلقہ۔[1]

اس آیت میں لوگوں کو حکم دیا ہے کہ اے مسلمانو! تم میں سے جو مجرد ہوں، ان کا نکاح کر دو۔ ایک حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص نکاح کی درخواست کرے جس کے اخلاق اور دین سے تم خوش ہو تو نکاح کرو، ورنہ زمین میں فساد ہو گا۔[2]

﴿ اَنْكِحُوا ﴾ امر کا صیغہ ہے۔ اس لیے اس آیت سے بعض علماء نے وجوب ثابت کیا ہے، لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ اس کو مستحب کہتے ہیں۔ محدثینِ کرام نے کہا ہے کہ یہ قریب قریب سنتِ مؤکدہ ہے۔

جہیز کی رکاوٹ:

لڑکا لڑکی کے بالغ ہوتے ہی والدین یا سر پرستوں اور دوسرے رشتے داروں کو فوراً توجہ کرنی

[1] مختار الصحاح (ص: ۲۷)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۰۸٤)

چاہیے۔ زیادہ عمر تک نکاح نہ کرنا، بداخلاقی کی راہ آسان کرتا ہے۔ بعض دفعہ مجبوری میں رشتوں کی دیکھ بھال میں دیر ہو جاتی ہے، اس پر گرفت نہیں ہے، لیکن جہیز کی وجہ سے ایسا کرنا بے حد غلط ہے۔ یہ بیماری معاشرے کو برائیوں میں مبتلا کرنے کا باعث بن رہی ہے۔

جہیز کی حیثیت دین میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کو اگر کوئی اہمیت حاصل ہوتی تو رسولِ اکرم ﷺ اپنی بیٹی کو جس قدر زیادہ سے زیادہ چاہتے، جہیز دے سکتے تھے، لیکن دین و دنیا کے بادشاہ نے اپنی بیٹی کو بھی، فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی پیاری بیٹی، کو کیا جہیز دیا تھا:

1 ایک مٹی کا گھڑا۔ 2 دو عدد تکیے۔ 3 دو بستر۔ 4 ایک چکی۔ [1]

جہیز فرض ہے نہ واجب وسنت، صرف جائز ومباح ہے۔ جہیز کی زیادتی اور پھر اس کا پُرزور مطالبہ، نکاح کے راستے میں زبردست رکاوٹ بن گیا ہے۔ اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی قانون ہی اس رکاوٹ کو ختم کرے گا، اگر اس قانون کا نفاذ کسی ڈھنگ کے طریقے سے ہو گیا۔

نکاحِ ثانی کی ترغیب:

جوان عورت، مطلقہ ہو یا بیوہ، اس کا نکاح بھی کر دینا چاہیے۔ نکاحِ ثانی کو عیب سمجھنا غلط ہے۔ اس کے خلاف شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے تحریکِ مجاہدین کے دوران میں کوشش کی تھی اور ایک فتویٰ بھی جاری کیا تھا۔ اگرچہ اس سے تحریک کو نقصان بھی ہوا۔ اب لوگوں میں اگرچہ یہ غلط رسم عام طور پر ختم ہو چکی ہے، لیکن بعض لوگ ابھی تک اس کے پابند ہیں، جو بالکل غلط ہے!

رسولِ اکرم ﷺ کا ایک فرمان ہے کہ دو چیزوں میں دیر نہ کرو:

1. نماز کا جب وقت ہو جائے تو فوراً ادا کرو۔
2. لڑکی جب بالغ ہو جائے تو اس کے نکاح میں دیر نہ کرو۔ [2]

لونڈی اور غلام کا حکم:

﴿ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ﴾ لونڈی اور غلام کے معاملے میں دو امور ملحوظ رکھنے چاہئیں:

---

[1] مسند أحمد، رقم الحديث (٨٣٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٥٢)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧١، ١٠٧٥)

① یہ کہ وہ لونڈی اور غلام ایسے ہوں کہ نکاح کی ذمے داری پوری کر سکیں۔
② یہ کہ مالک کے ساتھ ان کا رویہ درست ہو۔ اگر نیک ہوں تو ہی مالک کی خدمت بھی ملحوظ رکھ سکیں گے۔

ولایتِ نکاح:

﴿ اَنْكِحُوا ﴾ ''تم ان کا نکاح کرو۔'' علمائے شافعیہ نے اس لفظ سے یہ بات نکالی ہے کہ بغیر ولی کے نکاح درست نہیں۔ امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ نے بھی عورت کو بغیر ولی کے نکاح سے منع کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بالغ لڑکی کو ولی کے بغیر نکاح کی اجازت دیتے ہیں۔

ناپسندیدگی کی صورت میں ایک ولی کی ولایت ختم ہوسکتی ہے۔ اگر ولی خیر خواہ نہ ہو تو بادشاہ، حاکمِ وقت یا محلے اور برادری کا چوہدری بھی ولی بن سکتا ہے۔ نکاح میں لڑکی کے جذبات اور پسند کا خیال زیادہ ہونا چاہیے۔

غربت کی وجہ سے نکاح نہ کرنا:

﴿ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝32 ﴾

''اگر وہ فقیر ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے انھیں غنی کر دے گا اور اللہ بہت وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔''

مفلسی کی وجہ سے نکاح نہ کرنا یا غربت کی وجہ سے کسی کا رشتہ قبول نہ کرنا، درست نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: برکت عورت میں ہے۔[1] ہم عورتیں ہی دولت کا باعث ہیں:

﴿ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ ﴾ [التوبة: ٢٨]

فقر سے مت ڈرو، بلکہ نکاح کرو۔ اللہ تعالیٰ غنا کی راہ پیدا کر دے گا۔[2]



① المستدرك للحاكم (٧٦٧٩) السلسلة الضعيفة (٢٤٨٧)

② ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (7 اکتوبر 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

غلاموں سے حسنِ سلوک اور ان کی آزادی

﴿ وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَالَّذِيۡنَ يَبۡتَغُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ فَكَاتِبُوۡهُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا ۖ وَّاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ ﴾ [النور: ۳۳]

''اور جو لوگ نکاح (کی طاقت) نہیں پاتے انھیں پاک دامن رہنا چاہیے، حتی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انھیں غنی کر دے، اور جن (لونڈیوں یا غلاموں) کے تمھارے دائیں ہاتھ مالک بنے ہیں مکاتبت کرنا (آزادی کی تحریر لکھانا) چاہیں، اگر تمھیں ان میں کوئی بھلائی معلوم ہو تو تم ان سے مکاتبت کرلو اور تم انھیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمھیں دیا ہے۔''

پاک دامنی کی تلقین:

''نکاح'' پاکبازی کی راہ ہے اور بداخلاقی کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ اس سے قبل کی آیت میں نکاح کی پُرزور تلقین کی ہے، اس آیت میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ جو شادی کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اس کو زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیے۔ فرمایا: ''وہ پاک دامنی اختیار کرے'' اور ''ضبط کرے''۔

﴿ وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ ﴾ اس کی وضاحت احادیث میں ملتی ہے کہ جو شخص نکاح کی ضروریات پوری نہ کرسکتا ہو، اس کو چاہیے کہ روزے رکھے، کیونکہ روزہ انسان میں ضبط اور تقویٰ پیدا کرتا ہے اور برائی سے بچنے کی صلاحیت سے بہرہ ور کرتا ہے۔[1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٦٥)

نکاح کی ترغیب:

ایک حدیث میں ہے کہ تین آدمی ایسے ہیں جن کی مدد اللہ تعالیٰ کرتے ہیں:

1. وہ آدمی جو برائی سے محفوظ رہنے کے لیے نکاح کرے۔
2. وہ غلام جو کتابت (آزادی کی تحریر) کی ادائیگی کی نیت رکھتا ہو۔
3. وہ شخص جو جہاد کے لیے گھر سے نکلے۔[1]

ایک حدیث میں فرمایا ہے:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ))[2]

''اے جوانو! تم میں سے جو شادی کر سکتا ہو، وہ شادی کر لے، کیوں کہ یہ نظر بازی سے بچاتی اور عصمت قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔ جو نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ روزے رکھے، کیوں کہ روزہ آدمی کا جوش کم کرتا ہے۔''

نکاح کی طاقت سے مراد:

﴿ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا ﴾: کون سا آدمی نکاح کرے اور کون ﴿ لَا يَجِدُوْنَ ﴾ کے ضمن میں آتا ہے؟ کس قدر مال و دولت ہو تو وہ مقدرت سمجھی جائے؟ کس قدر ذرائع آمدن ہوں تو شادی کرے، ورنہ پاک دامنی اختیار کرے اور روزے رکھے؟ اس کے لیے کوئی نصاب اور پیمانہ مقرر نہیں کیا گیا۔ زندگی کی واجبی ضروریات فراہم کر سکتا ہو اور اس قدر آمدنی ہو کہ سادہ زندگی بسر ہو سکتی ہو تو وہ ﴿ يَجِدُوْنَ ﴾ کے ضمن میں آتا ہے۔

ایک واقعہ:

اس کی وضاحت اس واقعے میں پوری طرح ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے آپ ﷺ سے نکاح کی خواہش ظاہر کی۔ آپ ﷺ کو کوئی خواہش نہ تھی، اس

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٥٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٦٥)

لیے ایک صحابی نے کہا کہ اس عورت کا نکاح مجھ سے کر دیا جائے، جس کو رسول اللہ ﷺ نے قبول کر لیا۔ آپ ﷺ نے اس صحابی کو مہر کے لیے گھر سے کچھ لانے کا حکم دیا۔ جب وہ گھر سے واپس آئے تو ایک حقیری سی چیز خدمت میں پیش کر کے فرمایا کہ گھر کی بس یہی کل کائنات ہے۔ آپ ﷺ نے نکاح پڑھ دیا۔ پھر وہ چیز ان کو واپس کر دی کہ بازار میں فروخت کر کے کلہاڑی لے آئیں، جس میں لکڑی کا دستہ آپ ﷺ نے خود ڈال کر دیا، تاکہ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کریں اور گھر کی ضروریات پوری کیا کریں۔[1]

غور کیجیے کہ یہاں استطاعت کا کیا حال تھا؟ لیکن خود شارع علیہ السلام نے نکاح کر دیا: ﴿لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا﴾ سے مراد یہی ہے کہ وہ ایسے حالات میں ہوں کہ کفالت کر سکیں۔ زندگی بسر کرنے کے لیے کم سے کم جو ضروریات ہیں، وہ ان کو میسر ہوں۔

مکاتبت:

﴿وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا﴾ [النور: ٣٣]

ایک غلام اگر اپنے مالک سے یہ درخواست کرے کہ وہ اس قدر مال یا معاوضہ ادا کر کے آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے، پھر اس معاملے میں فریقین ایک مقدار اور مدت طے کر کے تحریر کر لیتے ہیں، تو اس کو ''مکاتبت'' کہا جاتا ہے اور اس غلام کو ''مکاتَب''۔ کوئی مالک اس کتابت کے بعد غلام کی آزادی میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ مقررہ مال ادا کرنے کے بعد وہ غلام آزاد ہو گا۔

جب غلام اس ''مکاتبت'' (آزادی کی تحریر) کی درخواست کرے تو مالک پر یہ امر واجب ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک غلام (سیرین) یہی شکایت لے کر گئے کہ ان کے مالک

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں جو یکجا ہو گئے ہیں۔ نکاح کے خواہش مند کا نکاح آپ ﷺ نے قرآن مجید کی چند سورتیں بیوی کو پڑھانے کے عوض کر دیا تھا۔ (صحيح البخاري، رقم الحديث: ٥١٤٩) جبکہ کلہاڑی میں دستہ ایک اور صاحب کو ڈال کر دیا تھا جو سوال کے لیے آئے تھے، مگر آپ ﷺ نے انھیں محنت کے راستے پر لگایا۔ (سنن أبي داود، رقم الحديث: ١٦٤١) واللہ أعلم (عبدالسلام)

حضرت انس رضی اللہ عنہ مکاتبت نہیں کرتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی طرف دُرّہ لے کر آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مکاتبت کر لو، تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟[1]

ایک جاہلانہ اعتراض:

یہاں بعض لوگ اپنی کم علمی کی وجہ سے ایک بے معنی اعتراض کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ اسلام نے ''مکاتبت'' جیسے آزادی کے طریقے اختیار کرنے کے بجائے غلامی کو یکسر ختم کیوں نہ کر دیا؟ ایسا کہنے والے یہ بات اپنی ''جہالت'' کی وجہ سے کہتے ہیں۔ میں ان لوگوں سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اس دور میں کوئی حکومت ایسا کر سکتی ہے کہ بینکنگ کے سودی نظام کو یک دم ختم کر دے؟ ایسا کرنے سے کیا نظام چل سکتا ہے؟ اس کو بدلنے اور اس کی جگہ بلا سود نظام قائم کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ یہی صورتِ حال اس وقت غلامی کی تھی۔

عرب کا سارا معاشی اور معاشرتی نظام غلاموں کے ذریعے سے چل رہا تھا۔ اس وقت تجارت وصنعت کا انحصار تنخواہ دار مزدوروں اور نوکروں کے بجائے غلاموں پر تھا۔ اگر غلامی کو ایک دم ختم کر دیا جاتا تو سارا نظام تباہ ہو جاتا اور پورا عرب سخت معاشی بحران میں مبتلا ہو جاتا۔

پھر غلامی کی بھی کئی قسمیں تھیں۔ بعض کو لڑائی کے نتیجے میں غلام بنایا گیا تھا، کچھ آزاد لوگوں کو پکڑ کر غلام بنا لیا گیا تھا اور ایسے لوگ بھی خاصی تعداد میں تھے جو نسل در نسل غلام چلے آ رہے تھے اور کچھ علم نہ تھا کہ ان کے باپ دادا کو کس طرح غلام بنا لیا گیا تھا۔

''غلامی'' کو یکسر اور یکدم ختم کرنے کا تجربہ ماضی قریب ہی میں امریکہ میں ہوا ہے، لیکن اس اقدام کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اول تو اس اِقدام سے امریکہ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی، دوسرا کالوں کا مسئلہ جوں کا توں باقی ہے اور سفید فام ان کو کوئی حق دینے کو تیار نہیں، بلکہ اب بھی سیاہ فام لوگوں کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

غلامی کے خاتمے کے لیے اسلام کے حکیمانہ اقدامات:

غور کیجیے کہ اسلام نے اس خطرناک طریقے کو اختیار کرنے کے بجائے ایک بہتر طریقہ اختیار

[1] فتح الباري (١٨٦/٥)

کیا تھا، جس سے نتیجے کے طور پر غلامی کا مسئلہ ختم ہو گیا اور مذکورہ خرابیوں میں سے کسی ایک خرابی کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا۔

اسلام نے ایک تو یہی ''مکاتبت'' کا طریقہ جاری کیا کہ اگر غلام اس امر کی درخواست کرے تو اس کو قبول کرنا مالک کے لیے ضروری ہے۔

دوسرا اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کی بے حد ترغیب دی، اسی ترغیب کے نتیجے میں آزادی کی ایک صورت یہ بن گئی تھی کہ مالک وصیت کرتا تھا کہ اس کی موت کے بعد غلام آزاد ہو گا۔ اسی طرح وہ لونڈی جس سے مالک کی اولاد پیدا ہو جائے، وہ مالک کی وفات کے بعد آزاد ہو جاتی ہے۔

گناہوں کے کفارے میں غلاموں کو آزاد کیا جاتا ہے۔ غلام کو آزاد کرنے کی اس قدر ترغیب دی گئی کہ لوگوں نے بے شمار غلام آزاد کیے۔ اس کا اندازہ صرف ایک مثال سے کیجیے کہ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں 30 ہزار غلام آزاد کیے تھے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (14 اکتوبر 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام میں غلامی

﴿وَلۡیَسۡتَعۡفِفِ الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ نِکَاحًا حَتّٰی یُغۡنِیَہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَالَّذِیۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ الۡکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ فَکَاتِبُوۡہُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡہِمۡ خَیۡرًا ٭ۖ وَّاٰتُوۡہُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ وَلَا تُکۡرِہُوۡا فَتَیٰتِکُمۡ عَلَی الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا لِّتَبۡتَغُوۡا عَرَضَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَمَنۡ یُّکۡرِہۡہُّنَّ فَاِنَّ اللّٰہَ مِنۡۢ بَعۡدِ اِکۡرَاہِہِنَّ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۳﴾﴾ [النور: ۳۳]

''اور جو لوگ نکاح (کی طاقت) نہیں پاتے انھیں پاک دامن رہنا چاہیے، حتی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انھیں غنی کر دے، اور جن (لونڈیوں یا غلاموں) کے تمھارے دائیں ہاتھ مالک بنے ہیں مکاتبت کرنا (آزادی کی تحریر لکھانا) چاہیں، اگر تمھیں ان میں کوئی بھلائی معلوم ہو تو تم ان سے مکاتبت کر لو اور تم انھیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمھیں دیا ہے اور تمھاری لونڈیاں اگر پاک دامن رہنا چاہیں تو تم دنیاوی زندگی کا سامان تلاش کرنے کی خاطر انھیں بدکاری پر مجبور نہ کرو اور جو کوئی انھیں مجبور کرے تو بے شک ان کے مجبور کیے جانے کے بعد اللہ (ان کے لیے) غفور رحیم ہے۔''

اسلامی معاشرے میں اخلاق کی کیا اہمیت ہے؟ پاکبازی اور عفت کا کیا درجہ ہے؟ فواحش اور بے حیائی سے اجتناب کیوں ضروری ہے؟ ان کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔

فحاشی اور غلامی کے خاتمے کے لیے اقدامات:

رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کی اخلاقی تربیت میں صرف کر دی۔ خاص طور پر مدینے کے قیام کے دس سال میں اسی تربیت کے اثر سے اہلِ ایمان میں ایک انقلاب برپا ہو گیا،

تمام معاشرہ بدل گیا اور رسول اکرم ﷺ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ آزاد مرد و زن میں بے حیائی ختم ہو گئی اور لونڈی غلاموں کے لیے بھی خاص ہدایات دیں، تاکہ زندگی کا یہ شعبہ بھی پاک اور صاف ہو جائے۔

﴿ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ﴾ [النور: ۳۲] لونڈی اور غلاموں کے نکاح کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسری ہدایت کی ہے کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ غلاموں کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے۔ مسلمانوں کو مکاتبت کا حکم دیا، یعنی جو غلام مال کی ایک خاص مقدار، جو فریقین میں طے ہو جائے، ادا کر کے آزادی کے حصول کا خواہش مند ہو تو مالک کے لیے لازم ہے کہ وہ اس سے معاملہ طے کر لے۔

غلامی اور غیر مسلم اقوام کا طرزِ عمل:

غلامی کے سلسلے میں بعض عیسائی مستشرقین اور ہندوؤں نے اسلام پر بے جا حملے کیے ہیں، جن کا کچھ ذکر پچھلے خطبے میں ہو چکا ہے۔ مغربی مصنفین کے دفاع میں کچھ لوگوں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا، جس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

یورپی اقوام سے دریافت کرنا چاہیے کہ انھوں نے ایشیائی قوموں اور افریقہ کے رہنے والوں سے کیا سلوک کیا ہے اور کر رہے ہیں؟ کیا یہ بدترین قسم کی غلامی نہیں؟ امریکہ میں سیاہ فام لوگوں سے کیا سلوک ہو رہا ہے؟ یہ آزادی کی کون سی قسم ہے؟ کیا عیسائیت اور ہندومت، دونوں نے غلامی ختم کی ہے؟ اقلیتوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے، وہ غلامی سے کسی طرح کم نہیں۔

جنگِ عظیم کے خاتمے پر جرمنی، جاپان اور ترکی کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے؟ ان ملکوں کے حصے بخرے ہوئے اور لوگوں کو غلام بنا دیا گیا۔ جن ملکوں کو بظاہر آزاد کیا گیا ہے، وہ اقتصادی طور پر آج بھی غلام ہیں۔ اکثر و بیشتر ممالک آج بھی معاشی اور مالی لحاظ سے غلام ہیں۔

کئی ملک سیاسی طور پر آزاد نہیں ہیں۔ غلامی کی شکلیں البتہ بدل گئی ہیں اور مستقبل کے متعلق مزید خرابی کی پوری توقع ہے! یہی نہیں کہ اسلام نے اس طرح کا ناجائز استحصال اور غلامی کا یہ طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ اس وقت کے مروجہ غلامی کے نظام کو بھی حکمت اور عقل سے بدل دیا۔

اسلام میں غلاموں سے حسنِ سلوک کی تلقین:

اس وقت جنگی قیدیوں کے لیے کیمپ نہیں ہوتے تھے اور اس دور کے وسائل کے مطابق غالبًا یہ ممکن بھی نہ تھا۔ اس لیے جنگی قیدیوں کو ایک خاص طریقے سے تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس طریقے کو اسلام نے قائم رکھا، لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کے ساتھ برابر کے سلوک کی تلقین کی۔ غلاموں کو دوسرے درجے کے شہری بنا دینے کے بجائے حکم دیا: ''ان کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاؤ اور وہ پہناؤ جو تم خود پہنو۔''[1]

اس برابر کے سلوک کی تلقین ہی کا اثر تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے خلیفہ، اپنے غلام کو سفر کے دوران میں اونٹ پر باری سے سوار کراتے تھے اور خود ساتھ چلتے تھے۔ صرف برابری کے سلوک کی تلقین نہیں کی، بلکہ حسنِ سلوک کی تلقین بھی کی ہے۔

ایک واقعہ:

اس کے علاوہ ہر ممکن اور مناسب طریقے سے غلامی کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ جنگِ حنین کا واقعہ ہے۔

یہ جنگ مکہ سے واپسی پر ہوئی اور اس میں مسلمانوں نے کافی جنگی قیدی بنائے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافی دنوں تک انتظار کیا کہ وہ قوم آ کر اپنی عورتیں، بچے اور مال لے جائیں، لیکن کافی انتظار کے بعد کوئی بھی نہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت اور قیدی بانٹ دیے۔ جب ان لوگوں کو اس کا علم ہوا تو ان میں سے کچھ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ ان کی عورتیں، بچے اور مال واپس کر دیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے تمھارا انتظار کیا تھا۔ اب تم عورتیں اور بچے لے جاؤ یا مال لے لو۔''

انھوں نے عورتیں اور بچے واپس کرنے کی درخواست کی، جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کر لیا اور تقسیم کیے ہوئے غلام مسلمانوں سے واپس لے کر ان کو دے دیے۔[2]

اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے غلامی کے مسئلے کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٤٥)

[2] مسند أحمد، رقم الحديث (٦٧٢٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٩٤)

ایک صحابی نے غلام کو تھپڑ مار دیا، ایسے ہی نہیں، بلکہ غلطی سے ایسا کیا تھا۔ غالباً غلام نے ایک بکری ضائع کر دی تھی، لیکن ایک دوسرے صحابی کے ٹوکنے پر انھوں نے غلام کو آزاد کر دیا۔[1]

غلام کے ساتھ مالی تعاون کا حکم:

غور کیجیے! ایک تو مسلمانوں کو مکاتبت کرنے کا پابند کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی حکم ہے کہ ان کی مالی امداد بھی کرو: ﴿ وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ ﴾ [النور: ۳۳] ''اور تم انھیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمھیں دیا ہے۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے غلاموں کو کتابت کی قسط میں ایک چوتھائی رقم معاف کر دیا کرتے تھے۔

غلاموں میں ''خیر'' سے مراد:

﴿ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا ﴾ ''ان سے مکاتبت کرلو اگر تم کو ان میں بھلائی معلوم ہو۔''

یہاں ﴿ خَیْرًا ﴾ سے کیا مراد ہے؟ اس کے معنی مختلف بیان کیے گئے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:

1. یہ کہ غلام تندرست اور صحت مند ہو، جو کوشش اور محنت کر کے کما سکتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ غلام معذور ہو اور کمانے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور ملت پر بوجھ بن جائے۔ ایسا غلام آزاد نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس کی ضروریات کو پورا کرنا مالک کا ذمہ ہے۔
2. ﴿ خَیْرًا ﴾ کا دوسرا مطلب مال بیان کیا گیا ہے، یعنی اس کے پاس مال ہو، اقساط ادا کر سکتا ہو۔ لیکن یہ جچتا نہیں ہے، کیوں کہ اس سے مراد عام استعداد ہے۔
3. ﴿ خَیْرًا ﴾ سے مراد دین ہے، یعنی وہ غلام آزاد ہو کر دین کی خدمت کر سکے۔
4. وہ غلام مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچا سکتا ہو۔
5. ﴿ خَیْرًا ﴾ سے مراد ''حرفہ'' (پیشہ) ہے، یہ کہ غلام ہنر مند ہو۔ ایسا نہ ہو کہ بھیک مانگتا پھرے۔

لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کرنے کی ممانعت:

﴿ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَیٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ ... ﴾ ''اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔'' بعض لوگ لونڈیاں خریدتے تھے اور ان سے قحبہ گری کراتے تھے اور ان کی حرام کمائی کھاتے تھے۔

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٦٥٩)

عورت فطرتاً عفیف ہوتی ہے، لیکن دنیا پرست اس کو غلط راستے پر چلاتے ہیں۔ حکم ہوا: ﴿وَلَا تُكْرِهُوْا﴾ برائی پر ان کو مجبور نہ کرو۔ اس آیت کے نزول کے وقت عبداللہ بن ابی نے، جو منافقوں کا سردار تھا، ایک چکلہ کھولا ہوا تھا۔ اس میں ایک لونڈی (معاذہ)[1] مسلمان ہوگئی اور زنا سے توبہ کر لی۔ عبداللہ بن اُبی نے اس پر سختی کی تو اس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس امر کی شکایت کی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے معاملہ رسول اکرم ﷺ کے سامنے رکھا تو اس موقعے پر یہ آیات نازل ہوئیں، چنانچہ لونڈی کو آزاد کرایا گیا اور رسول اکرم ﷺ نے لونڈی کی ایسی کمائی کو حرام قرار دیا اور مسلمانوں کو اس سے سختی سے منع فرمایا۔

لونڈی کی کمائی:

ایک حدیث میں ہے: «نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ كَسْبِ الْأَمَةِ حَتّٰى يَعْلَمَ مِنْ أَيْنَ هُوَ»[2] حضور ﷺ نے لونڈی سے کسی بھی قسم کی کمائی وصول کرنے سے روکا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ آمدنی اس نے کیسے حاصل کی ہے!

یعنی لونڈیوں کی ایسی کمائی اور زنا کی آمدنی وصول کرنے سے منع کیا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾: یعنی جن کو برائی پر مجبور کیا گیا، خدا انھیں معاف کرے گا۔ کوئی بھی برا کام جبر سے کرایا جائے اور کرنے والے کے اختیار میں نہ ہو تو اس پر مواخذہ نہیں ہے، کیوں کہ وہ مجرم بھی نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی نابکار کسی کے منہ میں شراب کا گلاس انڈیل دے، اس کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اللہ غفور رحیم معاف کرے گا۔[3]



---

[1] جامع البیان (١٦/٢٩٢) ط: هجر. صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٠٢٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٤٢٩)

[3] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (28 اکتوبر 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نور اور اس کے مطالب

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۗ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۗ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۚ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ۗ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿35﴾ ﴾ [النور: ۳۵]

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال (یوں ہے) جیسے ایک طاق ہو، جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشے (کی قندیل) میں ہو، شیشہ جیسے چمکتا ستارہ ہو، وہ (چراغ) ایک مبارک درخت زیتون (کے تیل) سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، یوں لگے جیسے اس کا تیل خود بخود روشن ہو جائے گا، اگرچہ اسے آگ نے نہ چھوا ہو، (وہ) نور علی نور ہے۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے راہنمائی کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔''

ربطِ آیات:

سورت نور کی ابتداء سے اس مقام تک اخلاق کے معیار کو بلند کرنے کے لیے مختلف پابندیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہاں سے پہلے قیود کا ذکر ایک دوسرے رنگ میں کیا ہے۔ یہ پابندیاں بظاہر پابندیاں ہیں؛ عورتوں اور مردوں کو غضِ بصر کا حکم، حفاظتِ فرج کا حکم، عورتوں کے لیے پردے کا حکم، لعان، قذف، حدِ زنا، نکاح کا حکم، جسم فروشی، بہتان تراشی اور غلاموں کی آزادی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہاں ذکر یہ ہوا ہے کہ ان پابندیوں کے پیچھے ایک نور اور ایک روشنی ہے۔

انسان جب ایک خاص کیفیت اور حالت سے متاثر ہوتا ہے تو دوسری چیزوں کو دیکھتا ہے۔ سورج کی روشنی میں انسان نظر سے دیکھتا ہے۔ نظر میں بھی ایک نور ہے، جب تک یہ درست ہو تو اس روشنی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ آنکھوں میں نور نہیں تو کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آنکھوں میں نور بھی ہو لیکن باہر اندھیرا ہو تو اس صورت میں بھی دیکھنا ممکن نہیں۔ روشنی سے نظر متاثر ہوتی ہے اور باہر سے اس کو مدد ملتی ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح قائم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس روشنی کا خالق و بانی ہے۔

بصارت و بصیرت:

آنکھیں، سورج اور چاند ستارے، سب اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ روشنی نور ہے۔ انسان میں بھی نور ہے، لیکن انسان سارے کا سارا نور نہیں ہے۔ غور کیجیے! آنکھیں بند ہوں تو نظر نہیں آئے گا۔ انبیائے کرام علیہم السلام تک کا معاملہ اسی طرح ہے۔

نظر کا نور ہے، جس کو بصارت کہا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے دماغ میں بھی ایک تیز روشنی اور نور رکھا ہے، جس کو بصیرت کہا جاتا ہے۔ عقل یا نظر تہہ کے نیچے نہیں دیکھ سکتی، جب کہ یہاں بصیرت کام کرتی ہے اور تہہ کے نیچے تک دیکھ لیتی ہے۔ یعنی ''بصیرت'' بصارت سے زیادہ روشن اور طاقتور ہے۔

انسان آج تک اس کا پتا نہیں کر سکا کہ روح اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ جسم اور روح کا تعلق کس طرح ہے؟ آج تک انسان کو پتا نہیں چل سکا! انسان صرف اس قدر جانتے ہیں کہ روح نکل گئی، جسم بے حس ہوا اور موت واقع ہوگئی۔ اس روح کو آج تک بصارت اور نہ بصیرت ہی دیکھ سکی ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام تک اس کو نہیں دیکھ سکے۔ ہماری اور ان کی حیثیت میں جو فرق ہے، اس کے باوجود وہ روح کو نہیں دیکھ سکے۔

نورِ رسالت:

بعض لوگ رسولِ اکرم ﷺ کو ''نور'' کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا دعویٰ نبوت کا تھا اور آپ ﷺ اسی نور سے منور تھے۔ دوسرے نور کا کام بالکل محدود ہے، جب کہ آپ ﷺ تو نورِ ہدایت لے کر آئے تھے: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝15﴾ نور سے مراد شریعت اور دین ہے، یہ نورِ ہدایت ہے جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ گھر میں دیا (چراغ) نہیں تھا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور میں آگے لیٹی ہوئی تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے کے لیے جھکتے اور زمین پر ہاتھ مارتے تو میں پاؤں سمیٹ لیتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے۔ [1]

حضرت موجود تھے، لیکن دیا نہ ہونے کی وجہ سے روشنی نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ نور دیے اور چراغ کی مانند نہ تھا، بلکہ وہ نورِ ہدایت تھا۔

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾: اس سے مراد یہ ہے کہ تمام دنیا کو روشن کرنے والا اللہ ہی ہے۔ دینی اور دنیاوی، سب روشنیاں اسی کی عطا کردہ ہیں۔ ضیاء، بصارت، بصیرت، دین، سب اسی کا عطیہ ہے۔ انبیاء کو نور کہنا انبیاء کی شان نہیں، بلکہ توہین ہے۔

نورِ نظر کی بے بسی:

نظر ''نور'' ہے اور یہ اس کیفیت کا نام ہے جس سے ہم دیکھتے ہیں۔ یہ روشنی انسانی زندگی کے لیے مفید اور ضروری ہے۔ اسی سے زندگی کا لطف ہے اور اس کا ختم ہونا یا نہ ہونا مصیبت ہے۔ اس نور کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔

خدا تعالیٰ ایسا نور نہیں ہے جس میں کمزوریاں ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کمزوریوں سے پاک ہے۔ نظر کے راستے میں رکاٹ ہو تو وہ بے کار ہے، اندھیرا ہو تو کام ختم، لیکن نورِ خدا ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دنیا کا کوئی حصہ پوشیدہ نہیں ہے۔

انسانی نظر ایک حد تک کام کرتی ہے؛ یہ کمزور اور محدود ہے، جب کہ ذاتِ حق لامحدود ہے، جو ساری کائنات کو دیکھ رہی ہے، اس سے کوئی مخفی نہیں ہے۔ ہماری نظر کا عالم تو یہ ہے کہ بعض چیزیں ہمارے بالکل قریب ہیں، لیکن ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے، جیسے: خوردبین سے نظر آنے والے جراثیم، دور سے نظر آنے والی اشیاء ہمیں چھوٹی نظر آتی ہیں۔ سورج زمین سے کئی لاکھ گنا بڑا ہے، لیکن ہمیں کئی لاکھ گنا چھوٹا نظر آتا ہے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٢)

نور سے مراد ضیاء ہے:

ضیاء سے دو چیزیں مراد ہیں:

1 بلب کے اندر کی آگ۔

2 بلب کے باہر سب طرف پھیلی ہوئی روشنی۔

سب روشنیاں کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہیں، جبکہ خدا اس معنی میں نور نہیں ہے اور اس معنی میں ضیا بھی نہیں۔

ہم خوب صورتی کو بھی نور سے تعبیر کرتے ہیں۔ زینت، خوبروئی بھی نور ہے۔ تمام نوعِ انسانی اپنی اپنی جگہ زینت سے مزین ہے۔ جانور اور پرندوں تک میں خوب صورتی ہے۔ زینت کی جو بھی مقدار ہے، وہ سب خدا کی عطا کردہ ہے اور اسی کی وجہ سے ہے۔

ایسا کہنا درست ہے کہ فلاں میں خدا کا نور ہے! بلکہ سب میں خدا کا نور ہے۔ یہ نور مخلوق ہے اور خدا کا عطا کردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب اقسامِ نور سے پاک ہے، وہ بے مثال اور بے عیب ہے۔

خدا کے نور سے کوئی ٹکڑا جدا نہیں ہوا، جو "نُورٌ مِّنْ نُورِ اللّٰهِ" ہو۔ اللہ تعالیٰ "اَلصَّمَد" ہے۔ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ کسی نبی کے متعلق ایسا تصور رکھنا کفر ہے، بلکہ ایسا کہنا چاہیے کہ خدا نے پیدا کیا اور نور عطا کیا۔

نورِ ہدایت:

اس آیت میں بھی آگے چل کر خود اللہ تعالیٰ نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے: ﴿يَهْدِي اللّٰهُ لِنُورِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ "راہ دکھاتا ہے اللہ طرف اپنے نور کی، جس کو چاہتا ہے۔" یعنی جس کو چاہتا ہے توفیقِ ہدایت عطا کرتا ہے۔

قرآنِ مجید اور دوسری آسمانی کتابیں بھی نور ہیں اور اس معنی میں تمام انبیاء رسولِ اکرم ﷺ سمیت، نور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کا ذخیرہ عطا کیا اور اس ذخیرے کو وجۂ ہدایت بنایا۔

غور کیجیے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی پوری طرح مخالفت کی، لیکن جب نورِ ہدایت نے راہنمائی کی تو حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مختلف خداؤں کو مانتے اور مسترد کرتے

ہوئے نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے۔ یہ صرف اسی نور کی بدولت ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے سوموار کو دعوائے نبوت کیا اور منگل کی صبح کو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے، یہ اسی نورِ ہدایت کا کرشمہ تھا۔

﴿ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ﴾: اللہ تعالیٰ نے یہ مثالیں اس لیے بیان کی ہیں کہ لوگ ہدایت حاصل کریں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون ہدایت کا خواہش مند ہے اور کون دنیا کا طالب![1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (4 نومبر 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تسبیح و ذکر کے مقام (مساجد)

﴿ اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِهٖ كَمِشۡكٰوةٍ فِيۡهَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِىۡ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوۡكَبٌ دُرِّىٌّ يُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيۡتُوۡنَةٍ لَّا شَرۡقِيَّةٍ وَّلَا غَرۡبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيۡتُهَا يُضِىۡٓءُ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡهُ نَارٌ ؕ نُوۡرٌ عَلٰى نُوۡرٍ ؕ يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَيَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثٰلَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۙ﴿35﴾ فِىۡ بُيُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَيُذۡكَرَ فِيۡهَا اسۡمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيۡهَا بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ۙ﴿36﴾ ﴾ [النور: ۳۵، ۳۶]

”اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال (یوں ہے) جیسے ایک طاق ہو، جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشے (کی قندیل) میں ہو، شیشہ جیسے چمکتا ستارہ ہو، وہ (چراغ) ایک مبارک درخت زیتون (کے تیل) سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، یوں لگے جیسے اس کا تیل خود بخود روشن ہو جائے گا، اگرچہ اسے آگ نے نہ چھوا ہو، (وہ) نور علی نور ہے۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے راہنمائی کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ یہ (چراغ اور قندیلیں) ان گھروں میں ہیں (جن کی بابت) اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے (اور) وہ وہاں صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں۔“

سعید اور بد بخت:

نور کیا ہے؟ معلوم ہے کہ کائنات از سر تا پا ساری کی ساری خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ آنکھیں، زبان، عقل؛ سب اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ جسم اور ساری دنیا کا سارا سلسلہ اسی کا بنایا ہوا ہے۔

خدا تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ ان کی اولاد بعد میں مختلف حصوں

میں بٹ گئی: ﴿ فَمِنۡهُمۡ شَقِيٌّ وَّسَعِيۡدٌ ۝ ﴾ [ھود: ۱۰۵] ''ان میں سے کوئی بدبخت اور پاکباز و خوش قسمت بھی ہے، اور نیک اور بد بھی۔'' وجہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جن کو نورِ ایمان اور ہدایت عطا کی، وہ مومن و سعید ہو گئے، دوسرے کافر و مشرک۔ بالکل اسی طرح کہ آنکھوں میں نور ہے تو بینا اور نہ ہونے کی صورت میں اندھا و نابینا، کانوں میں نور ختم ہوا تو بہرا ہوا اور نورِ نطق نصیب نہیں ہوا تو گونگا ہو گیا۔

خدا کی حقیقت:

ذاتِ حق اور اس کی حقیقت آج تک سمجھی نہیں جا سکی، فلاسفہ اور کچھ مسلمان صوفیہ نے کچھ اصطلاحیں، کچھ الفاظ بنائے اور استعمال کیے ہیں، جن سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ بھی گورکھ دھندا ہی ثابت ہوا ہے، کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

خدائی نور کے متعلق ایک مغالطہ:

یہ امر خاص طور پر ملحوظ رہے کہ خدا کے ذاتی نور میں سے کوئی بھی چیز نہیں بنی ہے، ایسا سمجھنے والا ''جاہلِ مطلق'' ہے کہ ''خدا کے ذاتی نور سے فلاں بنا ہے۔'' دوسرے الفاظ میں خدا بٹ گیا، مخلوق بنا اور خالق بھی رہا، یہ دین نہیں، یہ تو محض تُک بندی ہے اور مضحکہ خیز۔ کوئی عالم ایسی بات نہیں کہہ سکتا کہ رسول اللہ ﷺ خدا تعالیٰ کے ذاتی نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ خیال جاہلوں ہی کو جچتا ہے۔

نعرے بازی سے تو مسائل حل نہیں ہوتے۔ دلائل سے یہ امر ثابت کرنا چاہیے۔ خدا بے مثل ہے، ﴿ اَلصَّمَدُ ﴾ ہے۔ ﴿ لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ ﴾ ہے، اس لیے یہ عقیدہ درست نہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بھی نور دیا ہے۔ قوتِ گویائی، سننا، عقل، نظر؛ سب اسی کی عطا ہے۔ اس نے حیوانوں کو بھی نور سے نوازا ہے اور ان کو کچھ شعور عطا کیا ہے۔ شعور کی کیفیت حیوانوں میں بھی ہے۔ ان کا خاص آواز پر آنا اور رکنا، پیار اور غصے کو سمجھنا، خوراک میں مضر اور مفید چیزوں کی پہچان کر لینا؛ یہ اسی شعور کی وجہ سے ہے۔ یہ عقل کا نور ہی ہے، جو ہرن کو شیر کی موجودگی کا احساس کرا کر بھاگنے کی راہ دکھاتا ہے۔ یہ شعورِ فطرت ہے۔ ﴿ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ﴾ اگر معاملہ ''خدا'' کا ہوتا تو مثال کی ضرورت کیا تھی؟

نور سے مراد:

''نور'' سے مراد ''نورِ ہدایت'' اور نورِ ایمان ہے، اس لحاظ سے رسولِ خدا ﷺ نورِ مجسم تھے کہ آپ ﷺ ازسرتاپا ہدایت ہی ہدایت تھے۔

اول تو ﴿ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ کہہ کر نور کی وضاحت کر دی ہے، پھر اگلی آیت میں اس کی مزید وضاحت کی ہے:

﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ [النور: ٣٦]

یہاں ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو اس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے ہیں اور جہاں اس نور کی وجہ سے ذاتِ حق کے تذکرے ہوتے ہیں۔

مساجد کی غرض و غایت:

یہاں ﴿ بُيُوْتٍ ﴾ سے علماء نے عام طور پر ''مساجد'' مراد لی ہیں، لیکن مسجد کی تخصیص نہیں ہے، دوسرے مکان بھی اس میں شامل ہیں۔ اسلام سے قبل بھی ہر قوم نے عبادت و ذکر کے لیے چند مقامات مقرر کر رکھے تھے۔

﴿ تُرْفَعَ ﴾ سے مراد ''تعمیر کرنا'' بھی ہے۔ ﴿ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ﴾ ''اور ذکر کیا جائے ان میں اس کا نام۔'' یہ صرف خدا ہی کے لیے خاص ہے، سورت جن میں فرمایا: ﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ ''اور یہ کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، پس مت پکارو اس کے ساتھ کسی اور کو۔'' مسجد وہ گھر ہے جس میں کسی اور کا نام نہ ہو۔ ذکر صرف خدا کے نام ہی کا جائز ہے، کوئی اور چاہے پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، اس کے نام کا ذکر جائز نہیں ہے۔ افضل الذکر ''لا إلٰه إلا اللّٰه'' ہے، [1] صرف انہی الفاظ کا ذکر کیا جاتا ہے، ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کا ورد نہیں ہوتا۔

مسجدیں صرف اللہ کی یاد کے لیے ہیں، ان میں ذکر و عبادت ہی ہونی چاہیے، انھیں دوسرے مشاغل کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ دنیا کے جھگڑوں اور بازار کے طور پر ان کا استعمال جائز

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٨٣)

نہیں ہے۔ مسجدیں سونے کے لیے نہیں ہیں، اتفاقاً کبھی ایسا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح دنیا کی تمام باتیں کرنا بالکل حرام نہیں ہیں، کبھی ضرورتاً ایسا کرنا جائز ہے، جیسا کہ احادیث میں ذکر آتا ہے کہ حالتِ اعتکاف میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے گفتگو کی تھی۔[1] اسی طرح تجارتی گفتگو کا مقام مسجدیں نہیں ہیں، لیکن کبھی کوئی بات کسی سے دریافت کر لی جائے تو جائز ہے، لیکن اب ایک آدمی مسجد میں خوانچہ لگا کر ہی بیٹھ جائے تو یہ امر درست نہیں ہے۔

مساجد کے آداب:

رسولِ کریم ﷺ اور صحابہ اپنے گھروں ہی میں سوتے تھے، لیکن جن لوگوں کے کوئی گھر نہ تھے، اصحابِ صفہ وغیرہ، وہ مسجد میں بھی سو جاتے تھے۔ ایک دفعہ دو آدمی بلند آواز سے مسجدِ نبوی میں جھگڑ رہے تھے، رسول اللہ ﷺ نے حُجرے سے آ کر دریافت کیا تو پتا چلا کہ پیسوں کے لین دین پر جھگڑا ہے۔ آپ ﷺ نے آدھی رقم پر ان کا تصفیہ کرا دیا۔[2]

مسجدیں ہنگاموں کے لیے نہیں ہیں، یہ تو صرف ذکرِ الٰہی کے لیے ہیں۔ مسجدوں میں غیر اللہ کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ غیر اللہ کا ذکر ویسے بھی غلط ہے، لیکن مسجد میں ایسا کرنا اور بھی بُرا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اب تو خود ساختہ درود اور وظائف مسجدوں میں ہوتے ہیں، جو غلط ہے۔ ذکر صرف خدا کا ہے، باقی تذکرے کے مقام دوسرے ہیں۔

مسجدوں کے آداب سے ناواقف آدمی کبھی مسجد میں آ جائے تو اس سے نرمی سے پیش آنا چاہیے، یہ بیماری عام ہے کہ پرانے نمازی نو واردوں سے سختی سے پیش آتے ہیں اور ان کی غلطیوں پر ان کو دُرشت لہجے سے ٹوکتے ہیں۔ یہ امر سنت کے خلاف ہے۔ سنتِ نبوی ﷺ اس معاملے میں کیا ہے؟ اس کے لیے اس واقعے کو ذہن میں رکھنا چاہیے: ایک اعرابی مسجدِ نبوی میں آیا اور پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو اٹھانا چاہا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کو منع کر دیا۔ جب وہ پیشاب سے فارغ ہو گیا تو اس کو بلا کر فرمایا: مسجدیں اللہ کے ذکر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٣٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤١٨)

کے لیے ہیں، اس گندگی کے لیے نہیں ہیں۔ ①

مسجدیں نماز پڑھنے، قرآن پڑھنے اور اذکارِ مسنونہ کے لیے ہیں، ذاتی جھگڑوں کے لیے نہیں ہیں۔ مسجدوں کو گھر کی طرح استعمال کرنا درست نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ایسا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ ازواجِ مطہرات سے ناراض ہوتے تھے تو بستر مسجد میں لے آتے تھے۔ ② مسجدوں کو راستے کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان کے دروازے کے سوا سب صحابہ کے دروازے مسجدِ نبوی کی طرف سے بند کرا دیے تھے۔ ③

﴿يُسَبِّحُ لَهُۥ فِيهَا بِٱلْغُدُوِّ وَٱلْـَٔاصَالِ ۝٣٦﴾: ''صبح اور شام اس میں تسبیح کرتے ہیں۔'' صبح کے لیے ﴿ٱلْغُدُوِّ﴾ واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے، لیکن شام کے لیے ﴿ٱلْـَٔاصَالِ﴾ جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے، جس سے باقی چار نمازیں مراد ہیں، جو فجر کے علاوہ ہیں۔ ④



① مسند أحمد، رقم الحديث (١٢٩٨٤)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٣١٨)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٥٤)

④ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (11 نومبر 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصولِ نور کے مقامات

﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿36﴾ رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّكٰوةِ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿37﴾ لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿38﴾﴾ [النور: ٣٦۔٣٨]

”یہ (چراغ اور قندیلیں) ان گھروں میں ہیں (جن کی بابت) اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے (اور) وہ وہاں صبح وشام اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید وفروخت، اللہ کے ذکر اور نماز قائم کرنے اور زکات دینے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ پلٹ جائیں گے۔ (وہ یہ کام کرتے ہیں) تاکہ اللہ انھیں ان کے اعمال کی بہترین جزا دے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دے اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔“

ربطِ آیات:

اللہ کا نور، جس سے مراد ہدایت ہے، جو اس نے اپنے انبیاء کی معرفت بھیجا، پچھلے خطبات میں اس امر کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اس ”نور“ کے حصول کے مقامات کون سے ہیں؟ کس جگہ یہ نور زیادہ ہوتا ہے اور کہاں کم۔

﴿بُیُوتٍ﴾ کی تشریح:

ارشاد ہوتا ہے: ﴿فِیْ بُیُوْتٍ﴾ ”گھروں میں“ کون سے گھر؟ ﴿بُیُوْتٍ﴾ کے مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں:

① مساجد، جہاں عام لوگ نماز کے لیے آتے ہیں۔

② اہلِ اسلام کے عام گھر۔

③ بعض مفسرین نے ﴿بُيُوْتٍ﴾ سے مراد چار مساجد لی ہیں:

1 مسجدِ حرام 2 مسجدِ نبوی

3 مسجدِ اقصیٰ - 4 مسجدِ قباء

لیکن یہ مطلب قرینِ قیاس نہیں ہے۔ ہر مسجد نور کا منبع ہے، اس لیے ان مساجد سے اس کو خاص کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مساجد نور کا ظرف ہے اور نور کے حصول کے ذرائع کیا ہیں: نماز، تلاوتِ قرآن، دعوت و ارشاد اور تسبیح وتہلیل وغیرہ۔ یہاں غیر اللہ کے ذکر کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ غیر کے ذکر کے علاوہ مساجد میں تذکرۂ فواحش، بری باتیں اور وہ علوم جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے پڑھنا بھی منع ہیں۔

مساجد کا استعمال:

مساجد کا استعمال علومِ دین کے پڑھنے پڑھانے کے لیے ہونا چاہیے، عشقیہ اشعار اور جنسی ناول بھی مساجد میں نہیں پڑھنے چاہئیں۔ یہ تمام ﴿اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ﴾ کے عین ضد ہیں۔ اس معاملے میں رسول اللہ ﷺ نے اس قدر حفاظت فرمائی ہے کہ مسجد کے باہر گم ہونے والی اشیاء کا اعلان مسجد میں کرنے سے روکا ہے۔[1] صرف مسجد کے اندر گم ہونے والی چیزوں ہی کا اعلان ہونا چاہیے۔

آنحضور ﷺ نے فرمایا:

''مسجدیں جنت کے باغ ہیں، جب ان میں سے گزرو تو کھاؤ پیو۔ کھانا پینا ذکر وصلاۃ ہے۔''[2]

مساجد میں آنے والوں کو چاہیے کہ فضول گوئی سے بچیں اور صرف ضرورت کی گفتگو کریں، یہاں صرف وہ کام کرنے چاہئیں جو ذکر میں معاون ہوں: تلاوت، درود اور اذکارِ مسنونہ وغیرہ۔

مساجد کی صفائی:

مساجد کی عمارت اچھی ہونی چاہیے، اس میں روشنی اور ہوا کا بہتر انتظام ہونا چاہیے، مسجد سے

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٦٨)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٠٩)

بدبو نہیں آنی چاہیے، گندگی نہیں ہونی چاہیے، صفائی کا پورا انتظام ہونا چاہیے، یہ چیزیں ذکر میں معاون ہیں، اسی لیے ان کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں لباس عام طور پر اونٹ کے بالوں کا ہوتا تھا اور مسجد کی چھت بھی زیادہ بلند نہ تھی، اس لیے بدبو آتی تھی۔ آپ ﷺ نے حکم دیا: جمعے کے روز سب غسل کر کے اور صاف کپڑے پہن کر آئیں۔ اگر کپڑے دھلے ہوئے میسر نہ ہوں تو ان کپڑوں کو کم از کم الٹ کر ہی پہنا ہو، اگر کسی کو میسر ہو تو خوشبو بھی لگا لے۔ یہ تمام امور صرف شان وشوکت کے لیے ہی نہیں ہیں، صفائی اور پاکیزگی کے لیے ہیں۔ یہ بھی ﴿ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ ﴾ کے ضمن میں آتا ہے۔

﴿ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ ﴾ کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ مساجد میں جو لوگ نئے آئیں، ان سے دوسرے لوگ نرمی سے پیش آئیں اور ان کو جو کچھ بھی سمجھانا ہو اس میں حکمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ آپ کا کچھ مسائل کو جان لینا غرور وتکبر اور دوسروں کے لیے سختی کا باعث نہیں بن جانا چاہیے۔

تعمیرِ مسجد کی فضیلت:

مسجدِ نبوی ﷺ کی چھت رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کھجور کے تنوں کی تھی اور بالکل نیچی تھی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس میں توسیع کی، لیکن چھت اسی طرح رکھی، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد میں مزید توسیع کی اور چھت کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مسجدِ نبوی کو بالکل شہید کر کے نئے سرے سے تعمیر کروایا، چھت بلند کی اور ساگوان کی لکڑی منگوا کر اس کی چھت ڈلوائی۔ اعتراض کرنے والوں کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میں نے رسول اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ جیسی مسجد کوئی بنائے گا، آخرت میں اس کو اسی طرح کا مکان ملے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ مجھے رہایش کی بہتر جگہ عطا کرے۔“[1]

تطہیرِ مسجد کی اہمیت وفضیلت:

یہاں یہ امر خاص طور پر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ مسجدوں کی صفائی کا کام صرف ملازموں کی ذمے داری ہی نہیں ہے، اس کام کو گھٹیا کام سمجھ کر نظر انداز کرنا درست نہیں ہے۔ مسجدوں کی صفائی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٣)

کرنا بہت نیکی اور درجے کا کام ہے۔ اس معاملے میں غرور اور تکبر کو راہ نہیں دینی چاہیے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو مسجدِ حرام کی صفائی کا حکم دیا۔ سورت بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ ... ﴾ [البقرۃ: ۱۲۵]

سورت حج میں اس طرح فرمایا ہے:

﴿ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ [الحج: ۲۶]

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے باپ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسے بیٹے کو اللہ تعالیٰ نے مسجد کی صفائی پر حکماً لگایا تو دوسرا کون ہے جو اس کام کو کمتر درجہ دے کر اپنے آپ کو اس سے الگ رکھے۔ یہ بات درست ہے کہ ملازم بھی آپ لوگوں نے رکھے ہوئے ہیں اور ان کا معاوضہ بھی آپ لوگ ہی ادا کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود فرصت نکال کر کبھی کبھار یہ کام کرنا چاہیے۔ یہ تمام کام ایسے وسائل ہیں جو ذکر میں معاون ہیں۔ اگر مسجد میں گندگی ہوگی اور بدبو آرہی ہوگی تو ذکر میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

﴿ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ ”تسبیح کرتے ہیں اس میں صبح و شام“ کون تسبیح کرتے ہیں؟ ﴿ رِجَالٌ ﴾ ”آدمی، لوگ“ کون لوگ؟ ﴿ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ ﴾ ”جن کو نہیں غافل کرتی تجارت اور لین دین۔“

تجارت سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ ایک جگہ سے مال خرید کر دوسری جگہ لے جا کر تجارت کرتے ہیں اور بیع سے مراد اسی جگہ کی مقامی خرید و فروخت ہے۔

خدا کے بندے:

یہ لوگ جو صبح و شام تسبیح میں مشغول ہوتے ہیں، یہ بے کار لوگ نہیں ہیں، بلکہ کاروباری لوگ ہیں، تجارت پیشہ اور دکان دار ہیں، مسجدوں کی رونق انہی کے دم قدم سے ہے، یہ ایسے نہیں ہیں کہ ان کی تجارت اور لین دین ان کو نماز، ذکرِ الٰہی اور ادائے زکات سے غافل کر دے یا روک دے۔

کاروبار کی وجہ سے وہ غفلت میں نہیں پڑ گئے اور نہ کاروبار ہی ان پر سوار ہو گیا ہے۔ یہاں یہ امر غور کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کاروبار اور تجارت کی مذمت نہیں کی، بلکہ کہا کہ یہ لوگ (تجار) ہی دراصل مساجد کی رونق ہیں۔ تجارت پیشہ حضرات ذہن نشین کر لیں کہ وقت پر نماز پڑھنا ہی غافل

نہ ہونا ہے۔ نمازوں کو اول وقت ادا کرنا چاہیے۔ آخری وقت میں عادتاً اور جان بوجھ کر نماز پڑھنا درست نہیں ہے۔ دیر سے نماز پڑھنا منافقین کا شیوہ ہے، اس لیے آخری وقت میں پڑھی جانے والی نماز کو "صلاۃ المنافقین" کہا گیا ہے۔[1]

نمازِ عصر کی اہمیت:

کاروباری لوگ عصر کی نماز عام طور پر دیر سے پڑھتے ہیں، حالانکہ اس کے لیے خاص تاکید کی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: "جس کی عصر کی نماز فوت ہوگئی گویا: ((وُتِرَ أَهْلُه وَمَالُه)) "اس کا مال اور اولاد برباد ہوگئی۔" جو لوگ عمداً زیادہ دیر سے نمازیں ادا کرتے ہیں، وہ عملی طور پر نفاق میں مبتلا ہیں۔ جمعے کی نماز کے متعلق حکم دیا: ﴿ اِذَا نُوْدِيَ ﴾ جب جمعے کی اذان ہو جائے تو کام بند کر دو۔ جمعے کی اذان کے بعد جو کاروبار ہو وہ حلال نہیں، بلکہ گناہ ہے۔

روزِ آخرت سے ڈرنے والے:

نور سے فائدہ اٹھانے والے لوگ وہ ہیں جن کو کاروبار نے اس طرح غافل نہیں کر دیا کہ وہ نماز، ذکر، زکات کو فراموش کر چکے ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿37﴾ ﴾

وہ اس دن سے ڈرتے ہیں، جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی، یعنی آخرت کی جواب دہی کا ان کو ہر آن خیال ہے، نماز، ذکر اور ادائے زکات وہ صرف خدا کے ڈر سے کرتے ہیں، دکھانے کے لیے نہیں۔

ایسے اذکار جن میں خشیت پیدا نہیں ہوتی وہ اس ضمن میں نہیں آتے، وہ اذکار جن سے محض نمایش مراد ہو، ﴿ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ ﴾ کی عین ضد ہیں۔

بلند آواز سے گریز:

بلند آواز سے کسی ذکر میں خشیت پیدا نہیں ہوتی، اس لیے ایسے درود جو بلند آواز سے پڑھے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٣)

جائیں وہ بھی اس ضمن میں نہیں آتے، وہ تو محض نمود اور نمائش کے لیے ہوتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بلند آواز میں اذان کے سوا کوئی عبادت نہیں ہے، درود، نماز، تلاوت اور ذکر وغیرہ کی آواز اس قدر ہونی چاہیے کہ وہ مسجد کے اندر ہی رہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کے اظہار کے اور بہت سے طریقے ہیں، مروجہ درود وسلام جو آج کل بلند آواز سے جاری ہیں اس کی عین ضد ہیں۔

﴿يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ﴿37﴾﴾ یہ کام وہ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ انھیں خدا کا ڈر ہے اور قیامت کی جواب دہی کی فکر، وہ قیامت جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جائیں گی۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (25 نومبر 1966ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ [النور: ٥٦]

''اور تم نماز قائم کرو، اور زکات دو، اور رسول کی اطاعت کرو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اس سے قبل آیتِ استخلاف [1] کی وضاحت، تین چار خطبوں میں ہو چکی ہے، جن میں حکومت واقتدار بطورِ نعمت ملنے کا ذکر ہو چکا ہے۔ [2]

مکمل نظام:

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، جس نے غربت اور مسکنت میں بھی اتباع کے لیے احکام دیے ہیں، یعنی جس وقت اسلام برسرِ اقتدار نہ ہو، اس وقت ان احکام کی پیروی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کچھ احکام ایسے ہیں، جو صرف ایک حکومت کے قائم ہونے ہی کی صورت میں جاری ہو سکتے

[1] اس سے مراد یہ آیت ہے: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِي لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ [النور: ٥٥] ''جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی، اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین محکم و پائیدار کر دے گا جو اس نے ان کے لیے چنا، اور یقیناً ان کی حالتِ خوف کو بدل کر وہ ضرور انھیں امن دے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔''

[2] آیتِ استخلاف کی تشریح پر مشتمل یہ خطبات قلم بند نہیں ہو سکے۔ قرآن مجید میں سے ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ...﴾ والی آیت سے پہلی آیت اور اس کا ترجمہ پڑھ لیا جائے، تا کہ دونوں آیات کا ربط، جو مولانا مرحوم نے بیان فرمایا ہے، پوری طرح سمجھ میں آ سکے۔ جب تک دونوں آیات سامنے نہ ہوں، اس ربط کا مکمل لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ (عبدالسلام)

ہیں۔ اسلام کا اپنا پورا اور مکمل پروگرام ہے، جو مسلمان کی زندگی کے ہر شعبے میں اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ بعض احکام کا تعلق صرف حکومت سے ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی سے ان دو حالتوں کے فرق اور اس کے اثرات کا اچھی طرح سے اندازہ ہوتا ہے۔ مکہ کے اندر اسلام با اختیار نہ تھا، دس سال کی تبلیغ سے کل 82 مسلمان ہوئے تھے۔ مدینے میں اللہ تعالیٰ نے حکومت و اقتدار کی نعمت عطا کی تو رسول اللہ ﷺ کی رحلت تک 13 سال میں مسلمانوں کی تعداد سوا لاکھ کے قریب ہو چکی تھی۔

حکومت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ جب حکومت آئے گی تو حاکم دونوں طرح کے ہو سکتے ہیں: اچھے بھی، برے بھی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور حجاج بن یوسف بھی۔ حکومت ملنے کے بعد سرکشی ہو سکتی ہے اور اقتدار ہاتھ میں آنے سے اس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے۔ اوپر کی آیت میں وہ ہدایات دی ہیں جو اس غلط استعمال کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوں گی۔

اچھی حکومت:

جو حاکم اور حکومت ان ہدایات پر عمل کرے گی، سرکشی سے بچی رہے گی۔ ان ہدایات پر عمل کیے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اقتدار و حکومت کا صحیح استعمال ہو، وہ ہدایات حسبِ ذیل ہیں۔ ان کی طرف اشارہ تو پچھلی آیت (استخلاف) ہی میں کر دیا ہے:

﴿يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ [النور: ۵۵]

''وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾:

1. عبادت کرنا اور شرک سے بچنا۔
2. اقامتِ صلاۃ۔
3. ادائے زکات۔
4. اطاعتِ رسول ﷺ۔

① اقتدار وحکومت ملنے پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہیے:

اس کی مخلوق میں سے کسی کو اس کا شریک اور ساتھی نہیں بنانا چاہیے۔قوت آنے پر مخلوق کے دروازے پر گرنا بہت غلط ہے۔ جب قوت اور اقتدار خدا نے دیا ہے تو کسی دوسرے کے سامنے جھکنے کا کیا مطلب؟ حضور ﷺ ہر نماز کے بعد یہ دعا دہرایا کرتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ))[1]

''اے اللہ! جس کو تُو دے، اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جس سے تُو روک لے، اسے کوئی دینے والا نہیں ہے۔''

یہ توحید کی اساس ہے۔

قبولیتِ دعا:

حکمران، علماء، صلحاء، اولیاء اور انبیاء؛ سب کی دعا وہی قبول کرتا ہے، سب کو خیر وہیں سے ملتی ہے اور اگر قبول نہ کرے تو بڑے بڑے پیغمبروں کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ ﴿ وَاغْفِرْ لِأَبِيٓ ... ﴾ [الشعراء: ٢٦] ''اور میرے باپ کو بخش دے۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لیے مغفرت کی دعا کی، لیکن رد کر دی گئی۔ ﴿ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ﴾ [التوبة: ١١٤] ''پھر جب اس کے لیے واضح ہو گیا کہ وہ تو اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام پیچھے ہٹ گئے اور دعا واپس ہو گئی۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''محشر میں لوگ مختلف انبیاء کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔تمام انبیاء کی معذرت کے بعد میرے پاس آئیں گے، میں خدا کے حضور سجدے میں گر جاؤں گا، بارگاہِ الٰہی سے حکم ہو گا: ((اِرْفَعْ رَأْسَكَ)) ''اے محمد! (ﷺ) سجدے سے اپنا سر اٹھائیے!'' اس کے بعد میں لوگوں کے لیے شفاعت کروں گا۔[2]

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٤٤)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٧٦)

غور کا مقام ہے کہ مدینے کی سفارش کا دروازہ بھی اس وقت کھلا، جب آسمان کا دروازہ کھلا۔ معلوم ہوا کہ عبادت کے لائق وہی ذات ہے اور دعا بھی اسی سے مانگنی چاہیے: ﴿ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ﴾ [النور: ٥٥] ''وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔''

''حکومت'' اسباب کا مجموعہ ہے اور جس حاکم کے تصرف میں یہ آ جائے، وہ مخلوق کے دروازے پر گرے۔ یہ تو اور بھی سنگین ہے کہ ایک صاحبِ اختیار حاکم اور رعایا سے سوال! یَا لَلْعَجَب!

② اقامتِ نماز:

حاکم، بادشاہ کسی طرح سے بھی بااختیار ہونے پر نماز صرف پڑھے ہی نہیں، بلکہ قائم کرے۔ اسلام کا تابع بھی ہو اور بے نماز بھی ہو؟ یہ ناممکن ہے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمالِ حکومت کی تقرری اور عام ملازمین کے تقرر کے معاملے میں نماز کا خاص خیال رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: ''جو آدمی خدا کے حق (نماز) کی پروا نہیں کرتا، وہ تمھارے حق کی حفاظت اور پروا کیسے کرے گا۔''[1]

حاکم کے لیے نماز بے حد ضروری ہے، بااختیار ہونے پر خدا کے حضور زیادہ سے زیادہ عجز کا اظہار اشد ضروری ہے۔

نماز کو اطمینان سے ادا کرنا:

ایک شخص آتا ہے، بے ڈھنگا وضو کرتا ہے، جلدی جلدی رکوع و سجود کرتا ہے اور نماز پوری کر کے اپنی راہ لیتا ہے، ایسے نمازی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ((صَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ)) ''نماز ادا کر! تو نے نماز ادا نہیں کی۔'' اس نے تین مرتبہ اسی طرح ادا کی اور ہر دفعہ بارگاہِ رسالت سے یہی سنا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نماز کا طریقہ بتایا کہ وضو کر اور اچھی طرح وضو کر اور اطمینان سے قیام کر۔[2] ایسا قیام جیسا کہ ایک غلام بادشاہ کے سامنے کرتا ہے، یا ایک محکوم حاکم کے سامنے، پھر پورے خشوع اور اطمینان کے ساتھ رکوع و سجود کر۔

پوری شرائط کو پیشِ نظر رکھنا۔ فرائض، سنن، واجبات و مستحبات کا خاص خیال رکھنا، جگہ اور لباس کا

[1] التهجد وقيام الليل لابن أبي الدنيا (ص: ٢٨٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٥١)

پاک ہونا، نماز کے اول وقت سے غافل نہ ہونا، یہ سب باتیں اقامتِ صلاۃ میں داخل ہیں۔

نماز اول وقت پڑھنی چاہیے۔ افضل نماز، اول وقت کی ہے: ((اَلصَّلَاةُ لِأَوَّلِ وَقْتِهَا))[1] ''اول وقت کی نماز (افضل ترین عمل ہے)۔'' جنگ، نیند اور سخت خطرے کے علاوہ کوئی عذر نماز کی تاخیر کی وجہ نہیں بننا چاہیے، اس کے علاوہ کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہے۔ تجارت میں زیادہ گاہکوں کی وجہ، شادی کی گہما گہمی، دوستوں کی آمد کی وجہ سے نمازوں میں تاخیر کرنا بے حد غلط ہے۔

③ زکات ادا کرنا:

یہاں زکات ادا کرنے سے مراد، اس مال کی زکات مراد ہے جو کسی حاکم کا ذاتی مال ہے۔ کوئی حاکم مسلمانوں کے خزانہ (بیت المال) میں ذاتی تصرف کا حق نہیں رکھتا۔ یہاں بیت المال کی زکات مراد نہیں، خود صاحبِ اقتدار کے ذاتی مال کی زکات ادا کرنے کی تلقین کی جارہی ہے، بلکہ حکم ہے۔

④ اطاعتِ رسول ﷺ:

جو مسلمان برسرِ اقتدار آئے، اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت لازمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت وہ صرف اپنی ذاتی زندگی ہی میں بجا نہ لائے، بلکہ حکومت کے تمام شعبوں میں بھی رسول اللہ ﷺ کی ہدایات سامنے رہیں۔

حکمران کی ذمے داریاں:

اقتدار میں آنے پر ذمے داریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ ملک میں قحط ہو اور حاکم غافل ہو، یا ملک میں بدامنی ہو اور حاکم بے فکر رات کو سوتا رہے، ایسا کرنا ایک مومن کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ایسے وقت میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے ہدایات ملتی ہیں، جن پر ان کو عمل کرنا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ نے زندگی میں بیاسی (82) جنگیں لڑی ہیں، جن میں 15، 16 زیادہ اہم ہیں۔ ان میں سے بعض میں حضور ﷺ خود تشریف لے گئے اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کمان میں لڑی گئیں، لیکن سب جنگوں کی آپ ﷺ نے نگرانی فرمائی۔ حاکم و بادشاہ کے ''وقار'' کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کے برعکس ہر وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہو، عوام کو زندگی کی

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٠)

سہولتیں مہیا ہوں۔ خدا پرست حاکموں کو بشارت دی گئی ہے کہ وہ ملائکہ مقربین کے ساتھ ہوں گے۔[1] خدا کے ہاں مطیعِ رسول حاکم کا مرتبہ اس سے ظاہر ہے۔

اسلام پر ہمیشہ عمل کرنا:

اسلام کو صرف بوقتِ ضرورت قبول کرنا بے حد بری بات ہے، اسلام پر ہر حالت میں عمل پیرا ہونا چاہیے۔ سیاسی پارٹیاں جب ضرورت پڑے اسلام کا نام لے لیتی ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اسلام کو استعمال کر لیا جاتا ہے۔ بعض حکومتوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ کبھی کبھی اسلام پر عمل، کچھ سود مند نہیں ہے۔ پورے اخلاص کے ساتھ ہمیشہ اسلام پر عمل کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اختیار کرنے ہی سے تمام مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔

اطاعتِ رسول ﷺ:

یہ اطاعتِ رسول اللہ ﷺ ہی تھی کہ بنو ہاشم، بنو امیہ اور دوسرے قریش نے بنو تمیم کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی، ورنہ ان اہم اور بڑے قبائل کے لیے بنو تمیم جیسے چھوٹے قبیلے کے ایک فرد کی سربراہی قبول کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ نے کہا تھا کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ، بنو تمیم کی سربراہی کیسے قبول کریں گے؟ یہ ناممکن ہے!

اطاعتِ رسول ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ غیر منقسم ہند میں مغل آئے اور اس کے بعد انگریز آئے۔ آخری دور میں اسلام آگے آیا اور اس کی تخصیص سے ایک ملک بن گیا، لیکن بیس سال گزرنے کے باوجود اسلام کے لیے تاحال تشنگی موجود ہے۔ یہاں اطاعتِ رسول اللہ ﷺ کی ضرورت ہے۔

خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی اطاعت اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کی توفیق عطا کرے اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو رحمت اور سکون و اطمینان سے نوازے۔[2]



---

[1] دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۲۷)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (23 جون 1967ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معاشرتی احکام

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِيَسْتَـْٔذِنكُمُ ٱلَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَٰنُكُمْ وَٱلَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا۟ ٱلْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَٰثَ مَرَّٰتٍ ۚ مِّن قَبْلِ صَلَوٰةِ ٱلْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ ٱلظَّهِيرَةِ وَمِنۢ بَعْدِ صَلَوٰةِ ٱلْعِشَآءِ ۚ ثَلَٰثُ عَوْرَٰتٍ لَّكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۚ طَوَّٰفُونَ عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلْءَايَٰتِ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿58﴾﴾ [النور: ۵۸]

''اے ایمان والو! جن (غلاموں اور لونڈیوں) کے تمھارے دائیں ہاتھ مالک بنے ہیں اور (ان لڑکوں اور لڑکیوں کو) جو تم میں سے بلوغت کو نہ پہنچے ہوں، (انھیں) چاہیے کہ تم سے تین بار اجازت مانگیں (پھر گھر میں داخل ہوں)، نمازِ فجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو کپڑے اتارتے ہو اور نمازِ عشاء کے بعد، یہ تین وقت تمھارے لیے پردے (کے) ہیں، ان (اوقات) کے بعد (بلا اجازت آنے سے) نہ تم پر اور نہ ان پر کوئی گناہ ہے، تم ایک دوسرے کے پاس بکثرت آیا جایا ہی کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اسی طرح تمھارے لیے (اپنی) آیات بیان کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''

برائی کا سدِ باب:

سورت نور کے شروع میں زنا اور بدکاری کی مذمت، اس کی سزا، بہتان تراشی کی مذمت اور اس کی سزا کا ذکر ہوا تھا۔ معاشرے کو پاک رکھنے کے لیے پردے کے احکام دیے ہیں اور عام معاشرت کے لیے اصول بتائے ہیں۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ سمجھائے ہیں، جن سے برائیوں کو روکا جا سکتا ہے۔

اول ایسے احکام دیے ہیں کہ برائیاں پیدا ہی نہ ہوں اور اگر ایسا ہو جائے تو ان کا علاج تجویز

کر دیا ہے۔ ان احکام کے دوران میں بھی خدا کی وحدانیت کا ذکر کیا ہے: ﴿ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ﴾ [النور: ۵۵] درحقیقت معاشرے کی درستی، اخلاق کی پاکیزگی، احکام پر عمل اور مختلف سزاؤں کا اِجرا، سب کا مدار ذاتِ حق کی توحید پر ہے، اس میں شرک کی آمیزش ہر چیز میں بگاڑ پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے، جو عبادات، اخلاق اور عمل کو برباد کر دیتی ہے۔ اس لیے ان احکام کے ضمن میں توحید کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔

یہاں آخرت میں اجر وثواب کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی تمکن وخلافت کی بشارت دی ہے۔ بعض حالات میں مجبوریاں ہوتی ہیں اور علاج ہمارے بس میں نہیں ہوتا، ایسے حالات میں مجبوریِ امر کے طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے اور امید ہے کہ خدا تعالیٰ بھی معاف کرے گا۔ بعض دفعہ غربت کی وجہ سے شریعت کے بعض احکام پر عمل نہیں ہوسکتا یا بعض حدود پوری نہیں ہوتیں، یہ قابلِ معافی ہے۔

تین ادوار:

1. رسول کریم ﷺ سے قبل ایک معاشرہ تھا، جس کو ہم جاہلی دور کہتے ہیں۔
2. اس کے بعد حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد کا دور ہے۔
3. اور ایک دور یہ ہمارا ہے، اس طرح ہم ان کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(1) پہلا دور: جاہلیت کے دور میں عریانی، فحاشی، ننگا پن، بے حجاب پھرنا اور اختلاطِ مرد وزن عام تھا اور اس کو ناپسند نہیں کیا جاتا تھا۔ آزاد عورتیں تک عام باہر پھرتی تھیں اور ﴿ تَبَرُّجَ الْجٰهِلِيَّةِ ﴾ عام تھا، زنا اور بے حیائی عام تھی۔ اخلاقی قدریں بھی مختلف تھیں۔

(2) جب سورت نور، سورت احزاب اور سورت نساء کی آیتیں نازل ہوئیں اور رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کی تو حالات بدل گئے، طریقۂ زندگی بالکل بدل گیا، زندگی کی ضرورتوں کا ذمے دار اور کفیل مرد کو بنایا۔ گھر کی چار دیواری کے اندر عورت کو ذمے دار قرار دیا گیا۔ گھر کی درستی، بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت اور کھانا پکانا؛ سب معاملوں میں عورت کو بالا دستی عطا کی۔ عورتوں کو پابند کیا کہ واجبی ضرورت کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلیں۔ برادری کے عام گھروں میں بھی بے حجاب پھرنا بند کرایا اور صرف محرم رشتے داروں کے سامنے حجاب کے بغیر جانے کی اجازت

دی ہے۔ اجنبی لوگوں اور دور کے رشتے داروں سے پورا پردہ کرنے کی ہدایت کی اور صرف خاص ضرورت کی گفتگو کی اجازت دی اور اس کا بھی ایک انداز مقرر کیا۔

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس لوگ آتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پردے کے پیچھے سے جواب دیا کرتی تھیں، جو سیدھا اور مختصر ہوتا تھا۔ غیر مردوں سے بے تکلفی کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ اسلام نے طے کیا کہ زندگی کی ضروریات کے لیے عورت مرد پر انحصار کرے اور عورت کا نان ونفقہ مرد کے ذمے قرار دیا۔ عورت پردے کی حدود کے اندر رہ کر کام کر سکتی ہے، لیکن اصل ذمے داری مرد پر ہے۔ یہ نظام صدیوں تک چلتا رہا، اس کی برکات ظہور میں آتی رہیں، مرد اور عورت، دونوں کو اس کی وجہ سے عزت حاصل ہوئی۔

3 ایک اور انگریزی دور آیا، جس نے ہماری یہ اخلاقی قدریں بدل کر رکھ دیں۔ ہمارے عائلی اور اخلاقی نظام کی جڑوں کو ہلا کر کھوکھلا کر دیا۔ بے حجابی کا شوق عورتوں میں بری طرح اُبھر آیا اور مردوں نے بھی اس معاملے میں ان کی پوری طرح ہمت افزائی کی۔ ''تبرجِ جاہلیت'' پھر سے شروع ہو گیا۔

عورتوں کا ایک طبقہ زینت کو بازار میں لٹانے پر تُل گیا ہے۔ عزت اور عصمت کے معیار ختم ہو رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کے اثرات اس قدر وسیع ہو چکے ہیں کہ پردہ دار گھرانوں میں بھی صورتِ حال وہ نہیں رہی ہے۔ پورے حدود پر عمل جاری نہیں رہا۔ بعض دفعہ تو مجبوری ہوتی ہے، لیکن عام طور پر آوارگی ہے۔

عورتوں کا ایک طبقہ دین سے برگشتہ ہو چکا ہے اور روز بروز یہ طبقہ بڑھ رہا ہے۔ عورت نے زندگی کی ضرورتوں کی کفالت اپنے ذمے لینی شروع کر دی ہے۔ اگرچہ یہ محدود پیمانے پر ہے، لیکن روز بروز اس صورت کی توسیع ہو رہی ہے۔ یہ کفالت ان کے لیے مزید بوجھ ثابت ہو رہی ہے۔ پرانا جاہلی نظام اگرچہ ختم ہو چکا ہے، لیکن یہ ہمارا آج کا نظام بھی جاہلیت ہی کا نظام ہے۔

حدودِ کار:

اسلام نے عورتوں کو پردے کی حدود کے اندر رہ کر کام کرنے کی اجازت دی ہے۔ بعض

ازواجِ مطہرات تو امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں، مثلاً: حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما، ان کی ضروریات ان کے والدین پوری کرتے تھے اور بعض خود کام کرتی تھیں: حضرت زینب رضی اللہ عنہا چمڑا رنگتی تھیں اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سلائی کا کام کرتی تھیں۔ کام کرنا جرم نہیں ہے، لیکن دفتروں میں بے حجابانہ کام، کلبوں میں داخلہ، عام مردوں سے بے تکلفی اور اختلاطِ مرد و زن غلط ہے اور اس کے نتائج بے حد تلخ ثابت ہو رہے ہیں۔

بالائی طبقے زندگی کے تقاضوں کے نام پر ان برائیوں کو لا رہے ہیں، یہ اور بھی برا ہے۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ ہمارے یہ مہربان اسلام سے انکار کر دیتے اور کھلی طرح جس دین کو درست خیال کرتے، اس پر عمل پیرا ہو جاتے، لیکن خود بدلنے کے بجائے ہر لباس کو کھینچ تان کر اسلام پر فِٹ کیا جا رہا ہے۔ اسلام میں پردے کی کس قدر تاکید ہے، اس کا اندازہ اوپر کی آیات سے کیجیے۔ کہاں ہمارے حالات اور کہاں یہ اسلامی تعلیمات؟!

پردے کے تین اوقات:

﴿ لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِينَ ﴾ جن لوگوں سے پردے کا حکم ہے، اس کا ذکر اسی سورت نور میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ جن سے پردہ نہیں ہے، وہ بھی تین اوقات میں بغیر اجازت تمھارے پاس نہ آئیں۔ ان کے ساتھ ہی بچوں کو منع کیا ہے کہ وہ بھی ان اوقات میں بلا اجازت داخل نہ ہوں۔

﴿ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ﴾ یہ تین اوقات حسبِ ذیل ہیں:

1. ﴿ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ ﴾: صبح سویرے انسان نیند کی وجہ سے غفلت میں ہوتا ہے، ننگا بھی ہو سکتا ہے۔
2. ﴿ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ ﴾: دوپہر کے وقت (قیلولہ کے وقت) گرمی کے دنوں میں عام طور پر کپڑوں کی احتیاط اس وقت میں نہیں ہوتی، اس لیے نابالغ بچے بھی اجازت سے آئیں۔
3. ﴿ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ﴾: عشاء کے بعد بھی اجازت سے داخل ہونا چاہیے۔

ان تین اوقات میں غلام، خادم اور بچوں پر "استیذان" (اجازت) کی پابندی عائد کر دی ہے، جیسے دوسرے عام لوگوں کے لیے گھروں میں داخل ہونے سے قبل اجازت کی پابندی ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ برائی کا راستہ بند ہو جائے۔ برائی اس کے بعد بھی آ سکتی ہے، پردہ دار عورتیں بھی بدکار ہو سکتی ہیں، لیکن یہ تمام پابندیاں ان امکانات کو کم سے کم کرنے کے لیے ہیں۔

ہماری حالت:

اب غور کیجیے! کجا یہ کہ غلام اور بچوں کو اجازت سے داخل ہونے کا حکم ہے اور کجا یہ کہ ہمارے معاشرے میں عورتیں گھروں میں بے روک ٹوک پھرتی ہیں اور بے حجابانہ بازاروں میں مٹرگشت کرتی ہیں۔

بعض علماء نے یہاں ﴿ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ میں مرد غلام کی تخصیص کی ہے، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان اوقات میں بغیر اجازت داخل نہ ہوں، جو خرابی مرد کے داخلے میں ہے، وہی عورت کے بلا اجازت داخلے میں بھی ہے۔

سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔[1] یہ وجہ بیان کی ہے کہ پہلے مکانوں میں دروازے نہیں تھے اور نہ چار دیواریاں تھیں، ٹاٹ وغیرہ سے پردے بنائے جاتے تھے، لیکن جب مکان بن گئے اور دروازے لگ گئے تو آیت منسوخ ہے، لہٰذا اب ضروری نہیں کہ اجازت طلب کی جائے۔ لیکن یہ نسخ کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ تمام علماء کا اب بھی یہ خیال ہے کہ اجازت ضروری ہے۔

نوکر اور بچے اجازت لے کر ان اوقات میں اندر آئیں۔ باقی اوقات میں اجازت کے بغیر آ سکتے ہیں اور باقی اوقات میں اہلِ خانہ کو ایسی قابلِ اعتراض حالت میں نہیں ہونا چاہیے کہ ایسے وقت میں وہ آئیں تو آپ کا ڈانٹنا درست نہیں، بلکہ ایسی حالت میں ہونا ہی حماقت ہے!

ان ہدایات کے مقابلے میں آج کل کے بے حجابانہ تبرج، کلبوں کے نظام اور آزادانہ پھرنے پر غور کیجیے کہ ہم کس قسم کے اسلام پر عمل پیرا ہیں؟ ہم کدھر جا رہے ہیں اور خود شارع علیہ السلام نے ہمارے لیے کیا راہ مقرر کی ہے؟[2]



---

[1] تفسیر القرطبي (۳۰۲/۱۲) سورة النور.

[2] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (30 جون 1967ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام کا نظامِ عفت وعصمت

﴿وَاِذَا بَلَغَ الۡاَطۡفٰلُ مِنۡكُمُ الۡحُلُمَ فَلۡيَسۡتَاۡذِنُوۡا كَمَا اسۡتَاۡذَنَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمۡ اٰيٰتِهٖ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝59 وَالۡقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِىۡ لَا يَرۡجُوۡنَ نِكَاحًا فَلَيۡسَ عَلَيۡهِنَّ جُنَاحٌ اَنۡ يَّضَعۡنَ ثِيَابَهُنَّ غَيۡرَ مُتَبَـرِّجٰتٍۢ بِزِيۡنَةٍ‌ؕ وَاَنۡ يَّسۡتَعۡفِفۡنَ خَيۡرٌ لَّهُنَّ‌ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۝60﴾ [النور: ۵۹، ۶۰]

”اور جب تم میں سے لڑکے (اور لڑکیاں) بلوغت کی حد کو پہنچ جائیں تو انھیں چاہیے کہ وہ بھی اسی طرح اجازت مانگیں جس طرح ان سے پہلے (ان کے بڑے) اجازت مانگتے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑا جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔ اور (گھروں میں) بیٹھ رہنے والی (عمر رسیدہ) عورتیں جو نکاح کی امید نہیں رکھتیں، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (پردہ داری کے) کپڑے اتار دیں، جبکہ وہ (اپنی) زیب و زینت ظاہر کرنے والی نہ ہوں اور ان کا اس سے بھی بچنا ان کے لیے بہت بہتر ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑا سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔“

ربطِ آیات:

سورت نور میں ضمنی طور پر بے شمار مسائل کا ذکر ہے، لیکن سورت کے اول، آخر اور درمیان میں خاص طور پر ان مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک صالح معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص پیرائے میں اسلامی نظامِ زندگی کے مکمل ڈھانچے کا ذکر فرمایا ہے۔

ایک فرد کا دوسرے سے تعلق و معاملہ، ایک کنبے و قبیلے کا دوسرے کنبے و قبیلے سے اختلاط اور میل ملاپ اور مختلف قوموں کا آپس میں کس طرح تعلق ہونا چاہیے؟ ان تینوں صورتوں کے متعلق واضح طور پر راہنمائی کی ہے۔ غلام، خادم، بچے، جوان، بوڑھے، مرد اور عورت؛ سب معاشرے کے جزو

ہیں، ان کے آپس میں تعلقات کی کیا نوعیت ہو؟ اس کا ذکر بھی تفصیل سے اس سورت میں کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے افراد سے کنبے اور کنبے سے اقوام تک کے تعلقات کے بارے میں تمام ہدایات دی ہیں اور دس سال کی قلیل مدت میں ایک مکمل اسلامی معاشرہ انہی خطوط پر تشکیل دے کر دنیا پر اس کی حقانیت کو پوری طرح واضح کر دیا۔

تربیتِ اطفال:

﴿وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَلُ ...﴾ یہ آیت سورت نور کے آخری حصے کی آیت ہے۔ اس سے قبل جو آیت ہے، اس میں بچوں اور غلاموں کے لیے تین اوقات میں گھروں میں اجازت سے داخل ہونے کا ذکر ہے۔ اس آیت میں یہ ذکر کیا ہے کہ جب یہ بچے، جن کو ان تین اوقات کے علاوہ دوسرے اوقات میں گھروں میں آنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، جوان ہو جائیں تو یہ اجازت کے بغیر کسی وقت بھی گھروں میں داخل نہ ہوں۔ بلوغت سے قبل بچہ بے ضرر ہوتا ہے، جنسی تعلقات سے بے خبر ہوتا ہے، اس لیے بچوں کو گھروں میں بے روک ٹوک آنے کی اجازت ہے۔

بچوں کی تربیت اچھے طریقے سے کرنا چاہیے، نہ تو ہر وقت مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ ہی مناسب ہے اور نہ بالکل کھلا ہی چھوڑ دینا چاہیے۔

اسوۂ حسنہ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ دس سال کی عمر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور وفات تک، جب کہ ان کی عمر بیس سال ہو چکی تھی، رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرتے رہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس دس سال کی مدت میں: "مَا ضَرَبَنِيْ وَلَا كَهَرَنِيْ" "رسول اللہ ﷺ نے نہ تو کبھی مجھے مارا، نہ جھڑکا ہی۔"[1] اوسط طریقے کی تربیت فرماتے تھے۔ بہر حال یہ تو ایک ضمنی سی بات تھی، بچوں کے گھروں میں آنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

غلام اور خادم کا فرق:

غلاموں پر کھلی چھٹی ہے۔ واضح رہے کہ غلام اور خادم کا ایک حکم نہیں ہے۔ غلام یا تو خریدا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٣٨)

جاتا ہے، یا جنگ میں حصے کے طور پر آتا ہے، اس لیے جب تک اس کو فروخت نہ کیا جائے یا آزاد نہ کر دیا جائے، اس کا مالک سے خدمت کا تعلق ختم نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں ایک خادم کے ساتھ وقتی معاہدہ ہوتا ہے، معاہدہ ختم ہوا تو خدمت کا تعلق بھی ختم۔ اس لیے خادم کا حکم بھی دوسرے عام لوگوں جیسا ہے۔

بچوں اور غلاموں کے لیے پابندی کے تین اوقات:

صرف بچوں اور غلاموں ہی کو بلا روک ٹوک گھروں میں آنے جانے کی اجازت دی ہے۔ ان پر بھی نمازِ فجر سے قبل، ظہر کے وقت اور عشاء کے بعد گھروں میں داخلے کے لیے اجازت طلب کرنے کی پابندی عائد کی ہے۔ یہ پابندی اور عام لوگوں کے لیے استیذان کی پابندی، ایک صالح اور محمود معاشرے کے لیے انتہائی اہم اور ضروری امر ہے۔

پھر جب یہ بچے بالغ ہو جائیں، یعنی جنسی تعلقات کا شعور ہو جائے، شادی اور اس کے متعلقات کو سمجھ جائیں تو ان کا حکم بھی دوسرے بالغوں کی طرح ہو گا، یعنی ان کا بغیر اجازت کے داخلہ بند ہو جائے گا۔ اب ان کے لیے بھی ضروری ہے کہ گھروں میں آنے کے لیے اجازت طلب کیا کریں۔

کسی گھر میں تاک جھانک بھی ممنوع ہے:

﴿ كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِيْنَ ... ﴾ ''جیسا کہ تم سے پہلے دوسرے بالغ افراد اجازت لیا کرتے تھے۔'' بعض ائمہ نے اس آیت پر نسخ کا حکم لگایا ہے، لیکن جیسا کہ اس سے قبل وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ درست نہیں۔

بغیر اجازت کسی بالغ کو بھی رہایشی مکان میں داخل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ دروازوں کے سوراخوں سے تاکنا جھانکنا بھی سخت ممنوع ہے۔ خود نبی کریم ﷺ کا واقعہ ہے کہ آپ ﷺ نے دو شاخہ لکڑی، جس سے آپ ﷺ بدن کو کھجا رہے تھے، اس طرح جھانکنے والے کو ماری تھی اور فرمایا تھا کہ اس طرح اس آدمی کا اگر کوئی نقصان ہو جاتا تو کوئی قصاص نہ دیا جاتا۔[1]

عمر رسیدہ عورتیں:

﴿ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ ... ﴾: جو عورتیں گھریلو زندگی سے دست بردار ہو چکی ہیں۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٤١)

﴿ وَالْقَوٰعِدُ ﴾ اس کو کہتے ہیں جو کاروبار سے رہ جائے اور بیٹھ جائے۔ وہ عورتیں کہ ان کی خواہشاتِ نفسانی مر چکی ہوں، مردوں کے لیے ان کو کوئی جاذبیت نہ رہی ہو، اولاد پیدا کرنے کی عمر ختم ہو چکی ہو، ایامِ حیض ختم ہو گئے ہوں، یہ عورتیں اگر گھروں میں اپنی اوپر کی چادریں اور نقاب اتار کر رکھ دیں تو ان پر گناہ نہیں ہے۔

انسانی زندگی کے تین ادوار:

انسان کی زندگی کے تین مراحل ہوتے ہیں: بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ ہر ایک بچہ اپنے اندر ایک خاص جاذبیت رکھتا ہے، جس کا محرک کوئی جنسی جذبہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک جذبۂ رحم ہوتا ہے۔ بچہ کسی رنگ اور شکل وصورت کا ہو، ہر آدمی کا اس سے تعلقِ خاطر ہوتا ہے اور بچے کے معاملے میں سختی سے عام طور پر ہر آدمی پرہیز کرتا ہے۔ دراصل بچپن خود دعوتِ رحم ہے اور ہر آدمی کا رویہ نرم ہی ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری تقاضا ہے، اسلام نے بھی اس کی پوری حوصلہ افزائی کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو بچوں سے بڑا پیار تھا، جب بھی نیا پھل آتا، رسول اللہ ﷺ خود چکھنے سے قبل بچوں کو دے دیتے تھے۔[1] آپ ﷺ بچوں کو مارنا جھڑکنا پسند نہیں کرتے تھے۔

جوانی کا دور:

عمر کا دوسرا حصہ جوانی ہے۔ جوانی کے اندر بھی جاذبیت ہے، لیکن یہ بچپن سے مختلف ہے۔ خون کا جوش اور گرمی، جاذبیت کے لیے ایک دعوت ہوتی ہے۔ رنگ اور شکل و وضع چاہے معیاری نہ ہو، پھر بھی چال ڈھال میں جاذبیت ہوتی ہے۔ اس عمر میں جنسی تعلق کے لیے خاص جاذبیت ہوتی ہے، اسی لیے جوانی کی عمر کو ''نکاح کی عمر'' کہا جاتا ہے۔

﴿ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ﴾ یعنی اُس عمر میں نکاح کیا جائے کہ دونوں فریق نکاح کی غرض و غایت کو سمجھتے ہوں۔ واضح رہے کہ بچپن کا نکاح اسلام نے حرام نہیں قرار دیا۔ بعض ضرورتوں کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے، لیکن پسندیدہ نہیں ہے۔ نکاح کا اصل وقت جوانی ہے۔ ﴿ لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ... ﴾ [الأعراف: ١٨٩] ''تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔'' بچپن سے اس کیفیتِ تسکین کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا تعلق تو جوانی ہی سے ہے۔

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٧٣)

صرف خوش رنگ وخوش شکل نسلوں اور قوموں ہی میں جاذبیت نہیں ہوتی ہے، بلکہ افریقہ کے سیاہ فام جوان جوڑوں کے درمیان بھی ﴿ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ﴾ [الروم: ٢١] ''اس نے تمھارے درمیان محبت اور ہمدردی رکھ دی۔'' ہوتی ہے۔

جوانی کی عمر ہی پر زیادہ جنسی پابندیاں لگائی گئی ہیں، کیوں کہ برائیاں زیادہ اسی حصے کی عمر میں ہوتی ہیں۔ بچپن اس سے خالی اور بڑھاپا از کارِ رفتہ ہوتا ہے۔ تمام جنسی جرائم اسی عمر میں سرزد ہوتے ہیں، اس لیے جنسی، اخلاقی اور عائلی پابندیاں بھی تمام کی تمام اسی عمر پر ہیں۔ 16,15 سال کی عمر سے 50,45 سال کی عمر کا حصہ ایک ہنگامہ خیز دور ہوتا ہے۔ جوانی کی جاذبیت سیاہ رنگت سے کم نہیں ہو جاتی، اس لیے ساری دنیا کے لیے یہ پابندیاں یکساں ہیں، حبشہ تک کے لیے بھی یہی پابندیاں ہیں۔ ان کا بھی اپنا معیارِ خوب صورتی ہے، جو خود ان کے لیے حشر بداماں ہی ہوتا ہے۔

بلوغت:

﴿ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفٰلُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ ﴾: عورت فطرتاً نیک ہوتی ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت میں بدی کا جذبہ کم ہوتا ہے، اس لیے یہاں اطفال ''(مذکر) بچوں کا ذکر کیا۔ اِس زمانے میں بھی نظر کا پھیلاؤ اور ذہنی پراگندگی مردوں میں زیادہ ہے۔ عورت اب بھی از سرتاپا حیا ہے۔ یہ عورت کی فطرت ہے اور یہ تمام پابندیاں اسی فطرت کو کامل کرنے کے لیے ہیں۔

عمر رسیدہ بدکار:

بعض عمر رسیدہ بھی بدکار ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں، لیکن ان کا تناسب بہت کم ہوتا ہے، کیوں کہ زیادہ عمر کے آدمی میں شہوانی جذبات کم ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بدکاری سب کے لیے جرم ہے، جوان اور بوڑھے دونوں کے لیے۔'' آپ ﷺ نے مزید فرمایا: ''قیامت کے دن جن لوگوں کو سایۂ رحمت نصیب نہیں ہوگا، ان میں ''بوڑھا زانی'' بھی شامل ہے۔[1] گویا بوڑھا زانی، جوان سے زیادہ مجرم ہے کہ اس عمر میں زنا کے محرکات کم ہوتے ہیں۔

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٦)

بوڑھی عورتوں کا پردہ:

اسی طرح بوڑھی عورتوں کا معاملہ ہے ان پر پردے کی وہ پابندیاں نہیں ہیں، جو جوان مستورات کے لیے ہیں۔ اس امر کو یہاں واضح کیا ہے: ﴿ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا ... ﴾ یعنی وہ عورتیں جو بوڑھی ہو چکی ہیں، حیض بند ہو چکا ہے، چہرے کی جاذبیت ختم ہو گئی، گھر کا انتظام اگرچہ انہی کے ہاتھ میں ہے، لیکن اس کے پیچھے کوئی جنسی جذبہ نہیں ہے، بچوں کی پیدائش ختم ہو چکی ہے۔ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکی ہیں، جس کا ذکر حضرت زکریا علیہ السلام نے ان الفاظ میں کیا تھا:

﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَکُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا ④ ﴾ [مریم: ٤]

''اس (زکریا) نے کہا: اے میرے رب! بے شک میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں، اور میرا سر بڑھاپے (کی سفیدی) سے بھڑک اٹھا، اور اے میرے رب! میں تجھ سے دعا کر کے کبھی محروم نہیں رہا۔''

یعنی میری خواہشات تو ختم ہو چکی ہیں، اب اولاد صرف تیرے کرم ہی سے ملے گی۔

عورت کی عفت:

﴿ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا ﴾ یعنی جب عمر کے اس حصے میں پہنچ جائیں تو اس وقت ان پر گھر میں پردے کی وہ پابندیاں نہیں ہیں جو جوانی کے عالم میں تھیں۔

﴿ فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ ﴾: یہ عورتیں اگر چادریں (نقاب) نہ لیں تو کوئی حرج نہیں ہے، یعنی یہ عورتیں ﴿ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ﴾ [الأحزاب: ٥٩] وہ اپنی چادروں کا کچھ حصہ اپنے آپ پر لٹکا لیا کریں۔'' سے مستثنیٰ ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک شرط عائد کر دی: ﴿ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ﴾ ''وہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔'' اس حصے میں بھی اگر وہ بناؤ سنگار کرتی ہیں تو ضروری ہے کہ وہ چادر نہ اتاریں، اس زینت کو نمایاں اور ظاہر نہ کریں۔

﴿ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ﴾ ''اور اگر وہ (چادر اتارنے سے) بچیں تو ان کے لیے بہتر

ہے۔'' یعنی اگر عمر رسیدہ ہونے کے باوجود پورا پردہ کرتی رہیں اور چادر تک نہ اتاریں، جس کے متعلق اوپر اجازت کا ذکر گزر چکا ہے تو یہ اور بھی بہتر ہے۔ یہ دراصل عزیمت کی راہ ہے، کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ایسا کریں تو بہتر ہے، یہ اخلاقی پابندی ہے۔

عورت کی ذمے داری:

ایسا کیوں ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ ''گھر'' ہر بچے کے لیے پہلا مدرسہ ہے اور ماں پہلا استاد۔ بچہ وہی کچھ کرے گا اور سیکھے گا جو اس کے گھر میں ہوگا اور اس کی ماں کرے گی۔ بچوں پر ماں کی تربیت اور اس کے اخلاق کے اثرات زیادہ ہوتے ہیں۔

ہر گھر کے اندر ہی ایک کچہری ہے، جیل ہے، مقدمات پیش ہوتے ہیں اور سزائیں نافذ ہوتی ہیں اور ہر ماں اس کی ذمے دار افسر ہے۔ جب بچے اپنی ماں کو ہر طرح حیادار پائیں گے تو وہ بھی یقیناً ایسے ہی بن جائیں گے، لیکن جب وہ دیکھیں گے کہ بڑی بوڑھی ہی سر کھولے بیٹھی ہے تو اس کا اثر ان پر بھی ایسا ہی ہوگا اور پردے کی اہمیت ان کے ذہن سے ختم ہو جائے گی۔ جب ایک بیٹی دیکھے گی کہ اماں جی سر کھولے دروازے میں براجمان ہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ پردے کی حدود کا ہر طرح خیال رکھے، اس لیے بہتر ہے کہ زیادہ عمر کی عورتیں گھروں کے اندر بھی جوانی کے جیسا پردے کا اہتمام رکھیں۔

شرعی پابندیوں کی حکمت:

ان پابندیوں کے باوجود برائی ہوسکتی ہے، اس کے امکان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اب کوئی یہ کہے کہ پھر ان پابندیوں کا فائدہ؟ دراصل برائی اور نیکی کا معاملہ ہر آدمی کے ضمیر سے تعلق رکھتا ہے۔ مکانوں اور دکانوں کو تالے لگائے جاتے ہیں، اس کے باوجود چوریاں ہو جاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تالے لگانے چھوڑ دیے جائیں، یا ایک آدمی تالا لگاتا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ اپنے پڑوسیوں پر بدگمانی کر رہا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ اسلام کو عورتوں پر اعتبار نہیں ہے کہ اس نے ایسی پابندیاں عائد کی ہیں، بالکل ایسا ہی ہے کہ اپنی دکان کو تالا لگانے پر کوئی پڑوسی چیخ اٹھے کہ تم میرے متعلق سوئے ظن کا اظہار کر رہے ہو اور یہ تالا اس کا مظہر ہے۔

پردہ عورتوں پر بدگمانی کا مظہر نہیں ہے، بلکہ یہ بعینہٖ تالے کی طرح ہے، جو چوروں سے حفاظت کے لیے لگایا جاتا ہے۔ تالے اور پہرے دار کے باوجود چوریاں ہوتی ہیں اور ہوں گی، اسی طرح ان تمام پابندیوں کے باوجود بدکاری ہوسکتی ہے، یہ سب حفظِ ماتقدم اور بچاؤ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں رجم اور زنا کے واقعات ملتے ہیں۔

بادشاہوں اور ان کی اولاد کو تربیت اور اخلاقی حفاظت کے بہتر مواقع ملتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بادشاہوں میں زانی بھی ہوئے، قمار باز بھی ہوئے۔ اس صورتِ حال کے متعلق فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

یعنی دروازوں پر پردے لگانے کے باوجود اندر برائی ہے تو اس کو اس کا علم ہے۔ نمازیں پڑھنے کے باوجود تم گناہ سے آلودہ ہو تو یہ اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ وہ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔ چھپی ہوئی برائی اس کے لیے بالکل ظاہر ہے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (25 اگست 1967ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھانے کے آداب

﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ۚ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿61﴾﴾ [النور:٦١]

''اندھے پر کوئی حرج نہیں اور نہ لنگڑے ہی پر حرج ہے اور نہ مریض پر ہی کوئی حرج ہے اور نہ خود تمھی پر (کوئی حرج ہے) کہ تم اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں یا اپنی ماؤں کے گھروں یا اپنے بھائیوں کے گھروں یا اپنی بہنوں کے گھروں یا اپنے چچاؤں کے گھروں یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں یا اپنے ماموؤں کے گھروں یا اپنی خالاؤں کے گھروں یا (ان گھروں سے) جن کی چابیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں (کے گھروں) سے، (اس میں بھی) تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم مل کر کھاؤ یا الگ الگ، پھر جب تم گھروں میں داخل ہوتو اپنے لوگوں پر سلام کہو، (یہ) اللہ کی طرف سے بابرکت (اور) پاکیزہ تحفہ ہے، اسی طرح اللہ تمھارے لیے آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھو۔''

اس سے قبل، اس پورے رکوع میں رہنے سہنے کے آداب، گھروں میں آمد ورفت کے آداب اور پردے کے احکام کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس آیت میں جس مسئلے کا ذکر کیا ہے، یہ بھی ان ہی احکام سے تعلق رکھتا ہے۔

معذور اور بیمار افراد کے لیے استثنائی حالتیں:

اندھا، لنگڑا اور مریض، ان پر کوئی پابندی نہیں، یہ جس گھر میں بھی جائیں، کھانا کھا سکتے ہیں۔ یہ ایک عام اخلاقی چیز ہے، اس کی اس طرح تلقین کی کیا ضرورت تھی؟ اس آیت کو پڑھتے ہی یہ الجھن ذہن میں آتی ہے۔

دراصل معاملہ یہ تھا کہ پردے کے احکام نازل ہونے کے بعد مسلمان ان پر سختی سے عمل پیرا ہوئے۔ ضرورت تھی کہ معذور افراد کے متعلق وضاحت ہو، ان آیات میں ان لوگوں کا ایک طرح سے حق مانا گیا ہے کہ وہ ہر گھر سے کھانا کھا سکتے ہیں۔

مدینے کی آبادی مختصر تھی، ہزار یا بارہ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ مسلمانوں پر مدینے کی حفاظت کا بوجھ تھا، اگرچہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ شہر کی حفاظت کے معاہدات موجود تھے، لیکن آپ ﷺ نے ان پر کبھی بوجھ نہیں ڈالا، بلکہ اس بوجھ کو خود ہی اٹھایا، نہ اعتماد ہی کیا کہ وہ اس قابل نہ تھے۔ جنگ کے دوران میں، جب کہ تمام مرد جنگ کے لیے چلے جاتے تھے، بعد میں گھروں کے انتظام کے لیے ضروری تھا کہ کچھ بندوبست کیا جاتا، رسول اللہ ﷺ نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ اس کام کو غیر مسلموں کے ذمے لگایا جائے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ سپردگی نہ کی، بلکہ اس کام کے لیے آپ ﷺ نے اپنے معذور افراد پر بھروسا کیا اور ان لوگوں کے ذمے جنگ کے موقع پر گھروں کی نگہداشت اور خورونوش کے سامان کا انتظام سپرد کیا۔ اب ضروری تھا کہ ان لوگوں کو گھروں میں آنے کی اجازت ہو، ان آیات میں اس کا ذکر کیا۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ﴾ ''ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ!'' تمام مسلمان بے حد محتاط ہو گئے تھے اور کھانے پینے کے معاملے میں بے حد احتیاط رکھتے تھے، بغیر اجازت کسی کے ہاں سے کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس تنگی اور سختی کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں اور بتایا کہ تم ان رشتے داروں کے ہاں سے بلا تکلف کھا سکتے ہو اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ان گھروں میں باقاعدہ اجازت ہی سے کھا سکتے ہو اور اگر اجازت نہ ہو تو یہ چوری سمجھی جائے۔

عزیز واقارب کے گھروں سے کھانا:

﴿ اَنۡ تَاۡكُلُوۡا مِنۡۢ بُيُوۡتِكُمۡ ﴾ ''کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے۔'' کے ساتھ دوسرے رشتے داروں اور دوستوں کا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے گھر میں کھائیں یا ان رشتے داروں کے گھروں میں کھانا کھالیں، یہ برابر ہی ہے۔

باپ، دادا، ماں، بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، خالو، خالہ اور ان رشتے داروں کے ہاں سے کھانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ﴿ اَوۡ مَا مَلَكۡتُمۡ مَّفَاتِحَهٗۤ ﴾ ''وہ گھر جن کو مالک آپ کے سپرد کر گئے ہیں۔'' وہاں سے بھی کھا سکتے ہیں، جنگ کے دوران میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے۔ ﴿ اَوۡ صَدِيۡقِكُمۡ ؕ ﴾ ''دوستوں کے ہاں سے بھی کھا سکتے ہو۔''

﴿ لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَاۡكُلُوۡا جَمِيۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا ؕ ﴾ ''تم مل کر کھاؤ یا الگ الگ کوئی حرج نہیں ہے۔'' ایک نابینا آدمی کھانا کھاتے وقت بالکل ویسی احتیاط نہیں برت سکتا جیسی آنکھوں والا کر سکتا ہے۔ اسی طرح بچوں کا معاملہ ہے اور دوسرے معذور افراد کا بھی معاملہ ایسا ہی ہے کہ وہ مجبور ہیں۔ یہ قدرتی مجبوریاں ہیں، ان کو گوارا کرنا چاہیے۔ نفرت کے بجائے ہمدردی کا جذبہ ہونا چاہیے۔

کھانے کے آداب:

اگر کبھی اکٹھا کھانے کا موقع ہو تو برداشت کرنا چاہیے۔ ہندوؤں کی طرح ضروری نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ کھانے کو برا سمجھا جائے اور نہ ان عربوں کی طرح جو اگر کوئی ساتھ کھانے والا نہ ہوتا تھا تو کھانے ہی سے دست کش ہو کر فاقہ کر لیتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے کھانا الگ بھی کھایا اور مل کر بھی کھایا، مہمانوں کے ساتھ بھی کھایا، بیویوں کے ساتھ بھی اور بچوں کے ساتھ بھی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا اور دو دن سے فاقے سے تھا کہ دودھ کا ایک پیالہ آ گیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ حضور ﷺ خود نوش کریں گے اور باقی مجھے دے دیں گے، میں خوب سیر ہو کر پی لوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اصحابِ صفہ کو بلا کر لاؤ۔ جب ان کو بلانے کے لیے چلا تو سوچا: اب بیس پچیس آدمیوں میں میرے حصے کیا آئے گا؟ کاش میری باری پہلے آئے!

جب اصحابِ صفہ آ گئے تو آپ ﷺ نے پیالہ ان کو دینے کے لیے کہا۔ سب نے پیا، آخر میں میری باری آئی، میں نے پی کر حضور ﷺ کو دینا چاہا تو آپ ﷺ نے دو مرتبہ پینے کا حکم فرمایا، اس کے بعد آپ ﷺ نے خود نوش فرمایا۔ [1]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ولیمے کے موقع پر آپ ﷺ نے دس دس اصحاب کو اکٹھے بٹھا کر کھانا کھلایا۔ [2] اسی طرح آپ ﷺ نے معاشرے کی تنگی اور دقت کو دور کیا۔

یہاں یہی فرمایا ہے کہ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے کہ کس طرح کھاؤ: اکٹھے یا الگ الگ؟ بلکہ ضروری بات یہ ہے: ﴿فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰٓ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً ...﴾ جب گھروں میں داخل ہو، یہ گھر اپنا ہو یا دوسرے رشتے داروں کا، داخل ہوتے وقت ''السلام علیکم'' کہو۔ [3]



[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٦٣)

[3] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (1 ستمبر 1967ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سلام اور اس کے آداب

﴿ فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُیُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ تَحِیَّۃً مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ مُبٰرَکَۃً طَیِّبَۃً ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ﴾ [النور: ٦١]

’’پھر جب تم گھروں میں داخل ہوتو اپنے لوگوں پر سلام کہو، (یہ) اللہ کی طرف سے بابرکت (اور) پاکیزہ تحفہ ہے، اسی طرح اللہ تمھارے لیے آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھو۔‘‘

گھروں میں آمدورفت کی پابندیوں کا ذکر ہو رہا تھا، اس ضمن میں یہ بتایا گیا ہے کہ کن گھروں میں بے تکلف کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس معاملے میں ایک خاص ادب کا ذکر کیا ہے کہ جب کسی گھر میں داخل ہوتو ﴿ فَسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ ﴾ آپ (اپنے عزیزوں) کو سلام کرو۔ قریبی رشتے داروں کو سلام کرنا، اپنے آپ کو سلام کرنا ہے۔ ﴿ اَنۡفُسِکُمۡ ﴾ سے مراد اپنے لوگ ہیں۔ احباب، رشتے دار بمنزلہ ایک جان کے ہیں۔ مکان کے اندر اگر کوئی موجود نہ ہوتو بھی اپنے اوپر سلام کہنا چاہیے۔

سلام کی حیثیت و اہمیت:

سلام کہنا فرضِ کفایہ ہے۔ فرضِ کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ جماعت میں سے کسی ایک نے سلام کا جواب دے دیا تو دوسروں کی طرف سے فرض ادا ہو گیا، مثلاً: آپ مسجد میں آتے ہیں اور وہاں دس آدمی موجود ہوتے ہیں اور جواب میں ایک فرد سلام کا جواب دے دیتا ہے۔ اسی طرح اگر دس، بیس آدمی اکٹھے وارد ہوں تو ان میں سے چند کے سلام کر لینے سے فرض ادا ہو جائے گا۔[1] لیکن ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو سلام کرے تو اس پر واجب ہے کہ جواب دے اور پھر جواب بھی کس طرح دے؟ باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِذَا حُیِّیۡتُمۡ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوۡا بِاَحۡسَنَ مِنۡہَاۤ اَوۡ رُدُّوۡہَا ؕ ﴾ [النساء: ٨٦]

’’اور جب تمھیں سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا وہی الفاظ لوٹا دو۔‘‘

سلام کا طریقہ:

عمدہ اور پسندیدہ یہ ہے کہ مسلمان کے جواب میں بہتر الفاظ استعمال کیے جائیں۔ اگر اس نے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کہا ہو تو جواب میں "وَعُلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" کہنا چاہیے، یا "وَعُلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهُ"۔[1]

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کہنے والے کے لیے دس، "رَحْمَةُ اللّٰهِ" ساتھ کہنے والے کے لیے بیس اور "وبرکاتہ" بڑھانے والے کے لیے تیس نیکیاں نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔[2]

غیر مسلموں کے سلام کا بھی جواب دینا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ بہت الفاظ میں جواب دیا کرتے تھے، جس وقت بعض لوگوں نے "اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ" "تم پر موت ہو" کے الفاظ آپ کے متعلق استعمال کیے تو اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کے لیے صرف "وَعَلَیْکُمْ" پر اکتفا کیا۔[3]

سلام کی حکمت:

﴿ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ﴾: "اللہ کی طرف سے بابرکت، پاکیزہ تحفہ۔" "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" "تم پر سلامتی ہو" یہ خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ دعا ہے، جو بابرکت اور پاکیزہ ہے۔ یہ اسلامی اخلاق ہے کہ جب ایک بھائی دوسرے بھائی کو ملے تو اس کے لیے سب سے پہلے دعا کرے اور وہ اس سے بھی بہتر الفاظ میں اس کے لیے دعائیہ کلمات زبان سے ادا کرے۔ السلام علیکم کہنا اپنے مسلمان ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔

پہلی مرتبہ سلام کرنے سے دوسرے مسلمان سے تعلق قائم ہوتا ہے، اس کے بعد اس تعلق کی تجدید ہوتی ہے اور بار بار سلام کرنے سے یہ تعلق محبت و الفت میں بدلتا چلا جاتا ہے۔[4]

سلام ایک حق:

سلام کا جواب دینا، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے، چنانچہ فرمانِ رسول ﷺ ہے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢١٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٩٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٣٥)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٤)

((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْسٌ: رَدُّ السَّلَامِ، وَعِيَادَةُ الْمَرِيضِ، وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ، وَإِجَابَةُ الدَّعْوَةِ، وَتَشْمِيتُ الْعَاطِسِ))[1]

مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں:

1. سلام کا جواب دینا۔
2. بیمار کی مزاج پرسی کرنا۔
3. جنازے کے ساتھ جانا۔
4. دعوت کو قبول کرنا۔
5. چھینک کا جواب دینا۔

سلام کی فضیلت:

① ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اسلام میں سب سے بہتر عمل کیا ہے؟ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((سَلِّمْ عَلَىٰ مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ))[2] ''ہر شخص کو سلام کہو، خواہ تم اسے جانتے ہو یا اسے نہیں جانتے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جاننے والے ہی کو سلام نہیں کرنا چاہیے۔

② ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَفْشُوا السَّلَامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ؛ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ))[3]

''سلام کو خوب پھیلاؤ، محتاجوں کو کھانا کھلاؤ، ایک دوسرے پر صلہ رحمی کرو اور جب رات کو لوگ سوئے ہوئے ہوں تو اس وقت تم نماز پڑھو، اس طرح تم جنت میں سلامتی سے داخل ہو جاؤ گے۔''

③ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤٠)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٦١٢)
[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٥١)

((إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِاللّٰهِ مَنْ بَدَأَهُمْ بِالسَّلَامِ))[1]

''لوگوں میں اللہ کے نزدیک زیادہ مقرب وہ شخص ہے جو سلام کہنے میں پہل کرتا ہے۔''

سلام کہنے میں کون پہل کرے؟

پیدل چلنے والا بیٹھنے والے آدمیوں کو سلام کہے، سوار پیدل چلنے والے کو سلام کہے۔[2] تھوڑے آدمی اپنے سے زیادہ لوگوں کو سلام کہیں، کم عمر زیادہ عمر والے کو سلام کہے۔[3]

گھر میں داخل ہونے والا گھر والوں کو سلام کہنے میں پہل کرے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا:

((يَا بُنَيَّ! إِذَا دَخَلْتَ عَلٰى أَهْلِكَ فَسَلِّمْ يَكُوْنُ بَرَكَةً عَلَيْكَ وَعَلٰى أَهْلِ بَيْتِكَ))[4]

''پیارے بیٹے! جب اپنے گھر میں داخل ہو تو سلام کہا کرو، یہ سلام کہنا تمھارے اور تمھارے اہلِ خانہ کے لیے برکت کا باعث ہوگا۔''

چھوٹے بچوں اور اہلِ خانہ کو سلام کہنا:

رسول اللہ ﷺ بچوں کو بھی سلام کیا کرتے تھے۔[5] اگر بچے گھر میں سلام کیے بغیر داخل ہو جاتے تو ان کو واپس ہو کر سلام کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی بیویوں کو بھی سلام کیا کرتے تھے۔[6]

سب سے پہلا مدرسہ گھر ہوتا ہے، اس لیے اسلام نے چار دیواری میں مسلمان بچوں کی تربیت کے لیے خاص انتظامات کیے ہیں، انھیں یہیں سے سلام کہنے کی عادت ڈلوائی ہے۔

---

1. سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٩٧)
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣١)
3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣٢)
4. سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٩٨)
5. صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٤٧)
6. سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٠٤)

مجلس اور قبرستان میں:

مجلس میں جب کوئی آدمی داخل ہو تو سلام کہے اور جب وہاں سے اٹھے اور کچھ لوگ ابھی وہاں موجود ہوں تو سلام کہہ کر جائے، خاموشی سے اٹھ کر چلے جانا درست نہیں ہے۔[1]

قبرستان میں مُردوں کو بھی سلام کہنا چاہیے۔ جب قبرستان میں جائیں تو یہ الفاظ کہیں:

«السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُوْرِ، يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا، وَنَحْنُ بِالْأَثَرِ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ»[2]

''اے قبروں والو! تم پر خدا کی سلامتی اور رحمت ہو، اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں بخش دے۔ تم پہلے چلے آئے اور ہم تمھارے پیچھے آنے والے ہیں اور اگر اللہ چاہے گا تو تمھیں آملیں گے۔''

ایک شبہہ اور اس کا ازالہ:

بعض لوگ اس سلام سے ''سماعِ موتی'' ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ یہ کسی طرح درست نہیں، کیونکہ قرآن مجید میں ربِ قدوس نے واضح طور پر فرما دیا ہے:

﴿ إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ [النمل: ۷۹] ''تو مُردوں کو نہیں سنا سکتا۔''

مُردوں کو سلام کہنا ایک دعا ہے:

مُردوں پر سلام کہنے کا مطلب ان کے لیے دعا کرنا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے: ﴿ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ﴾ سلام تو ایک دعا ہے اور غیر حاضر کے لیے دعا کرنے کا ثبوت خود قرآن پاک میں ہے:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ ﴾ [الحشر: ۱۰]

''ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان میں ہم سے پہل کی۔''

ایک حدیث میں ہے کہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے اس کی عدمِ موجودگی میں

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۷۰۶) سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۲۰۸)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۰۵۳) نیز دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحديث (۲۴۹)

دعا کرتا ہے تو فرشتہ آمین کہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ کلمہ بھی کہتا ہے: ((وَلَكَ بِمِثْلِهِ)) تیرے لیے بھی ایسا ہی ہو۔[1]

دعا کے لیے دوسرے کا سننا ضروری نہیں ہے:

سلام خیر و برکت کی دعا ہے، اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ جس کے لیے یہ دعا کی جائے، وہ بھی اس کو ضرور سنے۔ قرآن پاک میں اس کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴾ [مریم: ۱۵]

''اور اس پر سلام ہے جس دن وہ پیدا ہوا، اور جس دن وہ مرے گا اور جس دن وہ دوبارہ زندہ (کرکے) اٹھایا جائے گا۔''

یہاں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے کہ اس پر سلام ہو۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر ولادت کے وقت، موت کے وقت اور بعد از زندگی کے وقت سلام کا اکٹھا تذکرہ کیا ہے۔ اس آیت سے بھی اس مسئلے کی وضاحت ہوتی ہے کہ جس پر سلام کہا جائے، اس کا سننا ضروری نہیں، بلکہ غائب کے لیے بھی سلامتی کی دعا کی جا سکتی ہے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر سلام:

سورت مریم ہی میں دوسری جگہ بزبان حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارشاد ہے:

﴿ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴾ [مریم: ۳۳] یہاں بھی سلامِ ولادت، موت اور اخروی زندگی کا یک جا ذکر کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مُردوں کو ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کہنے سے ان کی زندگی اور سماع کی دلیل نہیں لی جا سکتی۔ بعض روایات میں مُردوں کے سننے کا ذکر موجود ہے، لیکن یہ روایات اس قدر ضعیف ہیں کہ قابلِ احتجاج نہیں۔ آپ مُردوں کے لیے سلام و دعا کریں اور بحث میں نہ پڑیں کہ وہ سنتے ہیں یا نہیں۔

السلام علیکم ایک دعائیہ فقرہ ہے، اس کا خدا تعالیٰ کو سنانا ضروری ہے، کسی اور کو سنانا ضروری نہیں ہے۔

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٢، ٢٧٣٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٣٤)

سلام کا جواب:

ہر سلام کہنے والے کو سلام کا جواب دینا چاہیے۔ جیسے سلام کہنا واجب ہے، اسی طرح اس کا جواب دینا بھی ضروری ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے آئے تھے، انھوں نے آپ کو سلام کہا اور آپ نے بھی جواب میں ﴿سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ﴾ [الذاریات: ۲۵] فرمایا۔

سلام کہنے والے کے جواب میں ضروری نہیں ہے کہ پہلے ترازو لے کر اس کا ایمان تولا جائے اور بعد میں جواب دیا جائے۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ اب ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو سلام کے جواب میں پہلے عقیدہ دریافت کرتے ہیں۔ اب اگر عقیدہ ان کے منشا کے مطابق ہو تو ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں، ورنہ خاموشی: اور عقیدہ بھی کیا: اسماعیل دہلوی رحمہ اللہ کافر تھے یا نہیں؟ یہ تنگ ظرفی کی انتہا ہے!

خدا تعالیٰ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر کوئی دار الکفر تک میں بھی سلام کہے تو اس کا جواب ضرور دینا چاہیے: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ [النساء: ۹٤] اس آیت پر ان لوگوں کو غور کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ تو کافروں تک کے سلام کا جواب دے دیا کرتے تھے اور ایک یہ ہیں منبرِ رسول ﷺ پر کھڑے ہونے والے کہ کلمہ گو مسلمانوں کے ایمان کو بھی سلام کے جواب سے پہلے ناپنا ضروری سمجھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے گھر میں، مجلس میں، زندہ کو، مردے کو، واقف کو اور ناواقف کو، سب کو سلام کہا ہے اور سب کے سلاموں کا جواب دیا ہے۔

کھڑے ہو کر سلام کہنا:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو کوئی یہ پسند کرے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے گا۔“[1]

اس زمانے میں دستور تھا کہ لوگ بڑے آدمیوں کو اٹھ کر سلام کیا کرتے اور جواب دیتے وقت بھی کھڑے ہو جایا کرتے۔ بادشاہوں کے درباروں میں لوگ بادشاہوں کے لیے بار بار کھڑے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٢٩)

ہوا کرتے۔ ذرا سی جہاں پناہ نے جنبش کی اور سارے درباری اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا، البتہ مہمان کو اٹھ کر ملنا جائز ہے۔

سلام کس آواز میں کہنا چاہیے؟

سلام کے لیے ضروری نہیں ہے کہ بہت بلند آواز میں کہا جائے، کیوں کہ برکات اس میں اللہ تعالیٰ نے ڈالنی ہیں۔ بعض دفعہ چلتے ہوئے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو سلام کہتا ہے، لیکن وہ سن نہیں پاتا تو اسی پر لوگ غصہ مناتے ہیں۔ ناراض نہیں ہونا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت رنج وغم میں تھے، اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بے ہوشی کا سا عالم طاری تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسی حالت میں بیٹھے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خاموشی کا شکوہ کیا کہ انھوں نے سلام کا جواب نہیں دیا، چنانچہ فاروق وصدیق رضی اللہ عنہما عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے ہیں۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں کہ عثمان! تمھارے بھائی عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو سلام کہا تو آپ نے جواب کیوں نہیں دیا؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ایسا تو نہیں ہوا، بلکہ مجھے تو خبر ہی نہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے سلام کیا تھا۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ آدمی ذہنی طور پر ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ سلام کی آواز نہیں سنتا، اگر کبھی ایسا ہو تو اس کو حسنِ ظن پر محمول کر کے نظر انداز کر دینا چاہیے۔[2]



[1] مسند أحمد (٢٠) ط: دار الرسالة.

[2] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (7 ستمبر 1967ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آدابِ مجلس

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿62﴾﴾ [النور: ٦٢]

''بس مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، اور جب وہ رسول کے ساتھ کسی اجتماعی کام پر ہوتے ہیں تو آپ سے اجازت لیے بغیر (وہاں سے) چلے نہیں جاتے، (اے نبی!) بلاشبہ جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، چنانچہ جب وہ اپنے کسی کام کے لیے آپ سے اجازت مانگیں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دیں، اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگیں، بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

ربطِ آیات:

سورت نور میں اول سے آخر تک معاشرے کی اصلاح کے لیے مختلف احکام بیان کیے گئے ہیں۔ پہلے جن مسائل کا تذکرہ ہو چکا ہے، وہ عموماً گھریلو زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ سورت کی ان آخری آیات میں مجلسی زندگی کے چند آداب کا ذکر کیا گیا ہے۔

مجلسی زندگی کے آداب:

چنانچہ مومن کے اوصاف بتلائے گئے ہیں کہ مومن وہ ہے:

1 ﴿الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ﴾ ''جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو۔''

2 ﴿ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ ''اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو۔''

3 ﴿ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ﴾ ''اور اجتماعی کام کے موقعے پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوں تو اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔''

تیسری چیز، یعنی کسی اجتماعی کام میں شریک مسلمان، صدرِ مجلس کی اجازت کے بغیر مجلس سے اٹھ کر نہ جائے، یہ ضابطہ اجتماعیات کا بہت بڑا قانون ہے۔ کوئی نظم اس پابندی کے بغیر چل نہیں سکتا۔ کسی اجتماع کو اس پابندی کے بغیر کامیاب نہیں بنایا جا سکتا۔

غزوۂ احزاب کے موقعے پر مدینے کی حفاظت کے لیے ایک خندق کھودی جا رہی تھی، اس کام میں تمام مسلمان شریک تھے۔ حضرت محمد ﷺ بھی وہاں نہ صرف موجود رہتے تھے، بلکہ پوری تن دہی سے کام کرتے تھے،[1] لیکن منافقین بغیر اجازت وہاں سے کھسک جاتے۔ ان آیات میں فرمایا کہ آپ ﷺ سے اجازت وہی لوگ مانگتے ہیں جو ایمان دار ہیں۔

﴿ اَمْرٍ جَامِعٍ ﴾ اس میں جمعے کے اجتماع بھی شامل ہیں۔ نماز کے اوقات بھی جامع امور میں سے ہیں۔

جمعہ اور اس کے آداب:

جمعے کے لیے آنے والوں کو اس کے مختلف آداب بتائے گئے ہیں:

بیٹھنے کے آداب: خطبے کے لیے آنے والے کس طرح اس مجلس میں بیٹھیں، جو امام کے قریب بیٹھنا چاہتا ہے، وہ پہلے آئے۔ بعد میں آنے والے، پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے آنے کی کوشش نہ کریں۔ جو لوگ پہلے سے آئے ہوئے ہوں، ان کو چاہیے کہ اس طرح بیٹھیں کہ درمیان میں کوئی جگہ باقی نہ رہے۔

کانا پھوسی سے منع فرمایا۔[2] اشارے بھی نہ کریں، البتہ کسی کو شور سے منع کرنے کے لیے اشارے کر سکتے ہیں۔[3]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٨٧٨)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٩٤٣)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١١١١)

آپ ﷺ نے حکم دیا کہ خطبہ پوری توجہ سے سنا جائے۔[1] ہمہ تن گوش ہو کر وہاں بیٹھنا چاہیے۔ خطبے کے وقت اس طرح گوش بر آواز ہو کہ کسی اور طرف بالکل دھیان نہ جائے۔ آپ ﷺ نے خطبے کے دوران میں تنکوں کے ساتھ کھیلنے سے بھی منع فرمایا اور اس کو لغو کام قرار دیا:

((مَنْ مَّسَّ الْحَصیٰ فَقَدْ لَغیٰ))[2]

''اور جو (بلاوجہ) کنکریوں کو ہاتھ لگاتا رہا (ان سے کھیلتا رہا) اس نے لغو اور فضول کام کیا۔''

یعنی اس طرح سے اس اسبوعی اجتماع کے لیے مختلف ہدایات دیں۔ یہ مسلمانوں کا ہفتہ وار اجتماع ہے۔ اس سے ان کو اپنے اور دنیا کے حالات کا علم ہوتا رہتا ہے۔ تمام ائمہ کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ایک شہر میں جمعے کے کم سے کم اجتماع ہوں، ہر مسجد میں جمعے کے لیے لوگوں کو بلانا جمعے کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ اس معاملے میں ہمیشہ ضرورت ملحوظ رہنی چاہیے۔ ضرورت بھی خطیب کی اپنی ذاتی ضرورت نہیں، بلکہ عام مسلمانوں کی ضرورت مراد ہے۔

اجتماعی امر:

﴿اَمْرٍ جَامِعٍ﴾ میں عیدین کے اجتماع بھی شامل ہیں، یہ سالانہ اجتماع ہیں۔ ان کی اہمیت جمعے کے اجتماعوں سے بہت زیادہ ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے حکم دیا کہ عیدین میں عورتیں بھی حاضر ہوں۔[3] عورتیں سادہ لباس میں جائیں اور باپردہ ہوں۔ عیدین کے لیے اگر ممکن ہو تو آنے اور جانے کے لیے الگ الگ راستے اختیار کیے جائیں۔[4]

خطبے کے وقت صرف خطیب ہی کی آواز سنی جائے، مجمع میں سے کوئی آواز نہ اٹھے، وقار کو پوری طرح ملحوظِ نظر رکھا جائے۔ اجتماع گاہ میں کوئی شور وغوغا اور ہنگامہ نہ ہو، بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا نظم ہو۔ آنے جانے اور بیٹھنے اٹھنے میں نظم ہی نظم کا اظہار ہو، باتیں اور شور کے بجائے تکبیریں کہی جائیں۔ ان تمام آداب کے مطابق اگر یہ تہوار منایا جائے تو کسی قسم کی بے ہودگی اور اخلاقی گندگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٨٦)

صدرِ مجلس کی اجازت:

بعض اوقات مشورے کے لیے اجتماع کیا جاتا ہے۔ یہ کسی عمومی مسئلے کے متعلق ہوتا ہے۔ اس کے ساری قوم پر اثرات پڑنے والے ہوتے ہیں، بایں وجہ اس مجلس میں آنے والوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اگر اجلاس کے خاتمے سے پہلے کسی کام کے لیے جانا چاہیں تو صدرِ مجلس سے اجازت لیں، وہاں سے بلا اجازت جانا غلط ہے۔

سربراہِ مجلس کو ہدایت:

یہاں مجلس کے سربراہ کو بھی ہدایت کی ہے: ﴿ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ ﴾ یعنی جس وقت کوئی مسلمان اپنے کسی ذاتی کام کے لیے اجازت مانگے تو جس کو آپ مناسب سمجھیں، اجازت دے دیں۔ اب اگر امیرِ مجلس اجتماع میں اس فرد کی حاضری کو ضروری سمجھے تو وہ اجازت سے انکار کرسکتا ہے۔ اس معاملے میں رسول اللہ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے جانشینوں کو اختیار دیا گیا ہے: ﴿ فَأْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ ﴾ ''آپ جس کو چاہیں اجازت دیں۔''

اگر ذمے دار سربراہ یہ سمجھے کہ اجازت طلب کرنے والے کی ذاتی ضرورت سے اجتماعی مفاد زیادہ اہم ہے تو اس کو پورا حق ہے کہ اجازت نہ دے۔ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ایک مومن اور مسلمان کے لیے بے حد ضروری امر ہے کہ اس انکارِ اجازت سے رنجیدۂ خاطر نہ ہو۔

﴿ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ﴾ ''اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگیے۔'' اس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی اور واقعی ضروریات کے لیے اجازت مانگنا تو درست ہے، لیکن حقیقی ضرورت کے بغیر اجازت لینا گناہ ہے اور اگر کوئی مسلمانوں کے اجتماعی فائدے کے مقابلے میں اپنے ذاتی معاملے کو ترجیح دے یا ذاتی مفاد کی خاطر ایسا کر رہا ہو تو یہ قابلِ مواخذہ ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک مضحکہ خیز استدلال:

﴿ أَمْرٍ جَامِعٍ ﴾ میں بعض لوگوں نے ''میلاد النبی ﷺ'' کے جلوسوں کو بھی شامل کرنے کی

کوشش کی ہے، یہ بالکل غلط ہے۔ ان ہنگامہ خیز جلوسوں کا ﴿ اَمْرٍ جَامِعٍ ﴾ سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ علم اور حیا کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ﴿ اَمْرٍ جَامِعٍ ﴾ میں ان جلوسوں کو شامل کرنا، حیا سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔ ایسے لوگوں سے صرفِ نظر ہی بہتر ہے کہ ان سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خطبے میں کوئی نہ بولے۔ تنکوں سے بھی نہ کھیلا جائے۔ کسی شور کرنے والے کو چپ کرانے والا بھی زبان استعمال کرے گا تو گناہ گار ہوگا، وہ بھی اشارے سے منع کرے۔[1]

رسول اللہ ﷺ خطبے کے لیے کھڑے ہوتے تو آپ ﷺ کی آواز بلند اور گرج دار ہو جاتی، چہرے پر غصے کے آثار ظاہر ہوتے اور ہیبت کا سماں بندھ جاتا۔[2] ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی عذاب جلد آنے والا ہے۔ سارا مجمع پروقار اور باادب ہوتا۔ اس کے مقابلے میں یہ جلوس بھی ملاحظہ ہوں! کوئی چیز ان میں اس وقار اور ادب میں سے ایسی نہیں ہے جو اس سے کچھ تعلق رکھتی ہو، ان جلوسوں کو ﴿ اَمْرٍ جَامِعٍ ﴾ کہنا اللہ کے دین پر ظلم ہے۔

طلبِ اجازت ایمان کی نشانی ہے:

﴿ لَمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ﴾ یہ "استیذان" (اجازت طلب کرنا) ایمان کی نشانی ہے، کیونکہ کوئی منافق اجازت نہ لیتا تھا۔ مجمع کے آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے، وہاں سے بغیر اجازت نہیں جانا چاہیے۔ مجلسِ مشاورت سے امیر کی اجازت کے بغیر جانا اخلاق سے گری ہوئی عادت ہے۔ کسی کی صدارت و امارت کو قبول کرنے کے بعد مجلس سے اس کی اجازت کے بغیر جانا ایمان کے تقاضوں کے منافی ہے، یہ ایمان میں خلل کی نشانی ہے۔ مجلس کے دوران میں نجویٰ (سرگوشی) سے پرہیز کرنا چاہیے۔ "کانا پھوسی" اور "سرگوشی" سخت معیوب اور آدابِ مجلس کے خلاف ہے۔ مجلس کے اندر آپس میں باتیں نہیں کرنا چاہیے۔ جمعے کے لیے آنے والے وہاں اگر باتیں کریں تو ان کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ ایسے ہی ہیں گویا وہ جمعہ میں آئے ہی نہیں۔[3]

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١١١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧)

[3] المعجم الكبير للطبراني (١٢٥٦٣)

مجلسِ نبوی:

بے ضرورت چلنا پھرنا بھی منع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں صحابہ ہمہ تن توجہ، ہمہ تن گوش ہوتے۔ مجلس میں پوری طرح سناٹا اور خاموشی ہونی چاہیے، گویا سروں پر پرندے بیٹھے ہیں کہ تھوڑی سی آواز انھیں اڑا دے گی۔

میلاد النبی اور دیگر سیاسی جلوس:

میلاد النبی ﷺ کے جلوسوں کے علاوہ دوسرے سیاسی جلوس بھی ﴿ اَمۡرٍ جَامِعٍ ﴾ میں شامل نہیں ہیں، یہ سیاسی مقاصد کے لیے ہوتے ہیں اور حکومت کے خلاف احتجاج ان کا مقصد ہوتا ہے، یا حکومت کے حق میں مظاہرہ۔

﴿ لَمۡ يَذۡهَبُوۡا حَتّٰى يَسۡتَاۡذِنُوۡهُ ؕ ﴾ اجازت کسی حقیقی ضرورت کے لیے طلب کرنا چاہیے، جیسے: بھوک، پیاس، بول و براز یا کوئی اور ضرورت؛ یہ اجتماعی زندگی کے آداب ہیں۔ محلے کے اندر کوئی اجتماع ہو تو وہاں جانا چاہیے۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ بات سنی جائے۔

اسمبلیوں کے اجلاس:

ملک میں صوبائی اور مرکزی اسمبلیاں ہیں۔ عوام نے ان کے لیے چند لوگوں کو ممبر چنا ہوا ہے۔ ان اسمبلیوں کا ایک طریقِ کار ہے۔ لاکھوں روپے ان اداروں پر خرچ ہو رہے ہیں۔

ممبران کے فرائض بالکل متعین اور واضح ہیں۔ ممبروں کا فرض ہے کہ وہاں حاضر رہیں اور سپیکر کی اجازت کے بغیر اسمبلی ہال سے نہ جائیں، لیکن افسوس کہ اس اہم ادارے کا کورم بار بار ٹوٹتا ہے اور اجلاس معطل ہوتے ہیں۔ اجلاس کے وقت کسی حقیقی ضرورت کے بغیر اٹھنا گناہ ہے۔ ممبران کو چاہیے کہ اپنے فرائض کا خیال رکھیں۔ ان کی کوتاہی سے ملک کو بے حد نقصان ہوتا ہے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (29 ستمبر 1967ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آدابِ رسول ﷺ

﴿لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَیۡنَکُمۡ کَدُعَآءِ بَعۡضِکُمۡ بَعۡضًا ؕ قَدۡ یَعۡلَمُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ یَتَسَلَّلُوۡنَ مِنۡکُمۡ لِوَاذًا ۚ فَلۡیَحۡذَرِ الَّذِیۡنَ یُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِہٖۤ اَنۡ تُصِیۡبَہُمۡ فِتۡنَۃٌ اَوۡ یُصِیۡبَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿63﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ قَدۡ یَعۡلَمُ مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡہِ ؕ وَ یَوۡمَ یُرۡجَعُوۡنَ اِلَیۡہِ فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿64﴾﴾ [النور: ٦٣، ٦٤]

’’تم رسول کے بلانے کو باہم ایک دوسرے کو بلانے کے مانند نہ ٹھہراؤ، یقیناً اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں، لہٰذا چاہیے کہ جو لوگ اس (اللہ اور اس کے رسول) کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اس (بات) سے ڈریں کہ انھیں کوئی آزمائش آپڑے یا انھیں دردناک عذاب آلے۔ خبردار! بلاشبہ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، یقیناً وہ اس (روش) کو جانتا ہے جس پر تم ہو، اور جس دن وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ انھیں خبر دے گا جو انھوں نے عمل کیے، اور اللہ ہر شے کو خوب جانتا ہے۔‘‘

اس آیت کے معنی و مفہوم اور اس کے احتمالات کا ذکر ہو چکا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے آداب کیا ہیں؟ حضور ﷺ کو بلانے اور آپ ﷺ کو مخاطب کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ پچھلے خطبے میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔[1] آج دعا کے ایک اور احتمال و معنی کی طرف توجہ کرانا ہے۔

[1] دعاء الرسول ﷺ کے ان معانی پر مشتمل خطبہ قلم بند نہیں ہو سکا۔ یہ معانی تفاسیر کی کتابوں میں مل جائیں گے، البتہ زیرِ نظر خطبے میں ’’دعاء الرسول‘‘ کا جو معنی بیان کیا گیا ہے، اس کی تفصیل وتشریح صرف مولانا مرحوم ہی کا حصہ ہے، عام تفاسیر میں شاید یہ تفسیر نہ مل سکے۔ (عبدالسلام)

دعوتِ رسول ﷺ کا امتیاز:

دنیا میں اس وقت بے شمار دعوتیں موجود ہیں اور رہی ہیں۔ ان کے مقابل رسول اللہ ﷺ کی بھی ایک دعوت ہے۔ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ کی دعوت کو دنیا کے لوگوں کی دعوتوں پر قیاس نہ کرو: ﴿ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ ﴾

ایک دعوت دنیا کے بادشاہوں اور وقت کی حکومتوں کی ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ تمام لوگ ان کی سلطنت کو قبول کریں، جس قدر احکام وفرامین ان کی طرف سے جاری و نافذ کیے جائیں، وہ قبول کیے جائیں۔ ایک مسلمان پابند نہیں ہے کہ ان تمام احکام وقوانین کو قبول کرے۔ ہر وہ حکم، جو شریعت کے خلاف ہو، رد کیا جانا چاہیے۔ حکومتیں اور حکام ناراض ہوں یا راضی، اس معاملے میں راہِ عزیمت اختیار کرنی چاہیے۔

قوت کو ترجیح دینے کے بجائے اور اس کے آگے جھکنے کے بجائے دین کو ترجیح دینی چاہیے۔ یہ معاملہ تاریخ کے ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ علمائے حق ہمیشہ اپنا حق ادا کرتے رہے ہیں۔ ان علمائے حق اور بزرگانِ دین نے جزوی امور تک میں حکومتوں پر تنقیدیں کی ہیں اور دعاء الرسول کی اہمیت کو کبھی کم نہیں ہونے دیا۔ ان میں سے بعض حکومتیں ان کی تنقید کو صرف برداشت ہی نہیں، بلکہ قبول بھی کرتی رہی ہیں۔

ایک سنہری مثال:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طے کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ مہر باندھنے سے روکنے کے لیے 400 درہم مہر کی حد مقرر کر دی جائے۔ اس امر کے فیصلے کا اعلان آپ نے جمعے کے خطبے میں کر دیا۔ ایک عورت نے تنقید کی کہ خدا تعالیٰ نے تو قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿ وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ﴾ [النساء: ٢٠]

”اور تم نے ان میں سے کسی کو بہت سا مال دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔“

آپ کس طرح مہر کی حد مقرر کر رہے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی حد مقرر نہیں کی؟ ایسا کرنا سنت کے خلاف ہے!

خلیفہ نے اس تنقید کو قبول کیا اور اعلان واپس لے لیا، بلکہ نقادہ کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عورتیں عمر سے زیادہ قرآن کو سمجھتی ہیں۔[1]

حضرت عمر دعاء الرسول کے مفہوم کو خوب سمجھتے تھے، اس لیے ﴿ لَا تَجْعَلُوْا ﴾ کا تقاضا پورا کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو جزواً اور کلاً ہمیشہ قبول کیا۔ اس کے مقابلے میں دنیوی دعوتوں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ دعوتِ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی دعوت کو قبول نہیں کیا جا سکتا: ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾[النساء: ٥٩] اللہ، رسول اور اولی الامر، تینوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، تینوں کے احکام ماننے کو کہا گیا ہے۔

مشروط اطاعت:

خدا اور رسول کی اطاعت غیر مشروط ہے، لیکن اولی الامر کی اطاعت مشروط ہے۔ اس کے متعلق کہا کہ ﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾[النساء: ٥٩] اگر اس (اولی الامر) کے احکام خدا اور رسول کے خلاف ہوں تو وہ واجب الطاعہ نہیں ہے۔ احکام کا شریعت کے مطابق ہونا، حکومت کے احکام کے لیے شرطِ تعاون قرار دیا گیا ہے۔ حکومت کی دعوت کلی یا جزوی طور پر کسی طرح بھی رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے خلاف نہ ہو، اگر خلاف نہ ہو تو واجب الطاعہ ہے۔

علماء و فقہاء کی تقلید ناروا ہے:

ایک دعوت علماء کی ہے۔ فقہاء و محدثین، ائمۂ کرام، سب نے ایک دعوت دی ہے۔ کچھ مسائل میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، یقیناً ایسا ہے کہ ان کی بعض آراء درست ہیں اور بعض درست نہیں ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ حق کی تلاش کریں اور جہاں سے بھی حق ملے، لے لیں، یہی دعوتِ رسول ہے۔ علمائے دین اور ائمۂ کرام کی اہمیت اتنی نہیں بڑھا دینی چاہیے کہ جب ان کے بعض اقوال کے متعلق ہمیں معلوم ہو جائے کہ سنت کے خلاف ہیں، لیکن پھر بھی ہم اس پر عمل کرتے رہیں یا تاویل کرتے چلے جائیں، یہ دعوت رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہے۔ یہ خود ائمۂ کرام کے فرمان و دعوت کے بھی خلاف

[1] سنن البيهقي (٢٣٣/٧) امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت منقطع ہے، نیز اس کی سند میں مجالد بن سعید بھی ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٣٤٧/٦) تفسير ابن كثير (٢٤٤/٢)

ہے۔ ائمہ کرام نے ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے سے ہمیشہ منع کیا ہے، مثلاً: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اُتْرُكُوْا قَوْلِيْ بِخَبَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، إِذَا صَحَّ الْحَدِيْثُ فَهُوَ مَذْهَبِيْ"[1]

"میرے قول کو حدیثِ رسول ﷺ کے مل جانے پر ترک کر دو۔ جب حدیث ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔"

مقلدین کی حالت:

ان لوگوں نے تو اپنی تمام عمر یہ صدائے حق لگانے میں صرف کر دی تھی کہ ہماری رائے اگر حدیثِ رسول ﷺ سے ٹکرائے تو اس کو فوراً رد کر دینا اور ایسی صورت میں ہمارا مذہب بھی وہی ہے جو حدیثِ رسول ﷺ میں مذکور ہے۔ دعوتِ رسول کا یہی تقاضا ہے اور ان پاک ہستیوں نے ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ کے مفہوم پر بالکل پوری طرح عمل کیا۔ بعد کے لوگوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس سے وہ بری الذمہ ہیں۔ یہاں تو یہ قاعدہ بنا دیا:

"إِذَا كَانَ فِي الْمَسْئَلَةِ قَوْلٌ لِأَبِيْ حَنِيْفَةَ وَصَاحِبَيْهِ وَحَدِيْثٌ يَحْكُمُوْنَ بِصِحَّتِهِ وَجَبَ اتِّبَاعُ قَوْلِهِمْ دُوْنَ الْحَدِيْثِ، لِأَنَّا لَا نَظُنُّ بِأَبِيْ حَنِيْفَةَ وَصَاحِبَيْهِ أَنَّهُمْ عَارَضُوا الْحَدِيْثَ مَعَ صِحَّتِهِ وَصِحَّةِ الْاِسْتِنْبَاطِ مِنْهُ"[2]

یعنی اگر کسی مسئلے میں ایک طرف امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کا قول ہو اور دوسری طرف حدیث ہو تو حدیث کو ترک کر دینا اور ان کا قول اختیار کرنا واجب ہے، کیونکہ آخر کوئی بات تو ہو گی جس کی بنا پر انھوں نے ایسا کیا ہے۔

کیا یہ طرزِ عمل دعوتِ رسول ﷺ سے کوئی مطابقت رکھتا ہے؟ کیا ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ﴾ کا تقاضا یہی ہے؟

---

[1] رد المحتار (٦٨/١) عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد (ص: ٢٢)

[2] شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حنفیہ نے اپنے خلاف صحیح احادیث کو رد کرنے کے لیے تو اصول وضع کر رکھے ہیں، پھر شاہ صاحب نے وہ نو اصول تحریر فرمائے ہیں، ان میں سے یہ قاعدہ ساتویں نمبر پر ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے: فتاویٰ عزیزی مطبوعہ مجتبائی دہلی 1322ھ (جلد اول صفحہ 63,62) منقول از تقریظ مولانا شرف الدین محدث دہلوی بر نتائج التقلید۔ (عبدالسلام)

حضرت امام مالک منبرِ رسول ﷺ پر فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کے ہر آدمی کی بات رد کی جا سکتی ہے، "إِلَّا صَاحِبُ هَذَا الْقَبْرِ"صرف رسولِ خدا ﷺ کی کوئی بات رد نہیں کی جا سکتی۔ ﴿ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ ﴾ کی یہ بالکل واضح تفسیر ہے۔

بدعات کی دعوت:

ملک کے اندر اور بھی کئی طرح کی دعوتیں دی جا رہی ہیں۔ ایک دعوت بدعات کے اختیار کرنے کی دعوت ہے۔ ایسی رسموں کو کرنے اور کرانے پر اصرار کیا جا رہا ہے، جن کی کوئی مثال خیر القرون تو درکنار، بعد کے کسی زمانے میں بھی نہیں ملتی۔ اس کے کرنے والے خود معترف ہیں کہ اس کا رواج ماضی قریب ہی میں شروع ہوا ہے، پھر ستم یہ ہے کہ ان بدعات کو اس طرح امت کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے کہ اصل دعوتِ رسول یہی ہے۔ درحقیقت یہ دنیوی دعوتیں ہیں، ان کی کوئی دینی اہمیت نہیں ہے اور ان کو اہمیت دینا، دعوتِ رسول ﷺ کی اہمیت کو کم کرنا ہے۔

مقامِ دعوت کی اہمیت اگر ان لوگوں کے منظورِ خاطر ہوتی تو یقیناً اس صحابی کے عمل کو نمونہ بنایا جاتا۔ رسولِ خدا ﷺ خطبہ دے رہے ہیں، اس دوران میں آپ ﷺ نے صحابہ کو بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ ایک صحابی اس وقت جوتوں کے پاس کھڑے تھے، آپ فوراً وہاں ہی بیٹھ گئے۔[1]

تین طبقات:

بدعات کی طرف بلانا اپنی دعوت کو رسول ﷺ کی دعوت سے آگے کرنا ہے، جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے: ﴿ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ﴾[النور: ٦٣]

ہر دعوت کے سننے والوں میں ہمیشہ تین طبقے ہوتے ہیں:

1. کھلے دل سے قبول کرنے والے۔
2. پوری طرح سے مسترد کرنے والے۔
3. بین بین چلنے والے، نہ ادھر نہ ادھر اور اپنے خیال میں وہ حق و باطل، دونوں کو راضی رکھنے والے ہوتے ہیں، ان کو منافق کہا جاتا ہے۔

ان منافقین کا طرزِ عمل یہ ہوتا تھا کہ حضور ﷺ کی مجلس سے کھسکنے کے لیے حیلے اور بہانوں کی

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٩١)

تلاش میں رہتے تھے۔ کسی مخلص مسلمان نے اجازت لی اور یہ اس کی آڑ میں اٹھ کر پیچھے پیچھے ہو لیے اور اس طرح چپکے سے وہاں سے کھسک جاتے۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا ہے: ﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کون لوگ ایسا کر رہے ہیں، ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی ہے۔

شرعی احکام پر عمل سے حیلوں کے ذریعے راہِ فرار اختیار کرنا:

اس آیت پر انشراحِ قلب سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی قسم کا حیلہ اچھا نہیں ہوتا۔ حیلے اور بہانے احکامِ شریعت سے فرار کا ذریعہ ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے کہ جو آدمی حیلے سے احکامِ شریعت کی خلاف ورزی کرے گا، قیامت کے دن اس کی پشت پر اسی کے درجے کے مطابق جھنڈا ہوگا۔[1] احکامِ دین سے بچنے کے لیے علماء نے جو حیلے تراشے ہوئے ہیں، ان کا سارا وبال علماء کے حصے میں آئے گا کہ عوام کا اس میں لاعلمی کی وجہ سے کوئی قصور نہیں ہے۔

فرائض و احکام سے بچنے کے لیے جو حیلے تراشے گئے ہیں، ان میں ایک زکات کے متعلق ہے۔ زکات اس مال پر فرض ہوتی ہے جو مالک کی ملکیت میں ایک سال پورا کرے۔ گیارہ ماہ تک مال خود اپنے پاس رکھنا اور اس کے بعد بیوی کے نام پر ہبہ کر دینا اور اس کے پاس سے پھر سال مکمل ہونے سے قبل واپس لے لینا، یہ عمل ﴿يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ کی نہایت مکروہ شکل ہے۔

حیلہ عبادت میں ہو، کاروبار میں ہو، احکام و فرائض میں ہو، کسی شکل میں بھی خدا سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے ہی کہا ہے: ﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ﴾ خدا خوب جانتا ہے۔ احکام و فرائض میں حیلے تراشنا، خود اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۹]

حیلوں کی مذمت:

علمائے حق نے بڑی سختی سے حیلوں سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨٨، ٦٩٦٦)

"أَحْدَثُوا الْحِيَلَ فِي الْإِسْلَامِ فَمَنْ كَانَ أَمَرَ بِهَذَا فَهُوَ كَافِرٌ"[1]

"اسلام میں لوگوں نے حیلے تلاش کر لیے ہیں، جو کوئی ان کے مطابق فتویٰ دے گا تو وہ کافر ہے۔"

شریک بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایسا کرنا خدا کو دھوکا دینا ہے۔[2] ایوب سختیانی رحمہ اللہ نے فرمایا: "یُخَادِعُون اللّٰهَ كَأَنَّمَا یُخَادِعُونَ الصِّبْيَانَ ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النور: ٦٣]

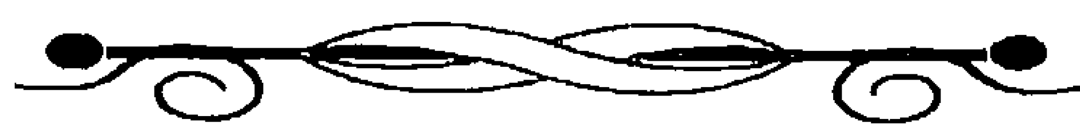
"وہ اللہ کو ایسے دھوکا دیتے ہیں، جیسا کہ بچوں کو دھوکا دیا جاتا ہے، جو لوگ اس (اللہ اور اس کے رسول) کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اس (بات) سے ڈریں کہ انھیں کوئی آزمایش آپڑے یا انھیں دردناک عذاب آلے۔"

فتنے کا معنی:

فتنے کے مختلف مطالب بیان کیے گئے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

1. ظالم بادشاہ کا تسلط، یعنی نبی اکرم ﷺ کے احکام کی مخالفت کی پاداش میں جابر ظالم حکمران مسلط کر دیے جائیں گے۔
2. آپس میں تفرقہ بازی اور مخالفت و خانہ جنگی۔
3. اخلاقی زوال، روحانی بیماریاں اور شرک و بدعت میں مبتلا ہو جانا۔

"عذاب" سے مراد ہر طرح کے مصائب ہیں: بیماری، زلزلہ اور سیلاب وغیرہم۔ ﴿قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ﴾: ان الفاظ میں ایک سخت ڈانٹ ہے کہ قیامت کے دن تمھارا سب کیا دھرا سامنے آ جائے گا۔ تمھاری زندگی کا کوئی گوشہ خدا سے اوجھل نہیں ہے۔ کون کس نیت سے کیا کرتا رہا ہے؟ خدا سب جانتا ہے۔[3]





[1] أعلام الموقعين (١٤٠/٣)

[2] المحلیٰ لابن حزم (٤٢٨/٩)

[3] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (6 اکتوبر 1967ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کفار کے شبہات اور عبدیتِ کاملہ

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِهٖ لِیَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۟ۙ۝۱ ﴾ [الفرقان: ۱]

”وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا، تاکہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا بنے۔“

سورت فرقان:

سورت نور کے بعد سورت فرقان شروع ہو رہی ہے۔ سورت فرقان کا زمانۂ نزول مکہ میں قیام کا ہے۔ یہ سورت نبی کریم ﷺ کی ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ سورت فرقان مضامین کے لحاظ سے سورت نور سے مختلف ہے، سورت نور میں جیسا کہ تفصیل کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے، گھریلو زندگی کے حالات، معاشرے و کنبے کے حالات اور آپس کے برتاؤ کو درست رکھنے کے لیے احکامات ہیں۔ ان احکامات سے روگردانی کی وجہ سے جو برائیاں معاشرے میں پیدا ہو رہی ہیں، ان کے تدارک اور دفعیہ کے لیے بھی مختلف احکام وفرامین کا ذکر کر دیا گیا۔

تین بنیادی مسائل:

سورت فرقان میں اسلام کے تین بنیادی مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ تمام مکی سورتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں عام طور پر عقائد کی درستی ہی پر زور دیا گیا ہے اور ایمان کو پختہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی طرح سورت فرقان میں بھی: ① توحید۔ ② رسالت۔ ③ معاد کو مختلف پیرائیوں میں بیان کیا گیا ہے اور کفار ومشرکین کی طرف سے جو اعتراضات اور شبہات ظاہر کیے گئے، ان کے جوابات دیے گئے ہیں۔

مشرکین کے شبہات اور سوالات:

مشرکینِ مکہ عام طور پر جو سوالات کرتے تھے، وہ حسبِ ذیل ہیں:

ایک اکیلا خدا اس قدر بڑے جہاں کا نظام کس طرح چلا سکتا ہے؟ یہ عجیب وغریب بات ہے جو عقل نہیں مانتی ہے:

﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ ﴾ [صٓ: ٥]

”کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک کر دیا؟ بے شک یہ تو یقیناً ایک بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔“

اسی طرح نبوت کے متعلق ان کے شبہے کا بھی یہی عالم تھا۔ وہ کہتے تھے کہ خدا کو کیا غرض تھی کہ اس نے ایک بندے پر اپنی کتاب نازل کر دی اور اگر کتاب اتارنی ہی تھی تو کسی بہت بڑی ہستی اور شخصیت پر نازل کی جاتی:

﴿ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴾ [قٓ: ٢]

”بلکہ انھوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آیا، پھر کافروں نے کہا: یہ تو عجیب بات ہے۔“

یہ نبوت کسی فرشتے کو ملنی چاہیے تھی، یعنی نبی انسانوں سے الگ کسی جنس میں سے ہونا چاہیے تھا۔ اس قسم کے اعتراضات مشرکین عام طور پر کیا کرتے تھے۔ ان اعتراضات کا جواب کس خوبی سے ان آیات میں دیا گیا ہے اور ان کے ان شبہات کا ازالہ کس پر لطف پیرائے میں کیا گیا ہے، یہ امر اس آیت سے ظاہر ہے:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝ ﴾

﴿ تَبٰرَكَ ﴾: برکت سے مراد اضافہ اور بڑھاوا ہے۔ ایسا اضافہ جس میں استقلال اور بقا ہو، مقدار بھی زیادہ ہو اور اس میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا جائے۔ کثرت سے زیادتی اور ثبات بھی ہو۔

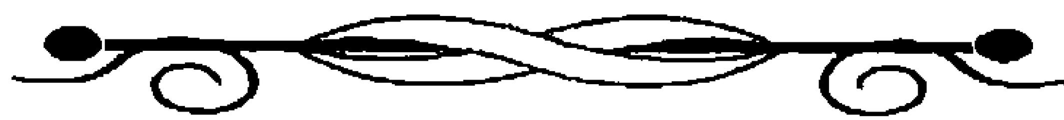
وہ ذات جس نے قرآن مجید اتارا ہے، بڑی بابرکت ہے، نیکیوں اور حسنات کا بڑھنا بھی برکت ہے۔ ”اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ...“ یہ دعا نماز میں

مانگی جاتی ہے۔ جس سے مقصد یہ ہے کہ اے خدا! جو اچھائیاں اور خوبیاں رسول اللہ ﷺ لے کر آئے وہ بڑھا دے۔

عبدیتِ کاملہ:

﴿ اَلَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ ﴾: فرقان اس بندے پر نازل کیا۔ بندے کا نام نہیں لیا گیا۔ ساری دنیا میں یہ بندۂ کامل صرف ایک ہی تھا اور وہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ہم میں سے عبدیتِ کاملہ کا مقام کسی کو بھی نہیں ملا۔ ساری کائنات میں سے کوئی بندہ کامل نہیں ہے۔ بندگی کا دعویٰ کرنے والے بہت ہیں، لیکن اصلی بندہ صرف وہی ہے جس کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے ﴿ عَبْدِہٖ ﴾ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

بعض لوگ عبد کے لفظ سے بدکتے ہیں اور اس کو کسرِ شان خیال کرتے ہیں، ایسا خیال بے علمی کی وجہ سے ہے۔ عبدیت کا مقام بہت بلند ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ساری عمر اللہ تعالیٰ کی عبدیت میں گزاری۔ خدا تعالیٰ کی غلامی اس طرح کی کہ غلامی کا حق ادا ہو گیا۔ ایسی غلامی کہ ساری عمر اس میں کوئی نقص نہ آیا۔ آپ نے کبھی کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جو خدا کی غلامی کے منافی ہو اور اس کی عبدیت سے متصادم ہو۔ آپ نے اپنے مالک کے ہر قانون، ہر ضابطے، ہر حکم اور ہر اشارہ وکنایہ تک کو پورے فرماں بردار بندوں کی طرح قبول کیا۔ دل و جان سے قبول ہی نہ کیا، بلکہ اپنا طرزِ عمل بھی اسی طرح استوار کر لیا۔ بندگی کا یہی مطلب ہے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (3 نومبر 1967ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"تَبَارَكَ" کے معانی

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ ﴾ [الفرقان:۱]

وہ ذات بڑی ہی با برکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا، تا کہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا بنے۔"

واسطہ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ کس کام کے لیے پیدا کیا اور وہ کام اس کو کس طرح کرنا چاہیے؟ اس دنیا میں انسان زندگی کس طرح بسر کرے؟ خدا کے احکام کیا ہیں؟ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے؟

خالق نے اپنی مخلوق، انسانوں کو ان سب سوالوں کے جواب دینے کے لیے انبیاء کو بھیجا اور انبیاء کی معرفت بتایا گیا کہ دنیا میں وہ کس طرح رہیں؟ کیا کام کریں اور کون سے کام ہیں جن سے بچیں؟

انسانوں اور خدا تعالیٰ کے درمیان اس علم کا ذریعہ "انبیاء" ہیں۔ کوئی خدا تعالیٰ سے براہِ راست احکام نہیں لے سکتا۔ ہر آدمی پر وحی نہیں آتی۔ "انبیاء" خدا اور انسان کے درمیان واسطہ ہیں۔

برکت:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ ... ﴾: برکت کا معنی "کثرت" اور "اضافہ" ہے۔ بعض دفعہ ایک چیز وافر مقدار میں ہوتی ہے، لیکن اس میں اضافہ نہیں ہوتا اور کچھ مدت گزرنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے۔ برکت کا مطلب یہ ہے کہ مقدار بھی زیادہ ہو اور اس میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا رہے اور ذخیرہ جمع ہوتا رہے۔ "مبارک ہو!" اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ "کثرت بھی ہو اور زیادہ بھی ہو۔" پانی سے بھرے ہوئے حوض کو "اَلْبِرْكَةُ" کہتے ہیں۔

بابرکت ذات:

﴿ تَبٰرَكَ ﴾ کا لفظ صرف خدا تعالیٰ کے لیے ہے اور کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا معنی یہ ہے

کہ تمام کمالات اور صفات ہمیشہ صرف ذاتِ حق کے لیے ہیں۔ الوہیت کی صفات صرف اسی کے لیے ہیں۔ یہ صفات بابرکت ہیں، یعنی کثرت سے ہیں اور ہمیشہ رہنے والی ہیں۔

انسانی زوال:

انسان میں بھی برکت ہے۔ انسانی زندگی کا کمال جوانی ہے، لیکن یہ کمال مائل بہ زوال ہے۔ جوانی آتی ہے، ڈھلتی ہے اور بعض دفعہ تو اچانک اور یک دم ختم ہو جاتی ہے۔ انسانوں کا یہی حال ہے، کیا گناہ گار اور کیا پاکباز اور اہل اللہ؛ سب کا معاملہ یکساں ہی ہے۔ بہت اچھے اور بہتر انسان تھے، بڑا کمال حاصل تھا، لیکن زوال آ کر رہا، سب کے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے۔ قبریں اس امر پر شاہد ہیں اور بزرگوں کے مزارات بھی گواہ ہیں۔

صاحبِ مزار اور دوسرے نیک لوگ، جو خدا کے پاس پہنچ چکے ہیں، ان کے مزاروں اور قبروں پر جایئے اور ضرور جایئے۔ کچھ لینے کے لیے نہیں، بلکہ دینے کے لیے جایئے۔ جا کر ان کے لیے دعا کیجیے۔ ان کے لیے خدا سے ترقیِ درجات مانگیے اور خدا سے ان کی غلطیوں کے لیے معافی کی درخواست کیجیے۔ ان سے لینا کیا ہے؟

رسول اللہ ﷺ کی آخری بیماری میں جب تکلیف بڑھ گئی، آپ ﷺ بار بار دعا پڑھتے اور پانی سے ہاتھ بھگو کر چہرے پر پھیرتے۔[1] جب کمزوری بڑھ گئی اور آپ ﷺ میں ہاتھ اٹھانے کی سکت نہ رہی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گیلا ہاتھ چہرے پر پھیرتی جاتی تھیں اور رسول اللہ ﷺ دعا مانگتے جاتے تھے کہ ''اے اللہ میں اوپر کی رفاقت چاہتا ہوں۔''[2]

خدا کے آخری نبی، تمام نبیوں کے سردار، اپنی تمام فضیلتوں کے باوجود کس حالت میں تھے؟ ایسا کیوں ہوا؟ یہ اس لیے کہ ﴿ تَبَارَكَ ﴾ نہیں تھا۔ یہ تو صرف خدا کے لیے ہے۔ نبی، ولی، مجدد، عالم، صالح، مومن، متقی سب ہیں، لیکن کمال و دوام صفاتِ حق ہیں، اس کے سوا دوام کسی کو نہیں ہے۔ ساری صفات میں خدا کے برابر کوئی نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کچھ صفات سے نوازا، لیکن جب چاہا واپس لے لیں۔ صفات آتی اور جاتی ہیں، دولت کم ہوتی ہے، ہمت اور صحت کم ہوتی ہے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٧٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤٩)

علم کی برکت:

علم جس قدر خرچ کیا جائے، وسعت اور برکت پیدا ہوتی ہے۔ ایک عالم نے ہزار ہا آدمیوں کو پڑھایا، لیکن آخری عمر کے ایک حصے میں حافظے کمزور اور خراب ہو گئے۔ صحیح بخاری اور ترمذی کے نسخوں میں فرق ہے۔ وجہ اس کی یہ بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ آخری عمر میں تدریس کے لیے آئے تو اس وقت حافظہ کمزور ہو چکا تھا،[1] اس لیے یہ فرق واقع ہوا۔ اسی طرح بعض راویوں کا بھی یہی حال ہے۔

ذہول اور نسیان انسانی تقاضا:

انسانی صفات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کمال حاصل تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ تھا، لیکن بھول اور ذہول میں جو انسان کا خاصہ ہے، میں مبتلا ہوتے رہے۔

گھر کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ سورج کو گرہن لگ گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی سے اٹھے اور کرتے کے بجائے ایک چادر لے کر باہر آ گئے، بعد میں اس بھول کا علم ہوا۔[2] خدا تعالیٰ پر ایسا موقع کبھی نہیں آتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جماعت کے لیے مصلے پر آ کر کھڑے ہو گئے، لیکن جلدی ہی واپس چلے گئے اور غسل کر کے آئے اور نماز پڑھائی۔[3]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور چار رکعات کے بجائے دو رکعات پڑھا کر سلام پھیر دی۔ ایک صحابی کے توجہ دلانے پر نماز پوری کرائی۔[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے، قراءت کے دوران میں ایک آیت چھوٹ گئی۔ قاری

---

[1] بعض ائمہ کا حافظہ واقعی آخری عمر میں کمزور ہو گیا تھا، مگر امام بخاری اور امام ترمذی رحمہما اللہ کا آخری عمر میں حافظہ کمزور ہونا ثابت نہیں۔ علاوہ ازیں، ایک لکھی ہوئی کتاب کے نسخوں میں فرق کا تعلق حافظے سے کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی وجہ مصنف کا بعد میں حاصل ہونے والی معلومات کی بنا پر کوئی بیشی کرنا ہو سکتی ہے یا پھر ناقلین سے بعض اوقات کچھ الفاظ کا نقل میں رہ جانا۔ (عبدالسلام)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧٣)

اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ٹوکا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لقمے کے مطابق درست کیا۔[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق میں نہ بھولنے والا کوئی نہیں ہے۔صرف خدا تعالیٰ اس سے مبرا ہے۔

انبیاء اور نسیان:

حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کے لیے روانہ ہوئے، آپ کے ساتھ ایک اور نبی، یوشع بن نُون علیہ السلام بھی تھے۔ کہا: ﴿ لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴾ [الکهف: ٦٢] "ہم نے اپنے سفر سے تو بڑی تھکاوٹ پائی ہے۔" تھک گئے، وجہ کیا تھی؟ ﴿ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ ﴾ "بے شک میں مچھلی بھول گیا۔" بھول گئے، ایسا کیوں ہوا؟ انسان تھے، خدا نہ تھے، ﴿ تَبَارَكَ ﴾ نہ تھا۔ یہ صرف خدا کے لیے ہے۔

طاقت اور جوانی، ضعف اور بڑھاپا، یہ دونوں مرحلے بزرگوں اور اولیائے کرام پر بھی آتے ہیں: ﴿ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّشَيْبَةً ﴾ [الروم: ٥٤] "پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا (بنا دیا)۔" نیکی اور بزرگی اس کے راستے میں حائل نہیں ہوسکتی۔ سب کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے اور اس کے خلاف اگر بتایا جائے تو وہ ولی نہیں ہے، وہ تو خدا ہے۔ ایسے موقعے پر بے ادبی اور گستاخی کا طعنہ قطعاً غلط ہے۔ جہاں ایمان اور ایسے خودساختہ ادب کا ٹکراؤ ہو تو یہ "ادب" نہیں، یہ تو عین "بے ادبی" ہے۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کی ممانعت:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی تھی کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکریم و ادب کے لیے سجدہ کرنا چاہتے ہیں، آپ اجازت دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا ادب ایمان کو رخصت کر دے گا۔ جو جس کا مقام ہے، اسی کے مطابق ہی معاملہ ہونا چاہیے۔[2]

[1] مسعود بن یزید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قراءت کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی آیت چھوڑ دی، ایک آدمی نے آپ سے کہا: آپ نے فلاں فلاں آیت چھوڑ دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو تم نے مجھے وہ یاد کیوں نہ دلائی؟"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی تو قراءت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو التباس ہوگیا۔ جب فارغ ہوئے تو اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟" انھوں نے عرض کی: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو تمھیں (بتانے سے) کس چیز نے روکا؟" (أبو داود: باب الفتح علی الإمام ص: 131)

[2] مسند أحمد (٢٤٤٧١) اس کی سند میں علی بن زید بن جدعان ضعیف ہے۔

مراتبِ انبیاء کا فرق:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۳] "یہ رسول، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔" تمام رسول برابر نہیں ہیں۔ بعض کے درجات بعض سے زیادہ ہیں، کوئی فضیلت میں کم کوئی زیادہ۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس کے باوجود آپ ﷺ خدا نہیں، اس کے بندے ہی ہیں۔ فرمایا: ﴿ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ ﴾ "فرقان اپنے بندے پر اتارا۔"

عبد ہونا خامی نہیں:

کوئی خطاب استعمال نہیں کیا۔ صرف ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا ہے۔ "عبد" ہونا کوئی خامی یا نقص نہیں ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: "وہ مرد ہے، مرد!" خدا کے عبد ہونے کی صفت اصل میں ایسی ہے۔ ﴿ عَبْدِهٖ ﴾ "خدا کا پورا فرماں بردار۔" آپ ﷺ نے عبدیت اور غلامی میں کوئی کمی نہیں کی۔

﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴾ [مریم: ۹۳]

"آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں وہ سب رحمان کے پاس غلام بن کر آئیں گے۔"

قیامت کے دن سب لوگ "عبد" بن کر آئیں گے، لیکن یہ عبد پورے پورے نہیں ہیں، ان میں کمی اور کمزوری ہے، لیکن محمد مصطفیٰ ﷺ نے کوئی کمی نہیں کی۔ یہ سب سے بڑا "شرف" ہے۔ ولی، نبی خدا کی غلامی کریں، تبھی ولی، نبی ہیں، ورنہ کچھ بھی نہیں ہیں۔

دن اور رات میں ہر نماز میں ہم شہادت دیتے ہیں: "أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ" "محمد ﷺ خدا کے بندے اور رسول ہیں۔" اللہ تعالیٰ ہم سے بار بار اقرار کرا رہا ہے، اس کے بعد بھی بعض حلقے اس لفظ سے گھبراہٹ محسوس کریں تو تعجب ہے! اللہ تعالیٰ شہادت دے رہے ہیں تو گھبراہٹ کا کیا معنی ہے؟ اس کو پھر کسرِ شان کیوں سمجھا جائے؟[1]



[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (12 جنوری 1968ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقامِ رسول ﷺ اور فرقان کا معنی

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ ﴾ [الفرقان: ۱]

''وہ ذات بڑی ہی با برکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا، تا کہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا بنے۔''

ابتدائی آیات میں توحید اور اس کی وضاحت ہے۔ شرک اور اس کی مذمت، نبوت اور اس کا تذکرہ اور اہلِ ایمان اور ان کے اخلاق کا ذکر ہے۔

اس سے پہلے ''عبد'' کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی ہے۔ کچھ لوگ لفظِ ﴿ عَبْدِهٖ ﴾ کو نقص اور عزت میں فرق کا باعث سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ خیال جہالت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عام انبیاء اور رسول ﷺ کے لیے ''عبد'' کے لفظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔

عبدیت کا رتبہ:

﴿ عَبْدِهٖ ﴾ کا لفظ اللہ تعالیٰ نے تعارف کے طور پر استعمال کیا ہے۔ خدا سے زیادہ انبیاء کی شان کون جانتا ہے، جس نے ان کو رسول بنا کر بھیجا۔ کوئی بھی اس قدر نہیں سمجھتا۔ وہ تو ہمہ دان ہے اور مقامِ رسول ﷺ کو خوب جانتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ بے ادبی کرتا ہے؟ ''عبد'' کا استعمال بے ادبی ہے اور نہ اللہ تعالیٰ ایسا کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی عزت زمین سے آسمان تک اور فرش سے عرش تک ہر جگہ ہے۔ کوئی مخلوق آپ کی عزت سے غافل نہیں۔ مسلمانوں کے لیے نعمتِ ایمان ملنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بے ادبی ممکن نہیں ہے۔ ایسا الزام لگانے والوں کی سمجھ میں فرق ہے، یہ لوگ نہ تو ''عبد'' کے معنی جانتے ہیں اور نہ عزت وتکریم ہی کا مطلب سمجھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ مقامِ عبدیت پر فائز ہیں، خدا کے فرماں بردار بندے ہیں۔ خدا کے انقیاد کا

حلقہ اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے، نافرن نہیں ہیں اور یہ شہادت خدا دے رہا ہے۔ بے ادب تو وہ ہیں جو آپ کی عبدیت اور بشریت کا انکار کر رہے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا خطاب پسند نہیں ہے۔ وہ اپنی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو اور خطاب دینا چاہتے ہیں اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم ناقص ہے۔ (نعوذ باللّٰہ من ذلک)

نزولِ قرآن کا انداز:

﴿ نَزَّلَ ﴾: تھوڑا تھوڑا، وقتاً فوقتاً، حسبِ ضرورت اترنا۔ قرآن مجید پہلی آسمانی کتب کی طرح نازل نہیں ہوا۔ پہلی کتابیں مکمل شکل میں انبیاء کو دی گئی تھیں۔ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پوری دی گئی تھی، اس کے برعکس قرآن مجید موقع محل کے مطابق تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔

قرآن مجید کی 114 سورتیں 23 سال کے عرصے میں مکمل ہوئیں۔ بعض سورتیں بیک وقت نازل ہوئیں اور بعض دفعہ 4,3 سورتیں ایک ساتھ نازل ہوتی رہیں۔ نبی کریم ﷺ ہر نزول کے موقعے پر بتاتے رہے کہ یہ آیات کس سورت کی ہیں اور اس کی ترتیب کیا ہے، پھر ہر سورت کے مکمل ہونے پر بھی بتاتے رہے کہ کون سی سورت کس سورت کے آگے یا پیچھے تحریر کی جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو حفظ بھی کرتے رہے اور احاطۂ تحریر میں بھی لاتے رہے۔

رسول اللہ ﷺ کی رحلت سے پہلے قرآن مجید مکمل اور مرتب موجود تھا۔ یہ خیال کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے بعد اس کو ترتیب دیا ہے، درست نہیں ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اسے مرتب کرا دیا تھا۔ حفظ کی ترتیب بھی آپ ﷺ کے زمانے میں ہوئی۔ بیسیوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآنِ مجید زبانی یاد تھا، جن اصحابِ رسول ﷺ کو بعض حصے یاد تھے، ان کی تعداد تو سیکڑوں تک ہے۔

حکمتِ نزول:

قرآن مجید تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا، اس کی وجہ خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے: ﴿ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ ﴾ [الفرقان: ٣٢] آپ کا دل ثابت رہے۔ آپ کی بے چینی رفع ہو اور اس امر کا اندازہ بعض واقعات سے بخوبی ہوتا ہے۔

حضرت خولہ بنت مالک بن ثعلبہ رضی اللہ عنہا کا اپنے شوہر حضرت اوس رضی اللہ عنہ سے جھگڑا ہو گیا۔ بدمزگی

بڑھ کر ''ظہار'' کی شکل اختیار کر گئی اور حضرت اوس رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو ماں کہہ دیا۔ اس وقت عرب میں طلاق کا یہ بھی ایک طریقہ تھا۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور معاملہ پیش کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے بعد اب تم کیسے مل سکتے ہو؟'' حضرت خولہ رضی اللہ عنہا شکوہ کرتی رہیں کہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں، کسی دوسرے گھر اب میری وہ عزت نہیں ہو سکتی اور یہ گھر بھی تباہ ہو جائے گا، اولاد الگ پریشان و خوار ہوگی۔ خود رسول اللہ ﷺ کو اس امر پر بے چینی تھی، اس وقت یہ آیات اتریں:[1] ﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا ... ﴾ [المجادلة: ١] اس طرح سے ﴿ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ ﴾ ہوا۔

نزولِ وحی باعثِ تسکین:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بھی تہمت لگا دی گئی اور اس کا اس قدر چرچا ہوا کہ مسلمان اور خود رسول اللہ ﷺ پریشان ہو گئے۔ اس موقع پر سورت نور کی آیاتِ براءت نازل ہوئیں۔[2]

اس طرح بروقت وحی کا نزول آپ کے لیے تسکین کا باعث بنتا تھا۔ اگر نزولِ وحی بروقت نہ ہوتا تو پریشانی ہوتی تھی، جیسا کہ اصحابِ کہف کے متعلق سوال پر آپ کو پریشانی ہوئی اور اٹھارہ روز تک وحی بند رہی۔ ﴿ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَاْيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿23﴾ ﴾ اس پریشانی کو وحی کے نزول سے رفع کیا گیا اور قرآن کا نزول آپ ﷺ کے دل کو ثابت رکھنے کے لیے ہوا۔

نزول سے مراد یہ بھی ہے کہ وحی مسلمانوں کی ہدایت کے لیے آتی تھی، یہ حق اور باطل کو واضح کر کے بتا دیتی تھی اور مسلمانوں کو پتا چل جاتا تھا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ ﴿ نَزَّلَ ﴾ کے بعد لفظِ ﴿ الْفُرْقَانَ ﴾ استعمال کر کے اس بات کی مزید وضاحت کر دی۔

فرقان کا مطلب:

﴿ الْفُرْقَانَ ﴾ کا مطلب یہ ہے: ''اَلْفَارِقُ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ'' ''حق اور باطل کو الگ الگ کرنے والا۔'' یعنی جھوٹ اور سچ کو ظاہر کرنے والا۔

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٦٥) المستدرك للحاكم (٣٧٩١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧٠)

قرآن مجید ایک کسوٹی ہے، جو حق اور باطل کو ظاہر کرتی ہے۔ قرآن مجید کی یہ صفت آج بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تو اور بھی زیادہ تھی۔

جماعتِ صحابہ کی حرمت و تقدس:

جماعتِ رسول ﷺ نے زندگی کے تمام لحات میں سچائی کا ساتھ دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت حق پرست تھی۔

گناہ سے بالکل پاک ہونا تو انبیاء کا خاصہ ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے انسانی حدِ امکان تک زندگی بسر کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جھگڑے بھی ہوئے ہیں، ان مشاجرات میں بعض سے بعض کے معاملے میں زیادتی بھی ہوئی ہے، لیکن یہ عمداً اور جان بوجھ کر نہیں ہوا۔ ایک طبقہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق بدگمانی کا اظہار کرتا ہے، بعض اہلِ بیت کے عیوب گنواتے ہیں۔ درحقیقت دونوں سے غلطیاں تو ہوئی ہیں، لیکن یہ جان بوجھ کر نہیں، اجتہاداً ہوئی ہیں۔ اس وجہ سے ساری جماعت میں کسی کو بھی منافق یا بددیانت نہیں کہا جا سکتا۔ ہم غلطی کو غلطی سمجھتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی خوبی سے بھی انکار نہیں کرتے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخابِ خلافت:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جن سنگین حالات میں خلافت سنبھالی اور اڑھائی سال تک جس طرح اسلام کو جان کاہ خطرات سے نکال کر استحکام کے راستے پر ڈال دیا، اپنی خلافت کے زمانے میں انھوں نے جو کارنامے سرانجام دیے، وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ٹھیک ٹھیک انتخاب کیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جذبات کے غلبے میں یہ کام نہیں کیا تھا اور نہ یہ انتخاب کسی اندھی عقیدت کا مظہر تھا۔ یہ قدرت کا انتخاب تھا اور اس کے لیے اس کے رسول ﷺ کا واضح اشارہ موجود تھا۔

رسول اللہ ﷺ جب آخری بیماری کی وجہ سے بے حد کمزور ہو گئے اور بار بار غشی کے حملے ہو رہے تھے، اس وقت لوگ نماز کے لیے مسجد میں جمع تھے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا نماز پڑھی جا چکی ہے؟ جواب میں بتایا گیا: نہیں، آپ کا انتظار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ابو بکر سے کہو کہ نماز پڑھائے۔[1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا موقف:

یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میرے بعد یہ تم لوگوں کے انتظام کا ذمے دار ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اس کا مطلب میں نے نہ سمجھا، میرے دل میں دو خیال پیدا ہوئے:

1. لوگ میرے باپ کو منحوس خیال کریں گے کہ رسول اللہ ﷺ کی جگہ کھڑے ہو رہے ہیں۔[1]
2. آپ بڑے رقیق القلب ہیں، جب آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دیں تو نماز کے اندر ہی آپ کی ہچکی بندھ جائے گی، اس لیے جماعت مکمل کرانا مشکل ہو گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی: آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جماعت کرانے کے لیے حکم کریں، میرے والد نرم دل ہیں، ان کے لیے نماز پوری کرنا مشکل ہو گی۔ اس بات کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ کی ازواج میں سے ایک اور بیوی سے بھی کرا دی۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا: "میرا رب ابو بکر کے سوا سب سے انکار کرتا ہے۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دوبارہ یہی بات عرض کی اور رسول اللہ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پھر کہا اور دوسری بیوی سے بھی کہلوایا، اس پر آپ ﷺ نے پھر فرمایا: "میرا رب ابو بکر کے سوا سب سے انکار کرتا ہے۔"[2]

خلافتِ صدیقی کا اعلان:

یہ اصرار آپ ﷺ کے بعد خلافت کے اس فیصلے کا اعلان تھا، جو اللہ تعالیٰ نے طے کر دیا تھا۔ سفر اور جنگ کے دوسرے مواقع پر نبی کریم ﷺ کی غیر موجودگی میں دوسرے صحابہ نماز پڑھایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ عموماً اس کام کے لیے حافظ و قاری صحابہ کو مقرر کیا کرتے تھے، لیکن اس موقعے پر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے اصرار ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ کا دوسرا مقام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد جو واقعات ہوئے اور ان میں جو طرزِ عمل ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا، اس نے بھی اس انتخاب پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٨)

بہترین فیصلہ:

زکات کی بندش اور اس کے متعلق اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ خیال کہ مانعینِ زکات سے جنگ نہیں کرنی چاہیے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لشکر کی یمن روانگی کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے مخالفت اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اپنے فیصلے پر جم جانا، دونوں معاملے اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اسلام کی کس قدر خیر خواہی تھی اور اسلام کے لیے ان کے دل میں کیا جذبہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان دونوں معاملوں میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مخالف تھے، لیکن ان کے فیصلے کے بعد آپ نے پورا ساتھ دیا، جب نتائج سامنے آئے تو آپ نے اعتراف کیا: "قَدْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَ أَبِي بَكْرٍ لِلْقِتَالِ" "اللہ تعالیٰ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کا سینہ قتال کے لیے کھول دیا ہے۔"[1]

اسلامی شورائیت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکات کے معاملے میں طاقت کے استعمال کی سخت مخالفت کی تھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے حق میں تھے۔ جب شوریٰ ختم ہوگئی اور صحابہ رضی اللہ عنہم چلے گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلح ہو کر گھوڑے پر سوار ہو کر نکل پڑے۔ راستے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملے، انھوں نے پوچھا: کہاں کا قصد ہے؟ آپ نے جواب دیا: آپ لوگوں نے مانعینِ زکات سے جنگ کی مخالفت کی ہے، اس لیے میں تنِ تنہا ہی ان سے لڑنے کے لیے جا رہا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لگام تھام لی اور کہا: ہم آپ کا ساتھ دیں گے، وہ بات ہماری رائے اور مشورہ تھا اور اب آپ کے فیصلے کی مخالفت نہیں کریں گے۔

یہ ہے اسلام کی جمہوریت اور شورائیت۔ رائے کے موقعے پر پوری دیانت داری سے رائے دینا اور امیر کے فیصلے کے بعد اس کی پوری پوری مدد کرنا۔ لشکر روانہ ہوا، دو تین قبائل نے مقابلہ کیا اور باقی تمام نے ازخود زکات کی ترسیل شروع کر دی، اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ اسلام کے لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو شرحِ صدر حاصل ہے۔ اس طرف باری تعالیٰ نے اشارہ فرمایا: ﴿ الْفُرْقَانَ ﴾ کہ اس قرآن کو پڑھ کر حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کی تمیز حاصل ہوتی ہے۔[2]



---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٠)

[2] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور (19 جنوری 1968ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آسمانوں اور زمینوں کا بادشاہ

﴿ اَلَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ﴿۲﴾ ﴾ [الفرقان: ۲]

''وہی ذات جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اور اس نے اپنے لیے کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے، اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ٹھیک اندازہ کیا۔''

سورت فرقان کی پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس کو نازل کرنے والا کون ہے اور جس پر نازل ہوئی ہے، وہ کون ہے۔ نازل کرنے والا: ﴿ تَبٰرَکَ ﴾ اور جس پر نازل ہوئی وہ'' ﴿ عَبۡدِہٖ ﴾'' اس کا فرمانبردار بندہ ہے۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا تعارف:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنا تعارف کرایا ہے۔ اس ایک آیت میں توحید کی پوری تعلیم دی گئی ہے۔ توحید جیسے بڑے وسیع مضمون کو چند الفاظ میں ادا کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کسی بچے کی زبان کھل جاتی تو اس کو یہ آیت یاد کراتے تھے۔ یہ آیت ایک پوری کتابِ توحید ہے۔ اس میں پانچ امور کا ذکر کیا گیا ہے۔ خدا وہ ہے جس کے لیے:

1. آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔
2. جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا۔
3. جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے۔
4. جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔
5. اور ہر ایک کا الگ الگ اندازہ رکھا۔

ذاتِ الٰہی کا ادراک ناممکن ہے:

ذاتِ الٰہی کا علم انسان کو براہِ راست نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا آپ ﷺ نے خدا کو دیکھا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ تو ایک روشنی ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔''[1]

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ﴾ [الأنعام: ۱۰۳] وہ تو سب کو دیکھتا ہے، لیکن کوئی آنکھ اس کو نہیں دیکھ سکتی۔ ہمیں جب کوئی چیز نظر نہیں آتی تو اس کا علم حاصل کرنے کے لیے اس کی خصوصیت معلوم کرتے ہیں۔ دلائل اور آثار و شواہد سے اس کے متعلق ایک رائے قائم کرتے ہیں۔ ماں کے رحم میں بچے کی پرورش ہوتی رہتی ہے، چند ماہ کے بعد اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ بچے میں روح آ گئی ہے۔ جان پڑ گئی ہے۔ بچے سے جوان، جوان سے بوڑھا ہوتا ہے۔ اس عرصے میں دیکھنا، سننا، بولنا، محسوس کرنا اور حرکت کرنا سب ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہم یہ کہتے ہیں کہ اس میں روح ہے۔

اب کوئی آدمی یہ مطالبہ کرے کہ اسے روح دکھائی جائے، ورنہ وہ روح کو تسلیم نہیں کرتا تو یہ مطالبہ غلط ہوگا۔ یہی بچہ ایک لمبی عمر گزار کر فوت ہو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی روح نکل گئی ہے۔ اس موقعے پر وہ معترض پھر اعتراض کرے کہ میں اس کو تسلیم نہیں کرتا، روح پرواز نہیں کر گئی، وہ تو ابھی اس کے اندر ہی موجود ہے، مجھے نکلتی ہوئی دکھائی جائے۔

اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ روح کے ہونے یا نہ ہونے کا علم صرف عوارض کے مظاہر ہی پر منحصر ہے۔ ہم اَن دیکھی چیزوں کو دلائل اور شواہد ہی سے جانتے ہیں، انھیں ٹٹول نہیں سکتے۔

ساری کائنات کا بادشاہ:

خدا تعالیٰ اس دنیا کا خالق، رازق اور مالک ہے۔ قرآن کو نازل کرنے والا ہے۔ اب اگر ذاتِ حق نظر نہیں آتی تو کیا وہ ہے ہی نہیں؟ ایسا نہیں ہے۔ وہ ہے اور یہ دنیا جہان آسمان و زمین سب اسی کی ملکیت ہے۔ ان سب پر بادشاہت اسی کی ہے: ﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الفرقان: ۲] ''جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔''

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۱)

﴿ لَهٗ ﴾ میں اوروں کی ملکیت کی نفی ہے اور خدا کے لیے ہی اثباتِ ملکیت ہے۔ یہ معنی ﴿ لَهٗ ﴾ سے واضح اور ثابت ہوتا ہے۔

بعض دفعہ آپ ایک چیز کے مالک تو ہوتے ہیں، لیکن متصرف نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک مکان آپ کے پاس بطورِ رہن ہے یا آپ بطور کرایہ دار ہیں تو ایک طرح سے آپ مالک ہیں، لیکن آپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اس میں اپنی مرضی سے کچھ بنا یا بگاڑ دیں۔ لیکن خدا ایسا مالک نہیں ہے، وہ متصرف بھی ہے۔ وہ ﴿ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾ بھی ہے۔ بعض دفعہ ایک مالک ایک مکان فروخت کر دیتا ہے تو اس طرح سے اس کی ملکیت عارضی ثابت ہوتی ہے اور اس کی جگہ ایک دوسرا آدمی مالک بن جاتا ہے۔

انسانی ملکیت عارضی ہے:

آپ کے سامنے 1947ء کے واقعات ہیں۔ کس طرح مکانوں اور زمینوں کے مالکوں کی ملکیت بغیر کسی معاوضے کے ختم ہوگئی۔ رات کو مالک تھے، صبح ہوتے ہی جائیداد کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا اور اب اس میں داخل ہونے تک کے مجاز نہیں ہیں۔ انسانوں کی یہ ملکیتیں جزوی اور وقتی ہیں۔ خدا ایسا مالک نہیں ہے، اس کی ملک جزوی اور وقتی نہیں ہے، وہ ہر چیز کا مستقل مالک ہے۔ وہ اپنی بادشاہی میں پوری طرح متصرف بھی ہے، جب چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے، نکال باہر کرتا ہے، قبضہ اور کسی کو دے دیتا ہے۔

جب چاہا فرعون جیسے بادشاہ کو جو اپنے آپ کو ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿٢٤﴾ ﴾ [النازعات: ٢٤] کہتا تھا، نکال باہر کیا۔ ﴿ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿٢٥﴾ ﴾ [الدخان: ٢٥] ان کو ان کے محلات، باغوں اور حکومت سے بے دخل کر کے سمندر میں غرق کر دیا۔ ساری دنیا کے لیے سامانِ عبرت بنا دیا: ﴿ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ﴾ [یونس: ٩٢]

وہ قوم جو کمزور و ناتواں تھی اور جس کو وہ ﴿ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴾ [الشعراء: ٥٤] کہتا تھا، خدا تعالیٰ نے اس قوم کو اس ملک کا وارث بنا دیا: ﴿ وَ اَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [المؤمن: ٥٣]

ملکیت کا فرق:

یہ ہے فرق عارضی اور مستقل مالک کا۔ ہماری یہ ملک عارضی ہے، ہم پوری طرح متصرف بھی

نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا نہیں ہے۔ اس نے زمین کے ٹکڑے کے ٹکڑے اٹھا کر زمین میں غرق کر دیے۔ بعض جگہ تصرف کا ظہور اس طرح ہوا کہ سمندر کو ختم کر دیا اور وہاں پانی کی جگہ زمین کا ٹکڑا نکل آیا۔

اس دنیا کی بادشاہی بھی اس کے ہاتھ میں ہے، جس کو جب چاہتا ہے دے دیتا ہے اور جس سے جب چاہتا ہے لے لیتا ہے: ﴿ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ ... ﴾ اندلس میں مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی۔ اس شان سے حکومت کی کہ اس ملک کی زبان تک عربی ہوگئی۔ لباس بدل گیا۔ معاشرت اور معیشت؛ غرض یہ کہ ہر چیز بدل گئی۔ آج کیا صورتِ حال ہے؟ وہ ملک اندلس سے سپین ہوگیا اور حالات ایسے ہوئے کہ وہاں مسلمان ناپید ہیں۔ ﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یہ ہے اس کا تصرف!

خدا کی ملکیت اور تصرف میں کوئی شریک نہیں:

بعض لوگوں کا خیال کہ بعض معاملات میں بزرگ اور اولیائے کرام کو تصرف کا اختیار ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بعض کاموں میں دخل دے سکتے ہیں، یا بعض فیصلوں میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں بہت سارے قصے اور کہانیاں بیان کی جاتی ہیں کہ فلاں بزرگ نے یہ کیا اور فلاں حضرت صاحب نے یہ کیا تھا۔ یہ تمام من گھڑت اور جھوٹے قصے ہیں۔ یہ بے بنیاد چیزیں ہیں، جو نقل اور عقل کسی اعتبار سے بھی ٹھیک نہیں۔

سارے انبیاء و اولیاء بے اختیار ہیں:

انبیاء کا مقام کس قدر بلند ہے اور ان کا درجہ کس قدر اعلیٰ ہے، لیکن کوئی بھی خدا کے فیصلے کو بدل نہیں سکتا۔ انبیاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام بہت بلند ہے۔ اس قدر بلند کہ ان کے متعلق ﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝١٠٨ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝١٠٩ ﴾ [الصافات: ۱۰۸، ۱۰۹] فرمایا ہے، لیکن زندگی میں حالت کیا ہوئی تین جگہ ہجرت کی، سارا عرب کا علاقہ چھان مارا۔ انقلابات کے ہاتھوں مصائب اٹھائے۔ کیوں؟ تصرف و اختیار خدا کے ہاتھوں میں تھا، ان کو اختیار نہ تھا کہ خدا کے فیصلے میں رکاوٹ بن جائیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کو تنبیہ:

حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال خدا کے دین کی خدمت پوری سرگرمی سے کرتے رہے۔ خواہش کے باوجود بیٹے کو غرق ہونے سے بچا نہ سکے۔ دعا بھی کی، لیکن قبول نہ ہوئی۔ حکم ہوا: ﴿ وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴾ [المؤمنون: ٢٧] اس کے باوجود آپ نے بارگاہِ ایزدی میں ﴿ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ ﴾ [هود: ٤٥] کے الفاظ میں اپنے بیٹے کے لیے معافی کی درخواست کی تو جواب میں: ﴿ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٤٦﴾ ﴾ [هود: ٤٦] ایسی تنبیہ آ گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ ملک، تصرف اور اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ﴿ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ ﴾ کا مفہوم یہی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مرتبہ اولیائے کرام سے بہت بلند ہے، اس قدر بلند کہ لاکھوں اولیائے کرام مل کر بھی ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ لیکن خدا کے فیصلے کے سامنے ان کو بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری بیماری میں ہیں۔ بے حد نقاہت ہے۔ اس قدر کمزوری کہ ہاتھ اٹھا کر چہرے تک نہیں لے جا سکتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پانی کے تر ہاتھ چہرے پر پھیر رہی ہیں۔ بولنے کی قوت بھی ختم ہے۔ آپ کے بجائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا معوذتین پڑھ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ﴿ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾ ﴾ [الأعراف: ٣٤] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود ہیں۔ آپ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بے حد شاق ہے، لیکن ملک السماوات والارض کے سامنے دم مارنے کی بھی کسی کو جرأت نہیں ہے، چہ جائیکہ اس کے کسی فیصلے میں رکاوٹ بن جائیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کس قدر شاق گزری، اس کا اندازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل سے بہ خوبی ہوتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور اعلان کر دیا کہ جو کوئی یہ لفظ زبان سے نکالے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں، میں اس کا سرتن سے جدا کر دوں گا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے، رُخِ مبارک پر سے کپڑا ہٹایا، پیشانی کا بوسہ لیا اور بلند آواز سے فرمایا:

''مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّداً فَإِنَّ مُحَمَّداً قَدْ مَاتَ، وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ'' ①

''جو آدمی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا وہ دیکھ لے کہ محمد ﷺ فوت ہو گئے ہیں اور جو خدا کی عبادت کرتا ہے تو خدا زندہ ہے، مرے گا نہیں۔''

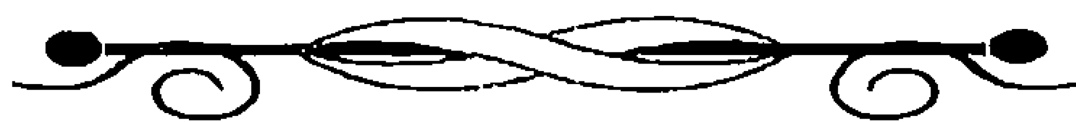
انبیاء کے تصرف و اختیار میں کیا کچھ ہے اس واقعے سے پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں:

﴿ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ﴾ [الفرقان: ٢] خدا تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں۔ ﴿ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴾ [الإخلاص: ٣] نہ اس کی اولاد نہ اس کے والدین۔

خدا تعالیٰ کو اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔ اولاد وارث ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ اول و آخر ہے، اس کی وراثت نہیں ہے۔ ''حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ'' وہ زندہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اولاد اس لیے ہوتی ہے کہ نسل جاری رہے۔ خدا تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ ﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ﴾ صاحبِ اولاد ہونا انسان کے لیے خوبی اور نہ ہونا ایک خامی و نقص ہے۔ بے اولاد اس کے لیے حسرت کرتے ہیں، لیکن خدا تعالیٰ کے لیے اولاد عیب اور نقص ہے۔

ایک حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابن آدم مجھے گالی دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ خدا کی اولاد ہے۔ ② یہاں یہ صراحت کر دی ہے کہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ ﴿ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ﴾ [الفرقان: ٢] ③



① صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤١)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢١)

③ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (26 جنوری 1968ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وحدہٗ لاشریک لہ

﴿ اَلَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ۝۲ ﴾[الفرقان: ۲]

وہی ذات جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اور اس نے اپنے لیے کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے، اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا۔‘‘

حقیقی ملکیت:

زمین و آسمان کی ملکیت خدا کی ہے۔ ہماری ملکیتیں بالکل عارضی ہیں۔ بادشاہوں تک کا حال یہ ہے کہ رات کو جب سوئے تو ہر چیز پر قبضہ اور حکومت تھی، صبح ہوئی تو ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ اپنے ملک سے بھاگ کر جان بچانا پڑی۔

انسانی ملک اور غلبہ و اقتدار اس قدر ناپائیدار اور عارضی ہے کہ مکڑی کا جالا اپنے اندر اس سے زیادہ قوت رکھتا ہے۔ یہ معاملہ تو انسانی طاقت و اقتدار کا ہے، تاریخ بتاتی ہے اور ہم اس دور میں بھی اس امر کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ملکوں نے ملکوں پر اور قوموں نے قوموں پر قبضے کیے اور حالات بظاہر ایسے نظر آتے تھے کہ اب اس ملک کا ٹوٹنا ممکن ہی نہیں ہے، لیکن ان قوموں اور ملکوں میں کمزوری اور اضمحلال پیدا ہوا اور مقبوضہ علاقوں سے ان کو دستبردار ہونا پڑا۔ انقلابات آئے اور غاصبانہ حکومتیں اور اقتدار خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

دنیا کا سب کچھ عارضی ہے، صرف اللہ تعالیٰ کا اقتدار ہی لازوال ہے۔ اسی کو کہا ہے: ﴿ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴾ خدا کے حکم سے کروڑوں ملکیتیں قائم اور ختم ہوئیں۔

خدا کی اولاد نہیں:

﴿ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ﴾ ”اس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا۔“

یہ ایک منفی تعلیم ہے، خدا کو اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔ انسانوں کے لیے اولاد ضروری ہے۔ ہم اس کے لیے بڑی خواہش کرتے ہیں، اس کے اسباب بھی ہیں۔ اولاد نہ ہو تو افسوس اور حسرت ہوتی ہے، زندگی میں ایک کمی اور خامی محسوس کرتے ہیں، مرنے کے بعد میرا وارث کون ہوگا؟ میری نسل ہی وارث ہوگی، ایسا نہ ہو تو تحیر اور پریشانی ہوتی ہے۔

ذاتِ حق اپنے لیے خود فرماتے ہیں: ﴿ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ﴾ یعنی خدا تعالیٰ کا نسلی اور نسبی تعلق کسی سے نہیں ہے، اس کا کوئی حقیقی بیٹا ہے نہ اس نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی بیوی ہے نہ بیٹی۔ اللہ تعالیٰ کا تعلق کسی خاندان سے نہیں ہے: ﴿ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴾ [الإخلاص: ۳] ”نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔“

عیسائیوں کی گمراہی:

یہود و نصاریٰ، دو قوموں نے اس مسئلے کو خوب اچھالا۔ عیسائیوں نے اس مسئلے کو ایک گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ کسی زمانے میں بھی اس مسئلے میں واضح عقیدہ نہیں رہا۔ عیسائیوں نے کبھی تو یہ کہا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ﴾ [المائدة: ۱۷] ”بے شک اللہ تعالیٰ مسیح ہی تو ہے جو مریم کا بیٹا ہے۔“ کبھی کہا کہ ”خدا تین ہیں“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ﴾ ”مت کہو کہ (اللہ) تین ہیں۔“ نیز کبھی کہا: ﴿ الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ۳۰] ”مسیح خدا کا بیٹا ہے۔“

معانی کی تبدیلی:

ایک وقت تھا کہ عیسائی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک حقیقی بیٹا، عیسیٰ ہے اور ایک حقیقی بیوی مریم ہے۔ اسلام کی تعلیمات کے اثر سے عیسائیوں کو خود اس عقیدے میں خامی نظر آنے لگی اور وہ اس پر شرم محسوس کرنے لگے۔ اس عقیدے کو بدلنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے ان الفاظ کے معانی بدل دیے گئے۔ بیٹے اور بیوی کے وجود سے انکار کر دیا گیا۔ کہا گیا کہ یہ دنیا کے سلسلے کے مطابق نہیں ہے۔ مسیح علیہ السلام کی عادات خدا جیسی ہیں، خدا کی صفات اس میں موجود ہیں، بلحاظِ اوصاف اس کو ”بیٹا“ کہتے ہیں۔

اسلام کا اثر:

یہ سب اسلام کے اثر سے ہوا۔ ریگستان کے بدوؤں کے اثر کا نتیجہ ہے، ایک اُمی نبی کی تعلیمات کا اثر غالب ہوا، دلائل کی پختگی سے معاملہ صاف ہوگیا۔ پروگرام بدلے گئے، الفاظ کو نئے معانی پہنا دیے گئے: ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبّٰٓؤُهٗ ﴾ [المائدۃ: ١٨] ''ہم سب خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔'' یعنی ہم میں خدا کی صفات ہیں اور خدا ہمیں پسند کرتا ہے!

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا کا کسی معنوں میں بھی کوئی بیٹا نہیں ہے۔ دنیا میں ہمارا ایک دوسرے کے لیے ایسا کہنا ''گردن زنی'' ہے، خدا کے لیے یہ الفاظ کسی طرح بھی استعمال نہیں کیے جا سکتے۔

مسلمانوں میں نصرانی عقائد کی اشاعت:

یہ لفظ مسلمانوں نے استعمال کرنا بالکل بند کر دیا، لیکن یہود و نصاریٰ کا یہ ذہن خاص طریقوں سے امتِ مسلمہ کی طرف منتقل ہوا۔ مسلمانوں نے بھی یہی بات کہنا شروع کر دی، جس سے سختی سے روکا گیا تھا: ''رسول اللہ ﷺ وہ ہی ہیں، کوئی فرق نہیں۔'' اس کے معنی بھی وہی ہیں۔ یقیناً اس میں ''باپ'' اور ''بیٹا'' کے الفاظ تو نہیں استعمال کیے گئے، لیکن مطلب وہی ہے: ''نور سے نور جدا ہوا ہے۔'' یہ الفاظ درست نہیں ہیں۔ دل اور ضمیر اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، لیکن اگر کوئی ان معنوں میں ان الفاظ کو استعمال کرتا ہے تو یقیناً اس کا مقام یہود و نصاریٰ سے مختلف نہیں ہے۔ ﴿ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴾ [القمر: ٤٣] ''کیا تمھارے کفار ان لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا تمھارے لیے (پہلی) کتابوں میں کوئی چھٹکارے کی تحریر ہے؟''

کسی کو خدا کا جزو قرار دینا شرک ہے:

کسی کو بھی خدا کا جزو قرار دینا ویسا ہی ہے۔ الوہیت اور خدائی کی صفات سے کسی کو بھی متصف سمجھنا ''شرک'' ہے۔ اللہ تعالیٰ ﴿ اَلصَّمَدُ ﴾ ''ٹھوس اور بے نیاز ہے۔'' اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی جدا نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَلصَّمَدُ ﴾ کے لفظ میں کوئی ابہام نہیں چھوڑا: ﴿ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴾ کے بعد سورت اخلاص میں فرمایا: ﴿ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴾ ''وہ کسی کا والد ہے نہ مولود۔''

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد ﷺ تک، تمام انبیاء میں ساری خوبیاں اور عظمتیں ہیں،

لیکن کوئی بھی خدا کا جزو نہیں ہے۔ کسی کا بھی خدا سے کوئی نسلی تعلق نہیں ہے۔

"مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ" "محمد ﷺ اس (اللہ) کے بندے اور رسول ہیں۔" آپ ﷺ اس دربار کے خادم ہیں۔ آپ کا کام، اس کا پیغام پہنچانا ہے اور عملی زندگی میں اس کی ہدایت پر چلنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ﴿ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ﴾ کہہ کر تمام چور دروازے بند کر دیے ہیں۔ انسان ذاتِ حق کے وجود کی خود ایک دلیل ہے: ﴿ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [الذاریات: ۲۱] "اور خود تمھاری ذات میں بھی (کئی نشانیاں ہیں) تو کیا تم نہیں دیکھتے؟" اس سے یہی مراد ہے۔

وحدت الوجود کا گمراہ عقیدہ:

"وحدت الوجود" کا نظریہ بھی چور دروازہ ہے۔ "خالق" خالق ہی ہے اور "مخلوق" مخلوق۔ مخلوق، خالق نہیں ہو سکتی۔

"اوتار" کا عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔ ہمارے "صوفیہ" نے اس سے متاثر ہو کر "حلول" کا عقیدہ نکالا کہ خدا مخلوق کے جامے میں سما جاتا ہے اور مخلوق کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ غلط ہے، عقلی طور پر بھی اور نقلی طور پر بھی۔ خدا کسی مخلوق میں نہیں سما سکتا، کسی جسم میں نہیں آ سکتا، کوئی ظرف ایسا نہیں ہے۔ ایسا کہنا کہ یہ ساری مسجد ایک لوٹے میں آ گئی ہے، یہ بالکل عقل سے بعید بات ہے۔ وہ خدا کیسا، جو مخلوق میں سما جائے؟!

﴿ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ﴾ میں اس کی بھی نفی ہے۔ اس معاملے میں ائمۂ سنت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کا بیٹا ہے نہ بیوی۔

مخلوق سے جدا:

وہ مخلوق سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ "بَائِنٌ عَنْ خَلْقِہٖ" "وہ پوری دنیا اور مخلوق سے جدا ہے۔"

وہ کسی جگہ بیٹھا ہوا بھی نہیں ہے۔ "بیت اللہ" خدا کا گھر اس لیے نہیں بولا جاتا کہ خدا وہاں مقیم ہے، بلکہ یہ اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ اس گھر پر خدا کی برکات نازل ہوئی ہیں۔ یہ سمجھنا کفر ہے کہ خدا وہاں رہتا ہے۔ بیتِ اول حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوبارہ تعمیر کی، جو طوفانِ نوح میں بہہ گئی تھی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ بنا اور تباہ ہوا۔ اسماعیلی گروہ

اپنے حملے میں حجرِ اسود لوٹ کر لے گئے تھے، جو کئی سالوں بعد ملا تھا۔ خدا تعالیٰ کسی جگہ بیٹھا ہوا نہیں ہے، عرش پر بھی ایسا ماننا غلط ہے۔[1]

خدا کا کوئی حصے دار نہیں:

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ﴾ اس سے پہلے ﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کی تفسیر میں مِلک کی پوری وضاحت ہو چکی ہے، ہر طرح کی بادشاہی اور اقتدار اسی کا ہے، وہ پوری کائنات کا متصرف ہے۔ یہاں اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس معاملے میں اس کا کوئی حصے دار بھی نہیں۔

دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی ایک چیز کا مالک ہے، لیکن وہ کسی کو اس میں حصے دار بنا لیتا اور ''اشتراک'' کر لیتا ہے۔ یہ اشتراک عارضی نوعیت کا ہوتا ہے اور بعض دفعہ مستقل بھی ہوتا ہے۔ جزوی اشتراک بھی ہوتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا کا کوئی حصے دار نہیں ہے، نہ عارضی، نہ مستقل، نہ جزوی اور نہ وقتی ہی۔ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں کسی کی حصے داری نہیں ہے۔[2]



[1] اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی جگہ کھڑا ہے یا بیٹھا ہے، واقعی غلط ہے۔ البتہ یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ [طٰہٰ: ۵] رہی یہ بات کہ وہ عرش پر کس طرح کھڑا ہے یا بیٹھا ہے؟ یہ بات ہمیں معلوم نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر ہونا معلوم ہے، وہ عرش پر کس طرح ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں اور یہ پوچھنا کہ کس طرح ہے؟ بدعت ہے۔ (عبدالسلام)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (2 فروری 1968ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال اور خود ساختہ معبودوں کی خامیاں

﴿وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخۡلُقُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّهُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ وَلَا يَمۡلِكُوۡنَ لِاَنۡفُسِهِمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا وَّلَا يَمۡلِكُوۡنَ مَوۡتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوۡرًا ۝۳﴾ [الفرقان: ۳]

”اور لوگوں نے اس کے سوا (اَور) معبود بنا لیے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے، اور وہ تو (خود) پیدا کیے گئے ہیں، اور وہ خود اپنے کسی نفع اور نقصان کے مالک نہیں ہیں، اور نہ موت وحیات کے مالک ہیں، اور نہ دوبارہ (جی) اٹھنے ہی کے (مالک ہیں)۔“

اس سے پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا وہ ہے جو زمین وآسمان کا مالک ہے۔ اس کی نہ تو اولاد ہے نہ والدین۔ اس کا کوئی شریک بھی نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور اس نے اسے ایک خاص اندازے سے بنایا ہے۔

جعلی معبودوں کی بے بسی:

یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بعض لوگوں نے اس حقیقی خدا کو چھوڑ کر کچھ جعلی الٰہ (معبود) بنا لیے ہیں، جن کی حالت یہ ہے کہ ﴿لَا يَخۡلُقُوۡنَ شَيۡـًٔا﴾ ان میں پیدا کرنے کی طاقت ہی نہیں ہے، یعنی کسی چیز کی تخلیق ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿لَنۡ يَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ﴾ [الحج: ۷۳] یہ بناوٹی خدا دنیا کی حقیر ترین مخلوق (مکھی) تک بنانے پر قادر نہیں ہیں، پھر یہی بات نہیں کہ وہ کچھ بنا نہیں سکتے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کا وجود کسی اور کا بنایا ہوا ہے اور ان کا خالق خود خدا ہے۔ ﴿وَهُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ﴾: وہ پیدا کردہ ہیں، پیدا کرنے والے نہیں ہیں۔

﴿وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخۡلُقُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّهُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ﴾ کے الفاظ عام ہیں،

ان سے ہر قسم کے خود ساختہ معبود مراد ہیں۔ ''اس کے سوا اور معبود بنا لیے۔'' ان الفاظ میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اس میں انسانوں کے بنائے ہوئے بت اور زندہ مخلوق، سب شامل ہیں۔ ﴿لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا﴾ ''یہ کچھ نہیں بنا سکتے۔'' نفی کا مفہوم ہے۔ اس کے الٹ مثبت یہ ہے کہ اللہ وہ ہے جو خالق ہو، جیسا کہ سورت بقرہ میں فرمایا ہے:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ﴾ [البقرة:٢١]

''اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا۔''

بے عیب مخلوق:

اس سے پہلے جو آیت گزر چکی ہے، اس میں بھی فرمایا ہے: ﴿خَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ﴾ [الفرقان: ٢] ہر چیز کا خالق وہ ہے، پھر وہ محض خالق ہی نہیں ہے، بلکہ ﴿فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا﴾ [الفرقان: ٢] ہر چیز کو ایک خاص انداز عطا کیا ہے۔ خدا کا اندازہ، جس کے مطابق اس نے اپنی مخلوق بنائی ہے، بے مثل ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے خواص اور اس دنیا میں اس کا کام، جسم، شکل اور اس چیز کے متعلق تمام امور کو طے کر دیا ہے۔ اسی چیز کو فرمایا ہے: ﴿فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا﴾.

ہم انسان بھی چیزیں بناتے ہیں۔ انسان کی بنی ہوئی چیزیں عیب دار اور نقائص سے پر ہوتی ہیں۔ یہ مسجد بنائی گئی ہے اور بنانے والے نے اس میں اپنی طرف سے کوئی خامی نہیں چھوڑی، لیکن دوسرے کاریگر آتے ہیں اور بے شمار نقائص گنواتے ہیں۔ خدا ایسا خالق نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ بنایا ہے، وہ بہترین ہے اور بے عیب ہے:

﴿مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ﴾ [الملك: ٣، ٤]

''تو رحمان کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں دیکھے گا، پھر نگاہ ڈال، کیا تو کوئی دراڑ دیکھتا ہے؟ پھر بار بار نگاہ دوڑا، (تیری) نگاہ ذلیل و خوار ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی جبکہ وہ تھکی ماندی ہو گی۔''

خالقِ حقیقی کون؟

پورا شہر انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔ اس کے باوجود کیا ہے: ﴿خَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ﴾ انسانوں نے جو

کچھ بنایا ہے، وہ ''خلق'' نہیں ہے، بلکہ خدا کا عطیہ ہے۔ صنعت و حرفت ہے۔ کوئی انسان دوسرے انسان کی مدد کے بغیر کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس لیے وہ ''خالق'' نہ ہوا، جب کہ خدا نے ہر چیز کسی دوسرے کی مدد کے بغیر بنائی ہے۔ فقیر کو ایک روٹی دے کر آپ رزاق نہیں بن جاتے۔ خام مال اور اوزار کے بغیر کاریگر کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ خدا ایسا صناع نہیں ہے۔ کاریگروں پر بڑھاپا اور کمزوری آتی ہے، اس وقت تخلیق کے سامان موجود ہوتے ہوئے بھی وہ اس حالت میں نہیں ہوتا کہ کچھ بنا سکے۔ انسانوں کی یہ صفات وقتی، عارضی اور جزوی ہیں۔ خدا تعالیٰ کے ﴿ خٰلِقُ كُلِّ شَیْءٍ ﴾ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب، جیسے اور جسے چاہے پیدا کر دے۔ یہ خود ساختہ الٰہ کچھ بھی نہیں بنا سکتے، بلکہ یہ بنائے گئے ہیں۔

یہ نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں:

﴿ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴾: پھر یہی نہیں کہ یہ جعلی خدا کچھ بنا ہی نہیں سکتے، بلکہ کسی اور کو فائدہ اور نقصان پہنچانا تو رہا الگ، خود اپنے آپ کو بھی کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اپنی ذات کے لیے بھی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں۔

اپنی ذات کے لیے نفع کا اختیار تو ایک خوبی ہے۔ نقصان کا مالک ہونا کون سی خوبی ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بزرگ، جنھیں لوگوں نے معبود و مسجود بنایا ہوا ہے، اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کوئی ضرر آ جائے تو اس کو ہٹا سکیں۔ مصیبت، بیماری، بھوک، خوف و ہراس، نقصان اور دوسری تکالیف سے بھی بچ نہیں سکتے۔ اب جو خود اپنی ذات کے لیے بھی اتنے اختیار کا مالک نہیں ہے، اس کے سامنے لوگوں کا دستِ سوال دراز کرنا، کس قدر کم عقلی ہے؟

حضرت مسیح علیہ السلام کی ساری زندگی مصیبت میں گزر گئی، کسی جگہ بھی آپ کو چین نصیب نہ ہوا۔ اسی طرح دوسرے انبیا کا معاملہ ہے۔ ﴿ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوتے ہیں، فرعون کی طرف سے خطرہ ہے۔ خدا نے ایک تدبیر ان کی ماں کو سمجھائی اور موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر ہی میں پرورش پا کر جوان ہوتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی گری ہوئی حالت کو بہتر بنانے کا ارادہ کرتے ہیں کہ قتل کے منصوبے کا علم ہو جاتا ہے۔ مدین کی طرف راہِ فرار

اختیار کرتے ہیں۔ مدین سے واپسی، فرعون کا غرق ہونا، وادیِ سینا کے واقعات اور قوم کا سلوک؛ سب واقعات پر غور کرنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انبیاء تک کو اپنی ذات کے لیے کسی نقصان و تکلیف کو رفع کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔

یہ زندگی اور موت کے بھی مالک نہیں:

﴿ وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَاحَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴾: موت، زندگی اور موت کے بعد دوبارہ اٹھانا، یہ سب خدا کی صفات ہیں۔ انسانوں کے یہ خود ساختہ معبودان کاموں میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتے۔ یہ نہ تو کسی کو مار سکتے ہیں اور نہ زندہ کر سکتے ہیں اور نہ کسی مردے کو اٹھا کر لا سکتے ہیں۔

اس معاملے میں تو انبیاء تک بے بس ہیں۔ رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ایک فرزند عطا کیا۔ والدین کو اپنے بچوں سے جس قدر محبت ہوتی ہے، رسولِ کریم ﷺ کو اس سے بھی زیادہ محبت تھی۔ بچہ آپ کے ہاتھوں پر ہے اور اس پر نزع کا عالم طاری ہے، سخت تکلیف میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور زبان خاموش ہے: ﴿ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴾ آپ ﷺ کو موت و حیات پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ جب بچہ فوت ہو جاتا ہے تو آپ ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

« إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ، وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ، وَلَا نَقُوْلُ إِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا، وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ »[1]

"بے شک آنکھیں بہہ رہی ہیں، دل کو غم ہے اور ہم خدا کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ اے ابراہیم! تیری جدائی سے ہم غمناک ہیں۔"

حقیقی اور جعلی معبود کا فرق:

اس سے پہلے جو آیت گزر چکی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات بیان کی ہیں: ﴿ اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٣)

1 خدا وہ ہے جو زمین و آسمانوں کا مالک ہے۔

2 جس کی کوئی اولاد نہیں۔

3 جس کا کوئی شریک نہیں۔

4 جو خالق ہے۔

اس آیت میں لوگوں کے خود ساختہ معبودوں کے متعلق بتایا ہے کہ ان میں یہ خامیاں اور نقص ہیں۔ یہ نقائص بھی چار ہیں: ﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝﴾:

(1) وہ جعلی معبود خالق نہیں، بلکہ مخلوق ہیں۔

(2) اپنی ذات کے نفع ونقصان کے مالک نہیں ہیں۔

(3) وہ زندگی اور موت پر قادر نہیں ہیں۔

(4) مردے کو پھر اٹھانا، ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہ چاروں صفات خدا کی ہیں۔ اس لیے ان جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر سچے خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (9 فروری 1968ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقامِ رسول ﷺ

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝﴾ [الفرقان: ٤،٥]

”اور کافر لوگوں نے کہا: یہ (قرآن) تو نرا جھوٹ ہے جسے وہ (نبی) خود گھڑ لایا ہے، اور اس (کے گھڑنے) میں اور لوگوں نے اس کی مدد کی ہے۔ چنانچہ (اے نبی!) وہ ظلم و زیادتی اور جھوٹ پر اتر آئے ہیں۔ اور انھوں نے کہا: یہ اگلوں کے افسانے ہیں (جو) اس نے اپنے لیے لکھوائے ہیں، اور وہ صبح و شام اس پر پڑھے جاتے ہیں۔“

ربطِ آیات:

سورت فرقان کی اس آیت سے قبل کی آیت میں خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات کا ذکر ہے۔ منفی اور مثبت، دونوں انداز سے ایسا بیان ہو چکا ہے، تاکہ معبودِ حقیقی کی پہچان میں کوئی مشکل باقی نہ رہے۔ لوگوں کے خود ساختہ معبودوں کی خامیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ توحید کے اس مضمون کے بعد مندرجہ بالا آیت سے نبوت کا ذکر شروع کیا ہے اور رسول کا مقام کیا ہے؟ اس کے متعلق منکرین نے جن شبہات کا اظہار کیا تھا، ان کے جوابات بھی دیے ہیں۔

قرآن پر ایمان کے لیے حضرت محمد ﷺ کی صداقت پر ایمان:

ہم ہر چیز پر مختلف طریقوں سے غور کرتے ہیں۔ ایک انسان کو دیکھ کر اس کے رنگ، چہرے اور تناسبِ اعضاء کو جانچتے ہیں۔ اس کے متعلق خوب صورت اور بدصورت ہونے کی ایک رائے قائم کرتے ہیں۔ کاروباری طور پر کسی کے متعلق غور کرتے ہوئے اس کے غلط یا صحیح ہونے کی رائے جب

قائم کرنے لگتے ہیں تو اس میں اس وضع اور رنگ کو کوئی وزن نہیں دیتے، بلکہ اس کے حالات کی برائی یا اچھائی اور امانت و دیانت کو سامنے رکھتے ہیں۔

قرآن کی تصدیق و تکذیب کے متعلق بھی یہی صورت ہے کہ اگر کوئی آدمی رسول اللہ ﷺ کو رسولِ برحق اور سچا نبی تسلیم کرے گا تو ہی وہ قرآن کو ایک سچی کتاب مان سکتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کو جب تک پیغمبر نہ مانا جائے، اس وقت تک قرآن مجید کو خدا کا کلام ماننا ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی اُس ہستی کے متعلق ہی شک میں مبتلا ہو، جس کے ذریعے سے قرآن ہم تک پہنچتا ہے تو وہ قرآن کی تصدیق کیسے کرسکتا ہے؟ ایک پیغام لانے والے کے متعلق جب یہ یقین ہو جائے کہ وہ جھوٹا ہے تو اس کے لائے ہوئے پیغام کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔

مسیلمہ، جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اس کو ہم جھوٹا مانتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کی کتاب کو بھی مسترد کرتے ہیں۔

نبوت دین کے معاملے میں اولین چیز ہے۔ دین کے تمام امور کا دار و مدار اسی پر ہے۔ قرآن مجید محفوظ ہے اور بالکل اسی حالت میں ہے، جس میں نازل ہوا تھا۔ حروف و آیات سب محفوظ ہیں، پھر بھی غیر مسلم قومیں قرآن پر غور کیوں نہیں کرتیں؟ وجہ صرف یہی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو نبیِ برحق تسلیم نہیں کرتے۔

منکرینِ سنت کی کم عقلی:

منکرینِ سنت کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ یہ لوگ سنت کی مخالفت کرتے ہیں اور سنت کو حجت نہیں مانتے۔ غور کا مقام یہ ہے کہ قرآن، صاحبِ سنت کے واسطے سے آیا ہے، لیکن یہ صاحبِ سنت کو وہ مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہیں!

ان لوگوں سے مکہ کے مشرک کہیں زیادہ عقل و دانش والے تھے۔ ان لوگوں نے محمد رسول اللہ ﷺ پر بحثِ معین کی، اصل بحث تو رسول ہی تھا اور ہے۔ رسول کی تصدیق ہوگی تو ہی اس رسول پر آنے والی وحی کی تصدیق ہو سکے گی۔ ہمارا حال کس قدر گیا گزرا ہے کہ ہم اسلام میں بھی شامل اور رسول پر بھی بحث جاری ہے!!

جس چیز کو ہم سمجھ لیتے ہیں، مان لیتے ہیں اور جو سمجھ نہیں سکتے، اس کا کسی تامل کے بغیر انکار کر دیتے ہیں۔ واقعات کا انکار کرنے کے بجائے ان کے غلط یا ٹھیک ہونے پر بحث ہونی چاہیے۔ بعض احادیث سے ڈر کر انکار نہیں کر دینا چاہیے۔ بعض شبہات سے گھبرا کر بھی انکارِ حدیث کرنا درست نہیں ہے۔ غیر مسلموں کے سوالات کا جواب دینا چاہیے اور انکار کرنا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔

مشرکینِ مکہ کی کم عقلی:

مشرکینِ مکہ کی بحث کا انداز ملاحظہ ہو، رسول جھوٹا ہے، وحی بھی غلط ہے اور جھوٹ ہے۔ کچھ لوگ ایک سازش سے یہ سب کچھ کر رہے ہیں: ﴿ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛ ﴾ [الفرقان: ٤]

انھوں نے بطورِ بحث رسول اللہ ﷺ کی ذات کو آگے رکھا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ آج کا مسلم بھی ان کفار کی طرح رسول پر اعتراض تو نہیں کرتا، لیکن حدیث اور سنت کا انکار کرتا ہے، وہ لوگ محمد ﷺ کے منکر تھے اور انھوں نے جنگ بھی لڑی۔

﴿ اِفْكُ ﴾ کے معنی ہیں: جھوٹ اور بنائی ہوئی بات۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ دوسرے لوگوں کی مدد سے تم یہ وحی تصنیف کرتے ہو، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ ان پڑھ ہیں، اکیلے یہ کام نہیں کر سکتے، خدا تعالیٰ نے کہا ہے: ﴿ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۝4 ﴾ یہ بات بڑے ظلم اور جھوٹ کی ہے۔

مخالفین کی بے بسی:

یہاں ان الزامات کے جواب میں صرف یہی الفاظ استعمال کیے ہیں اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا مفصل جواب بھی دیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ [النحل: ١٠٣]

یعنی اس سازش کے الزام کی نسبت، جن کی طرف تم کرتے ہو، وہ تو عجمی ہیں اور قرآنِ مجید عربیِ مبین میں ہے۔ ایک غیر ملکی فرد اہلِ زبان کے مقابلے میں کیسے کامیاب ہوسکتا ہے؟ مادری زبان والے کو سمجھانا، ایک عجمی کے بس کی بات نہیں ہے۔

دوسرے جن لوگوں کے متعلق یہ الزام لگایا جاتا تھا، یعنی عواس، یسار اور جبر یا تو فوت ہو گئے یا نقل مکانی کر گئے، لیکن ان کے باوجود وحی کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر یہ ﴿ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ﴾ تھا تو ان کی غیر موجودگی میں یہ سلسلہ بند ہو جانا چاہیے تھا، جبکہ ایسا نہیں ہوا، جو اس کی صداقت پر شاہد ہے۔

اگر یہ جھوٹ اور من گھڑت کلام ہے، یا بعض کی اعانت سے بنا لیا گیا ہے تو تم کیا ایسا نہیں بنا سکتے؟ تم تو اہلِ زبان ہو۔ یہ دعویٰ کہ ایسا کلام بنا کر پیش کیا جائے، آج تک قائم ہے۔ ان جوابات میں سے کسی چیز کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ صرف یہ کہہ دیا گیا ہے: ﴿ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۝ ﴾ یعنی تم لوگ کیسی بے انصافی اور جھوٹی بات کرتے ہو؟!

قرآن کی تصدیق کے لیے حدیث پر ایمان:

دینِ اسلام میں پہلا مرحلہ نبی کی صداقت ہے اور دوسرا مرحلہ (کتاب اللہ کی سچائی) بعد میں آئے گا۔ اگر آپ ﷺ صادق ہیں تو وحی درست ہے اور جس طرح قرآن درست ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ زندگی کے باقی گوشوں مین بھی سچے ہیں۔ ایک جھوٹی حدیث کو آڑ بنا کر سب احادیث کو مسترد کر دینا غلط ہے۔

رسولِ کریم ﷺ نے ساری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ منکرینِ حدیث کے خیال کے مطابق تو اس معاملے میں رسولِ کریم ﷺ پر یہ الزام آتا ہے۔ چودہ سو سال میں کسی نے یہ الزام نہیں لگایا، یا اب یہ شبہہ کیوں کر پیدا ہوا ہے؟ یہ صرف مقامِ نبوت کو ٹھیک طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے!

مشکلات کی وجہ سے احادیث کا انکار نہیں، بلکہ ان کا حل ہونا چاہیے۔ غور کیجیے! ملک کے اندر ایک قانونی حکومت ہے، عدالتیں ہیں، اس کے باوجود بعض غلط فیصلے بھی ہو رہے ہیں تو کیا عدالتوں کو ختم کر دینا چاہیے؟

پولیس ہے اور مقدمات بنائے جاتے ہیں۔ پولیس کی طرف سے بعض مقدمات غلط بھی ہوتے ہیں، کیا اس وجہ سے اس نظام کو ختم کر دینا چاہیے؟ بے شمار جھوٹے گواہ موجود ہیں، کیا اس بنا پر نظامِ شہادت کو خیر باد کہہ دینا چاہیے؟ یقیناً ایسا نہیں ہوگا اور نہ کوئی عقل والا ایسا مطالبہ کرے گا تو کیا

چند احادیث کی وجہ سے تمام ذخیرۂ احادیث کو ختم کر دینا چاہیے؟ محدثینِ کرام نے جھوٹوں کا پول اچھی طرح کھول دیا ہے اور صحیح احادیث کو چھان پھٹک کر الگ کر دیا ہوا ہے۔

﴿ وَقَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴾ ''اور انھوں نے کہا: یہ اگلوں کے افسانے ہیں۔'' یہ بات بالکل وہی ہے، البتہ تنوع اور انداز مختلف ہے۔

قرآنِ مجید میں دو قسم کے ارشادات ہیں:

1. ٹھوس حقائق کا ذکر: احکام، حدود اور فرائض کا تذکرہ۔
2. واقعات کا ذکر: انبیاء کے قصے، مختلف انداز اور مختلف نتائج کے لحاظ سے حالات کا ذکر۔ یہ صرف کہانیاں اور قصے نہیں ہیں، بلکہ ان میں دلائل اور شواہد ہیں۔ بظاہر یہ الزام درست ہے کہ یہ ﴿ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴾ ''اگلوں کے افسانے'' ہیں، لیکن یہ بات صرف سطحی نظر رکھنے والا ہی کہہ سکتا ہے۔ قصے ضرور ہیں، لیکن ان میں استشہاد ہے۔

قرآن کا مقابلہ کرنے کے لیے رستم اور اسفند یار کے قصے لائے گئے تھے اور بڑے اہتمام سے سنائے جاتے تھے، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے مکان کے احاطے کے اندر قرآن پڑھتے تھے اور عورتیں، بچے والہانہ طور پر سننے کے لیے دوڑتے تھے۔[1] یہ ذوق و شوق کہانیوں کے لیے نہ تھا، بلکہ صداقت کے لیے تھا۔

اس سارے معاملے میں بحث کی روح ذاتِ رسول ﷺ، سنت اور مقامِ نبوت ہے۔ ہر معاملے میں ذاتِ رسول ﷺ کو اور اس کی سنت کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اہلِ بدعت اور اہلِ سنت میں یہی فرق ہے کہ وہ اس معاملے میں ذاتی خیال کو ترجیح دیتے ہیں، جب کہ اہلِ سنت کا موقف یہ ہے کہ اصول کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔[2]



[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۲۹۹)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (16 فروری 1968ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غیب دان کون؟

﴿قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾
[الفرقان: ٦]

''کہہ دیجیے: اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے، بلاشبہہ وہ غفور (اور) رحیم ہے۔''

معجزانہ کلام:

رسولِ کریم ﷺ کی ذات اور شخصیت مخالفین کے لیے ایک مشکل معمہ بن گئی تھی۔ جب آپ ﷺ کی عادات، اخلاق اور رہن سہن کو دیکھتے تو مجبور ہو جاتے کہ آپ ﷺ کو سچا کہیں، دوسری طرف ان کی اپنی عادات، آباء واجداد کی رسمیں حائل ہوتی تھیں اور ذہن میں انکار آتا تھا، تشویش ہوتی تھی۔ انھوں نے جرأت کی اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی۔ قرآن کو جھوٹ کہا، کہہ دیا کہ بعض لوگوں کی سازش (عجمی سازش) سے قرآن بن رہا ہے، لیکن اپنے طرزِ عمل سے خود ہی تردید کرتے جاتے تھے۔

اس دلیل کو اور اس الزام کو قوی نہیں سمجھتے تھے، ان کا ذہن اس کا اِبا (انکار) کرتا تھا، اس لیے انھوں نے پھر یہ کہا: ﴿ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٥] ''یہ پہلوں کی تحریر کردہ کہانیاں ہیں۔'' کلامِ الٰہی نہیں ہے، یہ ان کی ذہنی مشکل اور دماغی تشویش تھی۔ قرآن نے ان کے الزامات کا بڑا مختصر، لیکن جامع جواب دیا ہے: ﴿ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ ... ﴾ قرآن کا جواب اپنے اندر ایک اعجاز رکھتا ہے۔ عبارت، الفاظ اور اندازِ بیان ایسا ہے کہ اس کی مثال اور نظیر پیدا کرنا انسانوں کے بس میں نہیں ہے۔ ارشادِ باری ہے: ''اس کلام کو اس ذات نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے اسرار سے آگاہ ہے۔''

اگر یہ کلام تمھارے الزام کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا ہے، انھوں نے کسی دوسرے کی مدد سے بنا لیا ہے تو ایسی صورت میں تو مقابلہ بڑا آسان ہے، تم بھی ایسا کلام بنا لو: ﴿ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ

مِّثۡلِهٖ ... ﴾[البقرۃ: ۲۳] ''اس جیسی ایک سورت ہی لے آؤ۔'' خود اور ساری دنیا کی مدد سے ایک سو چودہ سورتوں کے مقابلے میں ایک سورت ہی بنا کر دکھاؤ! یہ دعویٰ آج تک قائم ہے۔ تو جب تم ایسا نہیں کر سکتے تو یہ ثابت ہوا کہ یہ انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں ہے، بلکہ خدا کا نازل کردہ ہے۔

فصحائے عرب کی بے بسی:

عرب کے فصحاء مشہور ہیں۔ لاکھوں کے مجمع میں قصیدے پڑھتے تھے اور داد لیتے تھے۔ اس قدر بااثر تھے کہ قبائل کے درمیان صلح کی ذمے داری ان پر ہوتی تھی۔ حج کے بعد مسجدِ خیف کے قریب ہر سال بے مثال مشاعرے ہوتے تھے۔

اس پائے کے شاعر ہونے کے باوجود کوئی بھی اس طرح کا کلام پیش نہ کر سکا۔ اس دعوے کے جواب میں مکمل خاموشی طاری رہی، وجہ صرف یہ ہے اور یہی تھی کہ اس کلام کو نازل کرنے والا ﴿يَعۡلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ ہے۔ یہ مقابلہ خدا سے ہے، جو ہمہ دان ہے۔

انسانی سطح پر جو مقابلہ ہوتا ہے اس میں مادی وسائل ہی کا اثر ہوتا ہے، یہاں مقابلہ مادی وسائل کے مالک سے ہے۔ آسمانوں اور زمین کے تمام راز اس کے سامنے عیاں ہیں: "اَلۡغَيۡبُ عِنۡدَهٗ شَهَادَةٌ"، ''تمام غیب اس کے سامنے ظاہر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ جو کچھ فرما رہے ہیں، وہ خدا کا فرمان ہے۔ اصل مقابلہ خدا سے ہے۔

غیب صرف خدا کی صفت ہے:

﴿اَلسِّرَّ﴾: ''بھید'' وہ جو زبان سے نہ نکلا ہو، دل اور دماغ کی گہرائیوں میں ہو۔ یہ غیب اور پوشیدہ چیزوں کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ غیب کا علم صرف خدا کو ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام خبریں دیتے رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے جن واقعات کے متعلق فرمایا تھا کہ ایسے ہوگا، یہ صرف خدا تعالیٰ کے بتانے ہی پر بتایا تھا۔ غیب کوئی رسول نہیں جانتا۔ سمندر کی تہہ میں کیا ہوا ہے؟ ہوا میں کیا ہے؟ نظر نہ آنے والی چیزوں کا علم صرف خدا کو ہے، اس پر خدا ہی کا علم حاوی ہے۔ ﴿يَعۡلَمُ السِّرَّ﴾ کا مطلب "يَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ" (غیب کا علم رکھنا) ہے۔

رسولِ کریم ﷺ نے کئی پیش گوئیاں کی ہیں، یہ سب خدا کے بتانے پر ہوا۔ رومیوں کے غلبے کی پیش گوئی کی:

﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ﴾ [الروم: ۲۔۴]

''رومی مغلوب ہو گئے ہیں قریب کی سرزمین میں۔ اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہو جائیں گے، چند سالوں میں۔''

رومی اہلِ کتاب تھے اور ایرانی آتش پرست۔ لڑائی میں رومی شکست کھا گئے تو مکہ والوں نے شور مچایا کہ اسی طرح جنگ میں ہمیں فتح ہو گی، کیوں کہ ہم بھی ایرانیوں کا سا دین رکھتے ہیں۔ یہ پیش گوئی نازل ہوئی، جو پوری ہوئی۔

گذشتہ واقعات وحی کے ذریعے معلوم ہوئے:

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے، اس میں فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ﴾ [یوسف: ۱۰۲] ''یہ غیب کی خبریں ہیں، جو آپ کی طرف وحی کے ذریعے سے آرہی ہیں۔'' آپ وہاں موجود نہ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیب دان نہیں ہیں۔ ﴿مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾ [آل عمران: ٤٤] ''آپ اس وقت ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنے قلم پھینک رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم علیہا السلام کا کفیل بنے۔'' یہاں حضرت زکریا علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کے واقعے میں فرمایا کہ جس وقت مریم علیہا السلام کی کفالت کا معاملہ طے کر رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود نہ تھے، یہ غیب کی خبریں تھیں جو ہم نے بتا دی ہیں۔ حاضر و ناظر ہونے کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔

بعض دفعہ نیک لوگوں کو خواب سے بعض امور کی خبر ہو جاتی ہے، لیکن یہ ﴿يَعْلَمُ السِّرَّ﴾ نہیں ہے۔

مغفرت کی امید:

﴿اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾ مطلب یہ ہے کہ وہ غلطی کے بعد معاف کر دیتا ہے۔ لڑائی کر کے مایوس نہ ہو جاؤ کہ اب ہم ہمیشہ مخالف ہی رہیں گے کہ ہمارے گناہ معاف نہیں ہو سکتے، بلکہ ذہن صاف کر کے آجاؤ:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾
[الزمر: ۵۳]

''(میری جانب سے) آپ کہہ دیجیے! اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے! تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔''

مہلت سے فائدہ اٹھاؤ:

خدا کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہو، بلکہ توجہ کرو، وہ یقیناً سب کچھ معاف کر دے گا۔ اسبابِ گناہ کو ختم کر دے، گناہ سے توبہ کرے، برائی کو چھوڑ دے، لیکن گناہ بھی کرتا رہے اور بخشش بھی طلب کرتا رہے، برائی پر مصر بھی رہے اور معافی اور توبہ بھی جاری رہے، یہ طرزِ عمل بالکل غلط ہے۔

آنحضرت ﷺ کے بدترین مخالفوں کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے: ﴿اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ ''وہ یقیناً بخشنے والا مہربان ہے۔'' اس کا دروازہ ہر آن کھلا ہے، اب بھی موقع ہے کہ مخالفت ترک کر کے حاضر ہو جاؤ، تمھارے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ نیز عذاب کے نازل کرنے سے قبل ایک طرح کی مہلت بھی ہے اور شانِ رحیمی کا اظہار بھی![1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (23 فروری 1968ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رسول بشر ہوتا ہے

﴿ وَقَالُوۡا مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِىۡ فِى الۡاَسۡوَاقِ لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مَلَكٌ فَيَكُوۡنَ مَعَهٗ نَذِيۡرًا ۝۷ اَوۡ يُلۡقٰٓى اِلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ تَكُوۡنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاۡكُلُ مِنۡهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا‏ ۝۸ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ ضَرَبُوۡا لَكَ الۡاَمۡثَالَ فَضَلُّوۡا فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ سَبِيۡلًا ۝۹ ﴾ [الفرقان: ۷۔۹]

''اور انھوں نے کہا: اس رسول کو کیا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے؟ اس کی طرف فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ہمراہ (لوگوں کو) ڈرانے والا ہوتا؟ یا اس کی طرف کوئی خزانہ ڈالا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ (پھل) کھاتا اور ظالموں نے (مومنوں سے) کہا: تم تو بس ایک جادو مارے شخص ہی کی اتباع کرتے ہو۔ دیکھیے! انھوں نے آپ کے لیے کیسی مثالیں بیان کی ہیں، وہ بہک گئے ہیں، لہٰذا وہ راہ نہیں پا سکتے۔''

مشرکینِ مکہ کی حیرانی:

مشرکینِ مکہ کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی تھی کہ ان ہی کی قوم اور جنس کا ایک فرد رسول ہو۔ ان کے لیے یہ حیرانی کی بات تھی کہ ایک ''انسان'' پر خدا کا کلام نازل ہو: ﴿ بَلۡ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَهُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡهُمۡ فَقَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا شَىۡءٌ عَجِيۡبٌ ﴾ [قٓ: ۲]

''انسان اور نبی'' ان کی عقل اس کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی اور ﴿ اَلرَّسُوۡلِ ﴾ کے لفظ کو وہ مذاق کے انداز میں استعمال کرتے تھے کہ یہ پیغمبر کیسا ہے؟ ﴿ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِىۡ فِى الۡاَسۡوَاقِ ﴾ روٹی کھاتا ہے اور خرید و فروخت کے لیے بازار میں آتا جاتا ہے۔

ان کے خیال کے مطابق نبی ایسا ہونا چاہیے کہ اس کو روٹی کھانے کی حاجت نہ ہو، وہ بازار میں

آئے اور نہ جائے ہی، یعنی پیغمبر انسان نہیں فرشتہ ہونا چاہیے: ﴿ أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُولًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٤] ''کیا خدا نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا ہے؟'' ہم اس پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہیں، کیوں کہ رسول بشر نہیں ہونا چاہیے اور نبی کا انسان ہونا درست نہیں ہے۔ لوگوں کا یہ ذہن آج بھی ہے۔

بشریتِ رسول کے متعلق آج کے لوگوں کی غلط فہمی:

وہ لوگ جانتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ ان کی قوم کے ایک فرد ہیں، ان کی نسل سے ان کا تعلق ہے، لیکن وہ آپ کو اسی وجہ سے رسول نہیں مانتے تھے۔ کچھ لوگ اِس زمانے میں ایسے ہیں جو آپ کو رسول تو مانتے ہیں، لیکن یہ نہیں مانتے کہ آپ بشر تھے۔ یہ لوگوں کا خود ساختہ معیار ہے۔ پہلی کتابوں میں بھی یہ معیار نہ تھا۔

انبیائے کرام علیہم السلام نبوت سے پہلے بھی معاش کے لیے کوشش کرتے تھے اور بعد میں بھی کرتے رہے۔ خود رسولِ کریم ﷺ تجارت کرتے رہے ہیں۔ آپ کو بھوک لگتی تھی، کھانا کھاتے تھے اور بازار بھی جایا کرتے تھے۔ ایک گوشت پوست کا آدمی، جو کھانے پینے کا بھی محتاج ہو اور اپنی ضروریات کے لیے کام کاج بھی کرے، وہی انسانوں کی ہدایت کے لیے کیوں ضروری ہے؟ اس سوال کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے:

﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿95﴾ ﴾ [بني إسرائيل: ٩٥]

یعنی اگر زمین پر فرشتے آباد ہوتے تو ان کے لیے ایک فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ اب چونکہ زمین پر انسان آباد ہیں، اس لیے ان کی ہدایت کے لیے ایک انسان ہی کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہی نہیں، بلکہ اسوۂ حسنہ بھی پیش کرنا ہے اور اسوہ ہم جنس ہی کا حجت ہو سکتا ہے۔

واضح بات:

جو آدمی قرآن کا بالکل سادہ ترجمہ ہی پڑھتا ہو اور احادیث کا مطالعہ کرتا ہو، ممکن نہیں ہے کہ وہ اس معاملے میں کسی بھی شبہے میں مبتلا ہو۔

رسولِ کریم ﷺ بشر تھے اور انسانوں کی تمام خصوصیات آپ میں موجود تھیں۔ آپ متواتر کھانا

بھی کھاتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اندازہ کیا کہ حضور ﷺ کے چہرے پر بھوک کے آثار ہیں اور خود ان کے پاس بھی کھانے کو کچھ نہ تھا، چنانچہ آپ ایک یہودی کے باغ میں گئے، باغ کو پانی دیا اور وہاں سے مزدوری میں کھجوریں لا کر حضور ﷺ کو کھلائیں۔[1]

قرآنی گواہی:

آج بھی یہ ذہن موجود ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ بشر نہیں ہیں۔ قرآن نے اس مسئلے کو بار بار مختلف انداز سے واضح کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورت کہف میں آپ ﷺ کی زبان سے واضح فرمایا:

﴿ قُلْ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ ﴾ [الكهف: ١١٠]

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تو بس تمھاری ہی طرح بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''

جاہلانہ اعتراض:

بعض جاہل یہ کہہ دیتے ہیں کہ لبادہ تو بشریت کا تھا، لیکن حقیقت میں آپ نور تھے۔ سورت انعام میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس مطالبے کا ذکر کیا ہے کہ فرشتہ نازل ہونا چاہیے تھا۔ جواب میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَوْ جَعَلْنَٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَٰهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ﴾ [الأنعام: ٩]

''اور اگر ہم اس (نبی) کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو بھی ہم اسے انسان ہی کی شکل میں بھیجتے اور (تب بھی) ہم انھیں اسی شبہے میں ڈالتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں۔''

یہ مسئلہ بالکل صاف اور واضح ہے، لیکن تعصب اور جہالت کی وجہ سے خواہ مخواہ اس کو الجھایا جاتا ہے۔

احسانِ الٰہی:

اللہ تعالیٰ تو انسانوں پر اپنے اس احسان کا ذکر کرتے ہیں کہ ان پر انہی کا ایک ہم جنس رسول بھیجا گیا ہے۔ ہمارے ان مہربانوں کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ یہ اور تو سب کچھ مانتے ہیں، لیکن آپ ﷺ کو انسان اور بشر ماننے کے لیے تیار نہیں!

سورت آلِ عمران میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ ﴾ [آل عمران: ١٦٤]

[1] مسند أحمد، رقم الحديث (٦٨٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٧٦)

''بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیجا۔''

اسی طرح سورت جمعہ میں فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ [الجمعة: ٢]

''وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول بھیجا انھی میں سے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی جو دعا مانگی تھی، اس میں بھی اس کا ذکر ہے:

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ [البقرة: ١٢٩]

''اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے لیے ان میں سے ایک رسول بھیج۔''

کفار کے بے جا اعتراضات:

﴿ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ﴾ [الفرقان: ٦] یعنی بالفرض اگر کسی انسان ہی کو نبی بنانا تھا تو اس کے ساتھ ایک فرشتہ ہی نازل کر دیا جاتا، جو ان لوگوں کو ڈراتا جو اس کو نبی ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

﴿ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ﴾ [الفرقان: ٨] اور اگر کوئی فرشتہ بھی ساتھ نازل نہیں کرنا تھا تو ایسا تو ہوتا کہ خدا تعالیٰ اپنے رسول کو خوش حالی سے رکھتے۔ آپ ﷺ بہت بڑے خزانے کے مالک ہوتے، یا کم از کم ایسا ہوتا کہ ایک باغ ان کے تصرف میں ہوتا، جہاں سے پھل وغیرہ کھا سکتے، یعنی خرید وفروخت اور معاش کی فکر سے آزاد ہوتے۔

﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ ﴾: یعنی کیسی عجیب باتیں کرتے ہیں، جو بالکل بے سروپا باتیں ہیں۔ یہ خود چونکہ اپنے کسی اعتراض پر مطمئن نہیں ہیں، اس لیے کوئی ٹھکانے کی بات ان کو سوجھ ہی نہیں رہی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ رسول مانتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس نہ خزانہ تھا، نہ وہ خود فرشتے تھے اور نہ کوئی فرشتہ ہی ان کے ساتھ لوگوں کو ڈرانے کے لیے ہوتا تھا۔ وہ تو بکریاں چرا کر گزارہ کیا کرتے تھے۔ [1]



---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٦٢)

ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (1 مارچ 1968ء) مرتب: چودھری عبدالواحد صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طائفہ منصورہ اور مخالفین کی سازشیں

(از قلم: محمد یحییٰ عزیز)

12 / مئی 1967ء بروز جمعۃ المبارک حضرت الامیر صاحب بڑی دیر کے بعد لائل پور میں تشریف لائے۔ حضرت امیر صاحب کی آمد اور آپ کا ورودِ مسعود باعثِ صد مسرت ثابت ہوا۔

اہلِ لائل پور نے والہانہ انداز سے آپ کا استقبال کیا۔ لاکھوں آنکھیں آپ کے دیدار کی متمنی تھیں۔ دراصل یہ اہلِ لائل پور کی بے پناہ عقیدت ہی تھی، جو حضرت الامیر کو اس شہر میں کھینچ لائی۔ آپ کی آمد سے قبل نہ صرف لائل پور کو بلکہ پورے پاکستان کو مطلع کر دیا گیا تھا اور با قاعدہ اشتہارات کی شکل میں پروگرام کو مرتب کر کے ملک کے کونے کونے میں بھیج دیا تھا۔ یہ فریضہ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب احرار نے بخوبی انجام دیا۔

حضرت الامیر کی آمد پر آپ کے اِعزاز میں شیخ محمد ابراہیم صاحب (نیشنل کلاتھ ہاؤس) نے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا، جس میں دیگر معززینِ شہر کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے آپ کی آمد پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد یہ سب حضرات جامع مسجد اہلِ حدیث میں تشریف لائے، کیوں کہ جمعہ کا وقت ہو رہا تھا۔ جامع مسجد اپنی وسعتِ فراخی کے باوجود عقیدت مندوں کے بے پناہ ہجوم سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ہر ایک کے چہرے سے مسرت اور شادمانی ٹپک رہی تھی۔

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے حضرت الامیر منبرِ رسول پر جلوہ افروز ہوئے۔ موذن نے حجازی لَے میں اذان دی، جس سے مسجد تو مسجد فضا میں بھی ایک سوز اور ترنم پیدا ہوگیا۔ سامعین پر ہو کا عالم طاری تھا۔ یکا یک حضرت الامیر اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ نے اس سکوت کو خطبہ مسنونہ سے توڑا۔ آپ نے سورت لقمان کی آیت:

﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾

[لقمان: ١٩]

''اور تو اپنی چال درمیانی رکھ اور اپنی آواز دھیمی رکھ، بلاشبہہ سب آوازوں سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔''

تلاوت فرمائی۔ پھر مختصر حمد و ثنائے باری تعالیٰ بیان کرنے کے بعد آپ نے ابتدا و ارتقائے اسلام کا ایک مختصر، جامع مگر عمیق جائزہ لیا، آپ نے جزیرہ نمائے عرب کا تاریخی، معاشی، سیاسی، جغرافیائی تجزیہ کرتے ہوئے اس کے محلِ وقوع کی موزونیت و مناسبت پر ایک مدلل اور جامع بحث کی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ خطۂ ارضی کئی ایک تہذیبوں کے درمیان واقع ہے۔

بعثتِ رسول:

بعثتِ رسول ﷺ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اس جزیرہ نما عرب میں دین نے تحریف کا لبادہ اوڑھ لیا اور اخلاقی اقدار دنیا سے ناپید ہوگئیں۔ شرم و حیا کا دیوالا نکل گیا اور وہ لوگ گمراہی کی اس گہری اور وسیع خلیج میں اس قدر نیچے چلے گئے تھے کہ ان کا باہر نکلنا دشوار نظر آ رہا تھا تو اس وقت غیرتِ ربانی جوش میں آئی اور اس نے ہادیِ انام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دنیا میں اہلِ دل کی فلاح و بہبود کے لیے مبعوث فرمایا۔ چونکہ اسلام کی ابتداء تھی، اس لیے اس کے ماننے والے بہت کم تھے اور جو تھے وہ قوت اور طاقت کے اعتبار سے کمزور تھے۔ اس لیے تبلیغِ دین ایک خفیہ تحریک بنی رہی اور اس کی مثال بالکل اس چنگاری کی طرح ہے، جو اندر ہی اندر سلگتی رہے اور پھر یکا یک خرمن کو بھک سے آگ لگا دے۔

تین گروہ:

حضور ۔علیہ التحیۃ والسلام۔ نے یقینِ کامل کے ساتھ لوگوں کو درسِ توحید دیا اور ذاتِ واجب الوجود کے حقیقی اوصاف سے روشناس کرایا۔ پھر جب اسلام کے پیرو بڑھنے شروع ہوگئے تو اس نے ایک علانیہ تحریک کا رنگ دھار لیا۔ اس کے ظہور کے ساتھ ہی عرب تین گروہوں میں منقسم ہوگئے: ایک گروہ تو وہ تھا جو اپنی ہٹ دھرمی کے باعث صاف انکار کر رہا تھا۔ دوسرا وہ تھا جو دل و جان سے حضور پر شیدا تھا اور آپ کے فرامین پر اپنے آپ کو قربان تک کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔ تاریخ ان حقائق سے نقاب کشائی کرتی ہے۔

ان کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی تھا جو دنیاوی اغراض و مصالح کے پیشِ نظر بظاہر مسلمان بنا ہوا تھا، مگر وہ اندرونِ خانہ اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا، جس کی کوشش ہی یہ تھی کہ اسلام کا یہ سرسبز و شاداب پودا جڑ سے اُکھاڑ دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ سے اسلام کو بہت نقصان پہنچا۔ ان منافقوں نے اسلام کے لبادے میں اسلام کو اس قدر نقصان پہنچایا کہ خود قرآن کو اُن کی نشان دہی کرنا پڑی۔ آئندہ چل کر یہ ایک تناور درخت بن گیا، جس نے پورے عالمِ اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

حریص طبائع:

نفسیاتی طور پر بعض طبائع کمزور واقع ہوتی ہیں، جو لالچ اور حرص سے مغلوب ہو کر ذاتی اغراض کے حصول میں کوشاں رہتی ہیں، ان کا مقصدِ وحید ہی یہ ہوتا ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی کا ساتھ دے کر ہر ممکن حد تک اپنا کام نکال لیا جائے، خواہ اس میں ناجائز ذرائع ہی کا کیوں نہ استعمال کرنا پڑے۔

منافقین کی غداری:

جب اسلام کو اپنے ایک نہایت ہی خطرناک دشمن روم سے سابقہ تھا، اس وقت منافقوں کے ایک گروہ کا حیل و حجت کر کے لشکرِ اسلام سے علاحدہ ہو جانا اسلام سے کھلی غداری تھا۔ ان کی اس شرمناک علاحدگی نے ان کی بد باطنی کی نقاب کشائی کر دی اور یہ گروہ کھل کر سامنے آ گیا، چوں کہ اسلام کا عنفوانِ شباب تھا، اس لیے حضور علیہ السلام نے ان کی گوشمالی مناسب نہ سمجھی، تاکہ کفار یہ نہ کہیں کہ یہ کیسا انسان ہے، جو اپنے ہی حواریوں کو قتل کرنے کے درپے ہے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حالات کا پوری طرح جائزہ لیتے ہوئے پوری دل جمعی کے ساتھ اپنے مشن کی تبلیغ میں منہمک رہے۔ قرآنِ مجید نے ان کی اس غداری کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ۝42﴾ [التوبة: ٤٢]

”اور عنقریب وہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم طاقت رکھتے تو تمھارے ساتھ ضرور نکلتے۔ وہ خود کو ہلاک کر رہے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک وہ سراسر جھوٹے ہیں۔“

آگے فرمایا:

﴿اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ﴾ [التوبة: ٤٥]

''آپ سے اجازت تو صرف وہ لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہیں، لہٰذا وہ اپنے شک میں پڑے تردد کر رہے ہیں۔''

ایک کسوٹی:

ان آیات میں جہاں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حقیقت سے پردہ کشائی کی ہے، وہاں ہمارے سامنے ایک میزان اور کسوٹی بھی رکھ دی ہے، جس سے ہم کھوٹے اور کھرے میں فرق کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص اس کشمکش میں دل وجان سے حمایت کرتا ہے اور اپنی ساری طاقت اور ذرائع اس کی سربلندی میں صرف کرتا ہے اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا، وہی دراصل سچا مومن ہے، بخلاف اس کے جو اس کشمکش میں اسلام کا ساتھ دینے سے جی چرائے اور کفر کی سربلندی کا خطرہ سامنے دیکھتے ہوئے بھی اسلام کے لیے جان ومال کی بازی لگانے سے پہلو تہی کرے، اس کی یہ روش اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ اس کے دل میں ایمان نہیں۔

منافقین کی بدباطنی:

قرآن پاک نے ان کی بدباطنی اور اسلام دشمنی کو بھی آشکار کیا ہے۔ چونکہ ان کے دلوں میں شرکتِ جہاد کا جذبہ ہی نہ تھا، بلکہ وہ صرف مسلمانوں کی شرما شرمی، بددلی یا کسی شرارت کی نیت سے جہاد میں شریک ہوتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اجازت ہی نہ دی اور پیغمبر ﷺ کو صورتِ حال سے آگاہ فرماتے ہوئے کہا کہ اے حبیب! کوئی بات نہیں، یہ لوگ تو حیلے اور بے جا بہانے کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اس قدر مخالف تھے کہ اگر انھیں وحیِ الٰہی کا خوف نہ ہوتا تو وہ بھی کفارِ مکہ کی طرح اعلانِ بغاوت کر دیتے۔ ان کی اس خصلت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ﴾ [التوبة: ٦٤]

’’منافقین (اس بات سے) ڈرتے ہیں کہ ان (مسلمانوں) پر کوئی سورت نازل کر دی جائے جو انھیں (ہر بات) بتا دے، جو ان (منافقوں) کے دلوں میں ہے۔‘‘

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ﴾ [التوبة: ١٠١]

’’اور تمھارے آس پاس جو دیہاتی ہیں ان میں بعض منافق ہیں، اور بعض اہلِ مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔ (اے نبی!) آپ انھیں نہیں جانتے، ہم انھیں جانتے ہیں۔‘‘

یعنی اپنے نفاق کو چھپانے میں وہ اتنے مشاق ہوگئے ہیں کہ خود نبی اکرم ﷺ بھی اپنی کمال درجے کی فراست کے باوجود ان کو نہیں پہچان سکتے تھے۔

منافقین کی بغاوتیں:

غرض کہ حضور ـ علیه التحیة والسلام ـ کے عہدِ مبارک میں یہ لوگ اندرونِ خانہ اسلام کے سخت مخالف رہے اور انھوں نے اسلام کو مٹانے کی پیہم کوششیں کیں، جب حضورِ اقدس اس دارِ فانی سے اپنا مقدس مشن ختم کر کے دارِ آخرت کی طرف رحلت فرما گئے تو اس شجرۂ خبیثہ کو مزید پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا، چنانچہ دورِ صدیقی کے شروع ہوتے ہی طرح طرح کے فتنے جنم لینے لگے اور اسلام کے خلاف علانیہ بغاوتیں شروع ہوگئیں۔ بعض قبیلے تو بالکل اسلام سے مرتد ہو گئے۔ بعض نے فرضیتِ صلاۃ سے انکار کر دیا اور بعض زکات کو رکنِ اسلام ماننے سے روگردانی کرنے لگے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کمال فراست سے کام لے کر اس فتنے کو دبایا۔

عہدِ فاروقی میں بھی یہ فتنہ دبا رہا، مگر اس نے دور دراز علاقوں میں سر اُٹھانا شروع کر دیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ فتنہ اور چمکا اور شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ اسی کا نتیجہ ہے۔ آپ کا شہید ہونا ہی تھا کہ مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ کچھ تو وہ تھے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پیرو تھے اور کچھ وہ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ وہ وقت اسلام کا بڑا نازک وقت تھا، ہر طرف سے فتنے امڈے چلے آتے تھے۔ مسلمان خانہ جنگی میں مشغول ہوگئے، جس کے نتیجے میں جنگِ جمل اور جنگِ صفین دو مشہور لڑائیاں معرضِ وجود میں آئیں، جس سے مسلمانوں کا بہت زیادہ نقصان ہوا۔

اشاعتِ حدیث:

اس کے ساتھ ساتھ حضرت الامیر نے تبلیغِ دین اور اشاعتِ حدیث پر بصیرت افروز دلائل دیتے ہوئے فرمایا کہ عہدِ رسالت ہی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تبلیغ و کتابتِ حدیث شروع کر دی تھی، جیسے کتبِ احادیث سے واضح ہے۔ صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں تو یہ فن بہت اچھی طرح چمکا، جب اصحابِ صحاح ستہ کا دور آیا تو انھوں نے اس فن میں مزید چار چاند لگا دیے اور اس کو باقاعدہ طور پر مرتب و مدون کر دیا۔ آیندہ چل کر ان کی یہی مساعیِ جمیلہ لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرِ خدا کی مکمل تصویر پیش کرنے کی جو سعی محدثین نے پیش کی ہے، اس کی مثال تاریخِ عالم میں مفقود ہے۔ دراصل وہ لوگ حقیقی جذبۂ عشقِ رسول سے آشنا تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنا سب کچھ اس فن کی نذر کر دیا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی مساعیِ جمیلہ:

تاریخ شاہد ہے کہ مختلف ادوار میں بہت سارے لوگوں نے اس فن پر خامہ فرسائی کی، جن کی رشحاتِ قلم آج دنیا میں موجود ہیں۔ آیندہ چل کر اس سلسلے میں جن لوگوں نے محنت کی، ان میں سرِفہرست شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگردِ رشید حافظ ابن القیم رحمہ اللہ ہیں۔ یہ دونوں بزرگ اپنے وقت کے بہت بڑے امام تھے۔ خالقِ کائنات نے ان کے قلم میں زور اور ان کی زبان میں تاثیر مبالغے کی حد تک رکھی تھی۔ یہ لوگ باوجود شدید مخالفت کے اپنے کام میں منہمک رہے اور اُن کے قلم سے وہ کارہائے نمایاں معرضِ وجود میں آئے جو آج نوادرِ روزگار شمار کیے جاتے ہیں۔

تقلیدی جمود کے خلاف علمِ بغاوت:

ان حضرات نے اس وقت کے تقلیدی اور جمودی دور کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے ایک اصلاحی تحریک چلائی تھی، جو بڑی حد تک کامیاب رہی۔ یہ تحریک ان کے بعد بھی جاری رہی، کیوں کہ ان کی تصانیف ان کے اصلاحی خیالات کا خزینہ تھیں اور پھر انھوں نے شاگردوں کی ایک ایسی پرجوش جماعت پیدا کر دی تھی، جس نے ان کی تحریک کو نہ صرف زندہ اور برقرار رکھا، بلکہ ان کی تمام تصانیف کو، جو اسلامی جوش اور ولولے سے لبریز تھیں، ہر جگہ پھیلانا شروع کر دیا، اس جماعت کے سرگروہ شیخ شمس الدین ابن القیم رحمہ اللہ تھے۔ اُنھوں نے اپنے استاد کے انقلاب انگیز خیالات کو نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ مدون کیا اور سنجیدگی کے ساتھ ان کی اشاعت کی۔

ہندوستان پر اثرات:

چنانچہ اس مقدس تحریک سے ہندوستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کتبِ تاریخ شاہد ہیں کہ وقتاً فوقتاً اس کے داعی ہندوستان آتے رہے اور اس مقدس فن کی اشاعت میں منہمک ہوتے رہے۔ ہندوستان میں زیادہ تر ان لوگوں نے حدیث کی اشاعت کی، جو امامین سابقین کی تحریک سے عقیدت کی حد تک متاثر تھے، ان کا تبلیغی انداز بالکل وہی تھا جو صحابہ، تابعین اور سلف صالحین کا تھا۔

ولی اللّٰہی خاندان:

ہندوستان میں اشاعتِ حدیث میں سب سے زیادہ شاہ ولی اللہ کے خاندان نے حصہ لیا، اس خاندان نے قرآن اور حدیث کی بڑی خدمت کی۔ اگر ایک طرف قرآنِ مجید کا ترجمہ اور تفسیر کر کے امت کی ضرورتوں کو پورا کیا تو دوسری طرف احادیث کے اسرار و رموز اور حکم بیان کر کے تشنگانِ علمِ حدیث کی پیاس بجھائی۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، جنھوں نے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنے آپ کی بازی لگا دی اور باطل طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے، انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ حدیث پر بھی بہت کام کیا۔

میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ:

اس خاندان کے دوسرے بزرگ حضرت اسحاق رحمہ اللہ ہیں، وہ اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے۔ لوگ ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو رہے تھے۔ آپ وقت کے بہت بڑے محدث بھی تھے۔ آپ کی خدمت میں ایک طالب علم آیا اور بہت ہی قلیل مدت میں اپنے استاد کو اس قدر متاثر کر دیا کہ وہ جب ارضِ حجاز کی طرف ہجرت کے ارادے سے دہلی چھوڑنے لگے تو انھوں نے تدریسِ حدیث کی مسند پر اس طالبِ علم کو بٹھا دیا، جو بعد میں چل کر شیخ الکل فی الکل کے نام سے مشہور ہوا۔

آپ نے نہایت دیانت داری سے اور صبر و تحمل سے اس صبر آزما عہدے کو نبھانے کی کوشش کی۔ چند ہی دنوں میں آپ کی شہرت دور دراز ملکوں میں پھیل گئی اور عقیدت مندوں کا ہجوم ہونے لگا، آپ کی مجلس میں بیک وقت ہزاروں لوگ درسِ حدیث سے استفادہ کرتے تھے۔ آپ کے تلامذہ کا حلقہ اس قدر وسیع ہوا کہ ہندوستان تو درکنار بیرونی ممالک میں بھی آپ کے بہت سے شاگرد ہوگئے۔ آپ

کے فیضان سے متمتع ہونے والوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اسلاف کی یاد تازہ کر دی۔

آپ کے فیض یافتگان میں سب سے مشہور غزنوی خاندان ہے اور اس کے ساتھ ساتھ لکھوی خاندان بھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان دونوں خاندانوں نے ہندوستان میں علمِ حدیث کی بے مثال خدمت کی، آپ کے ارشد تلامذہ میں مولانا محمد عبداللہ صاحب غزنوی، حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی اور مولانا حافظ محمد صاحب لکھوی رحمہم اللہ بہت مشہور عالم گزرے ہیں۔

غزنوی خاندان کے چشم و چراغ حضرت مولانا محمد داود صاحب غزنوی رحمہ اللہ بھی وقت کے بہت بڑے جید عالم تھے، جہاں آپ نے سیاست میں سرگرم حصہ لیا، وہاں آپ نے علمِ حدیث کی بھی بہت خدمت کی۔ آپ کے درسِ حدیث سے لاکھوں لوگ متاثر ہیں۔ آپ ہی کی مساعیِ جمیلہ سے ایک عظیم الشان مرکزی درس گاہ کا قیام معرضِ وجود میں آیا، جس کا مقصد صرف اسلاف صالحین کی سنت کا اِحیا تھا، اس درس گاہ کے پیشِ نظر جہاں طلبہ میں علومِ اسلامیہ کی رُوح پھونکنا ہے، وہاں ان کو دورِ حاضر کے جدید تقاضوں سے روشناس کراتے ہوئے علومِ دنیاوی سے بہرہ افروز کرنا بھی ہے، چناں چہ یہی وجہ تھی کہ اس مرکزی درس گاہ میں انگریزی تعلیم کو وسیع پیمانے پر لازمی قرار دے دیا گیا، چناں چہ اس کے فیض یافتہ آج ملک کے گوشے گوشے میں تعلیم و تدریس اور تبلیغِ دین میں مصروف ہیں۔

آمد کا مقصد:

آخر میں حضرت الامیر صاحب نے لائل پور میں اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کچھ عرصے سے جماعت میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا، جو بحمد اللہ میاں فضل حق صاحب ناظمِ اعلیٰ کی مسلسل کوششوں سے دور ہوتا جا رہا ہے اور کافی حد تک جماعت کی اصلاح ہوگئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میاں صاحب ہی کی ذات ہے، جنھوں نے اس قدر کٹھن معاملے کو نہایت دانش مندی سے سلجھا دیا ہے۔ یہ آپ ہی کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ کراچی سے پشاور تک بلکہ آزاد کشمیر تک جماعت میں اتحاد و اتفاق کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور ہر طرف سے تعاون کی صدائیں بلند ہو رہی ہے، جا بہ جا جلسے ہو رہے ہیں، تاکہ جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یک جا کر دیا جائے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (30,23,16/ جون 1967ء) از قلم: محمد یحییٰ عزیز (ایم۔اے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعوت الی اللہ کا مقام اور داعی الی اللہ کے اوصاف

﴿وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَمَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ ﴿۳۵﴾﴾ [حمٓ السجدۃ: ۳۳-۳۵]

”اور اس شخص سے زیادہ اچھی بات کس کی ہوسکتی ہے جس نے (لوگوں کو) اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیے اور کہا: بے شک میں تو فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور نیکی اور برائی برابر نہیں ہوسکتیں، آپ (برائی کو) ایسی بات سے ٹالیے جو احسن ہو، تو (آپ دیکھیں گے) یکایک وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان دشمنی ہے، (ایسا ہو جائے گا) جیسے گرم جوش جگری دوست ہو۔ اور یہ (خصلت) انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہو۔“

ربطِ آیات:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دعوتِ الی اللہ کے مقام کی شان اور اس کی افادیت کا ذکر کیا ہے۔ اصلاحِ خلق کے لیے کام کرنے والوں کو جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کے حل کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں بنیادی ہدایات دی ہیں۔ اس سے پہلے اربابِ استقامت کا ذکر فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا﴾ [حمٓ السجدۃ: ۳۰]

داعی کی صفات:

① کوئی آدمی ”رَبُّنَا اللّٰہُ“ کہتا ہے تو وہ ذاتِ حق کی ربوبیت کا اقرار کرتا ہے، اس اقرار کے بعد

اس پر ایک ذمے داری پڑ جاتی ہے اور اس کو اس میں استقامت دکھانی چاہیے۔ ثابت قدمی کے بعد ملائکہ آتے ہیں۔ اس آیت کے اور جو آیت میں نے خطبے میں پڑھی ہے، درمیان خاص ربط ونظم ہے۔ اس آیت میں داعی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس میں کیا صفات ہونی چاہئیں، وہ صفات اقرارِ کلمۂ توحید، صفاتِ حق کا مکمل یقین، ان کا مخلوق کے سامنے اقرار و اعلان اور اس کے بعد اس پر استقامت ہیں۔

دعوت کے اصول:

② دوسری آیت میں دعوتِ الی اللہ کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والا ساری مخلوق میں بہترین شخص ہوتا ہے اور اس کی گفتگو بے حد قابلِ قدر ہوتی ہے۔ ابن جریر، رازی، مظہری، ابن کثیر رحمہم اللہ وغیرہ اکثر مفسرین نے اللہ تعالیٰ کی طرف پکارنے والوں کی اقسام کا ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے داعی انبیا ہی ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اربابِ جہاد، علماء اور سلاطین کوئی بھی بادشاہ و حاکم اس کام سے گریز کرتا تو وہ قانونِ الٰہی میں مجرم ہے۔ علمائے حق اور صلحائے امت ہمیشہ اللہ کی طرف لوگوں کو پکارتے رہے۔ ہر آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں اس فرض کو ادا کرتا رہے۔

دعوتِ الی اللہ ہر مسلمان کی ذمے داری ہے:

دعوتِ الی اللہ اہلِ ایمان کا اصل کام ہے اور دنیا میں اس سے بہتر کوئی کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عجیب سوالیہ انداز میں یہ امر مسلمان کو ذہن نشین کرایا ہے:

1. خود نیک عمل کرو۔
2. لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف بلاؤ۔
3. اپنے اسلام کا کھلم کھلا اعلان کرو۔

بعض ائمۂ تفسیر نے ﴿دَعَآ اِلَى اللّٰهِ﴾ کا مطلب بیان کرتے ہوئے حصر اور تخصیص کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد اذان ہے اور اس میں موذن کی شان بیان ہوئی ہے۔ الفاظ پر غور کیا جائے تو ایسا محسوس نہیں ہوتا، ان الفاظ میں بہترین انداز سے ایک حکیمانہ دعوت دی گئی ہے۔ صرف

اذان سے ان الفاظ کو خاص کرنا محلِ نظر ہے۔ اذان مدینے میں مقرر ہوئی تھی اور یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ ابوسفیان کے خسر عتبہ نے مکہ کے قریش کے سرداروں کے مشورے سے آپ ﷺ سے ملاقات کر کے چند شرائط پیش کی تھیں۔ اس میں مال، حکومت اور جنون کے علاج کی پیش کش کی تھی۔ اس کے جواب کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے سورۃ حم السجدۃ کی تلاوت کی تھی۔

بعض روایتوں میں بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ کی زبان سے جس وقت الفاظ ﴿ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴾ نکلے تھے تو عتبہ نے اچانک آپ ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے سے قبل یہ سورت نازل ہو چکی تھی۔ اس لیے اس آیت: ﴿ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ کو موذن و اذان کے ساتھ خاص کرنا محلِ نظر ہے۔ یہ آیت عام آیت ہے، ہر مسلمان کو داعی الی اللہ ہونا چاہیے۔

پہلے داعی:

رسول اللہ ﷺ پہلے داعی الی اللہ تھے، جو دگرگوں حالات میں بھی دعوتِ الی اللہ کا فرض ادا کرتے رہے۔ کلمۂ توحید اور مقامِ نبوت ان کا تقرر اور تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ دعوتِ الی اللہ کیا ہے؟ کلمے کے دونوں جزو دعوتِ الی اللہ ہیں اور اگر نبوت کے مقام کو نہ سمجھا جائے تو دعوتِ الی اللہ کا کوئی مقام نہیں ہے۔

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ ﴾ [النجم: ٣،٤]

آپ ﷺ کا نطق خدا کے فرمان کے مطابق ہے۔ پہلے داعی محمد ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد کوئی داعی ایسا نہیں ہوا۔ ختمِ نبوت کا مطلب بھی یہی ہے۔ علماء، صلحاء، فقہاء، محدثین ائمہ سب دعوت کا کام کرتے رہے ہیں، لیکن ایسا ایک بھی نہیں جس سے لغزش نہ ہوئی ہو۔ مقامِ محمد ﷺ میں یہ بات نہیں ہے۔ وہاں لغزش کا سوال ہی نہیں ہے، کیوں کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوتا ہے۔

دعوت میں تین مراحل:

ہر دعوت پیش کرنے والے کو عموماً تین مراحل سے گزرنا ہی پڑتا ہے:

[1] صحيح السيرة النبوية للألباني (ص: ١٦١)

① عدمِ توجہ کا مرحلہ۔

② اختلاف کے طوفان کا دور۔

③ کامیابی کا مرحلہ۔

دعوت کا طریقۂ کار:

رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی قوت نہ تھی، صرف چند مقدس لوگ تھے، جو اپنے طریق پر دعوت دیتے تھے۔ مکہ کی وادی میں یہ کام ہوتا رہا۔ مکہ میں وہ اثرات جو داعی چاہتے تھے، نہ ہوئے تو علاقے میں سفر کرتے اور دعوت دیتے۔ گھر اور باہر ہر جگہ دعوت دی۔ "لا إلٰه إلا اللّٰه" کی دعوت جاری رہی اور دوسری طرف خدا کے گھر میں بتوں کی پوجا ہوتی رہی تھی۔ آپ ﷺ نے انفرادی و اجتماعی طور پر بھی دعوت دی۔

دعوت کی تکمیل:

مدینے سے بارہ آدمیوں کا گروہ آتا ہے اور بات سن کر اسلام قبول کر لیتا ہے۔ اگلے سال ستر آدمی آ کر اس دعوت کو قبول کرتے ہیں، کچھ عرصے کے بعد جب مدینے میں اس دعوت کے اثرات بڑھ جاتے ہیں تو مدینے کی طرف ہجرت کا حکم ہوتا ہے۔ وہاں دعوت کا رنگ بدل جاتا ہے۔

مدینے میں نظم اور قوت حاصل ہوئی۔ صلح حدیبیہ کی شکست کے بعد مکہ فتح ہوتا ہے تو ایک منٹ کی تاخیر سے قبل تمام بتوں سے بیت اللہ کو صاف کر دیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں کوئی سودا بازی نہیں کی۔ اس سے قبل تمام عرصہ بتوں کی مذمت اور زبانی تلقینِ توحید جاری رہی، لیکن طاقت وقوت آتے ہی اس کام کو مکمل کیا اور دعوت کی تکمیل کر دی۔

آپ ﷺ نے دعوت کے تمام مراحل میں اپنے قدم سوچ سمجھ کر رکھے۔ نبوت کے ساتھ انسانیت کا کمال تھا۔ اب کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ ہم بھی دعوت وتبلیغ میں مشغول ہیں، بلکہ یہ کام بڑے زور وشور سے ہو رہا ہے۔ لیکن عام طور پر انداز غلط ہے اور مفید باتیں غلط موقعے پر پیش کی جا رہی ہیں۔ دعوت کے لیے اسالیب درست اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے طریقے اختیار کیے۔

داعی کو حکمت وفراست سے کام لینا چاہیے:

دعوت کا کام بے حد اہم کام ہے۔ داعی اگر غلطی کر جائے تو اس کے اثرات بے حد برے اور

دور تک ہوتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ داعی اپنے ماحول کے حالات سے بخوبی واقف ہو۔ لوگوں کے رجحانات اور عادات کا اس کو پورا علم ہو۔ جس طرز کی بھی زندگی وہاں کے لوگ بسر کر رہے ہوں، اس سے وہ پوری طرح باخبر ہو۔

رسول اللہ ﷺ مدینے کی طرف ہجرت کرتے ہیں، لیکن مدینے میں داخل ہونے سے قبل 15 دن تک قباء میں قیام کرتے ہیں۔ قبا کے قیام کے دوران میں آپ ﷺ کو وہاں کے حالات کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ وہاں قبائلی زندگی تھی۔ ہر قبیلے کا خیال اور خواہش یہ تھی کہ وہ آنے والے سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ قباء سے 15 دن کے بعد آپ ﷺ نکلتے ہیں اور اونٹنی کی مہار چھوڑ دیتے ہیں۔ راستے میں مختلف قبیلوں کے لوگ اونٹنی کو روکنا چاہتے ہیں، تاکہ رسول اللہ ﷺ ان کے ہاں قیام کریں۔ لیکن فرماتے ہیں: ''اس کی مہار چھوڑ دو۔''[1] یہ جہاں اپنے آپ بیٹھے گی، وہی میرے قیام کی جگہ ہوگی۔

ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان کے سامنے اونٹنی بیٹھ گئی۔ وہیں آپ ﷺ نے مسجدِ نبوی تعمیر کی۔ گویا اونٹنی آج تک وہاں ہی بیٹھی ہے۔

اگر آپ ﷺ یہ طریقہ اختیار نہ کرتے تو دعوت قبائلی عصبیت کا شکار ہو کر ابتدائی مرحلے ہی میں ختم ہو جاتی۔ گروہی جنگ سے بچنے کے لیے آپ ﷺ نے یہ طریقہ استعمال کیا۔

مدینے میں جا کر دعوت کا رنگ بدل گیا، یہاں طاقت اور قوت ملی۔ اجتماعی نظم اور حکومت قائم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے دعوت میں برکت عطا کی۔ دس سال کے عرصے میں ایک انقلاب برپا ہو گیا: ﴿ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ ﴾ کا سماں بندھ گیا۔

اجتماعی نظم اور دعوت کے اثرات میں خاص تعلق ہے۔ غور کیجیے کہ مکے کی انفرادی دعوت تیرہ سال جاری رہی اور اسّی کے قریب مخلص حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ جب کہ مدینے میں قیامِ حکومت و سلطنت کے بعد ایک لاکھ سے بھی زیادہ کلمہ گو دس سال کے عرصے میں اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔[2]



---

[1] سنن سعید بن منصور (۲/۳۴۳)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (21 فروری 1969ء)، (13 اپریل 1979ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقامِ صحابہ رضی اللہ عنہم

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿29﴾﴾ [الفتح: ۲۹]

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت مہربان ہیں، آپ انھیں رکوع و سجود کرتے دیکھیں گے، وہ اللہ کا فضل اور (اس کی) رضا مندی تلاش کرتے ہیں، ان کی خصوصی پہچان ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے، ان کی یہ صفت تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی صفت اس کھیتی کے مانند ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ (پودا) موٹا ہو گیا، پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا، کسانوں کو خوش کرتا ہے، (اللہ نے یہ اس لیے کیا) تاکہ ان (صحابۂ کرام) کی وجہ سے کفار کو خوب غصہ دلائے، اللہ نے ان لوگوں سے جو اُن میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، مغفرت اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔''

عظمتِ صحابہ:

اس آیت میں نبیِ کریم ﷺ کی شان اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی منقبت کو جامع اور عمدہ پیرائے میں ذکر کر کے، ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک بہترین خراجِ تحسین ہے، جو خود خداوند تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں پیش فرمایا۔

اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت عیاں ہوتی ہے۔ جہاں تک رسالتِ مآب ﷺ کی عزت و توقیر کا

تعلق ہے، وہ تو خیر کبھی متنازع فیہ نہیں رہی، البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک گروہ ضرور برے اور گھٹیا الفاظ سے یاد کر کے ''ثوابِ دارین'' حاصل کرتا ہے۔

ماہِ محرم میں شیعہ دوستوں کی طرف سے بعض دفعہ اہلِ سنت کو ناگوار قسم کی گفتگو سننا پڑتی ہے۔ اگر یہ اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح پر اکتفا کریں تو ہمیں خوشی ہے۔ مبالغہ ہو جائے تو بھی قابلِ برداشت ہے، لیکن وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق بدگمانی پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی عیب چینی ان کے ہاں عبادت قرار دی گئی ہے۔ جو تنقید یہ کرتے ہیں، وہ یا تو سراسر غلط اور بے سروپا ہوتی ہے اور اگر اس میں کچھ واقعیت ہو بھی تو طرزِ بیان اتنا غیر منصفانہ ہوتا ہے کہ اسے کذب و افتراء سے زیادہ کچھ اہمیت حاصل نہیں۔

اپنا ایمان تو یہ ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم خدا کے نیک بندے، پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے مکرم اور خوش نصیب ساتھی تھے۔ ہمارے دل میں اہلِ بیتِ نبوی کا وہی احترام ہے جس کے وہ لائق ہیں۔ یہ کوئی شیعہ پر احسان نہیں، بلکہ ہمارا تو مذہب ہی یہ ہے اور ہم اس کے لیے مجبور ہیں۔ وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہم اس کا انتقام علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے نہیں لے سکتے، کیوں کہ یہ دونوں بزرگ نہایت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمارا جی نہیں چاہتا کہ ان میں سے کسی کو بھی برا کہیں۔

حفاظتِ دین اور صحابہ کرام:

شیعہ بے شک خدا، رسول اور حشر و نشر پر ایمان رکھنے کے لحاظ سے اہلِ سنت کے ساتھ متفق ہیں اور دونوں کا کلمہ ایک ہے، لیکن صحابہ کے معاملے کو بھی غیر اساسی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ان کبار صحابہ رضی اللہ عنہم تک کی دیانت کو مشکوک بنا دیا جائے تو دین کی کیا نوعیت باقی رہ جاتی ہے؟ یہی تو ہیں جنھیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی کوششوں سے آیندہ امت کے لیے بطور نمونہ تیار کیا تھا۔

اگر دینِ اسلام کو ''پنج تن پاک'' میں محدود سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوششیں اکارت گئیں۔ وہ صحابہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت کا ثمرہ تھے، مطلب کے نہ نکلے۔ لیکن نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سب وفادار ساتھیوں کی رشد و ہدایت پر اعتماد تھا۔ فرمایا:

((أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ فَبِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ))[1]

''میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ستاروں کی مانند ہیں، جن کی اقتداء بھی کرو گے، راہ پاؤ گے۔''

یہ حضرات قرآن کی تفسیر، سنت کی تشریح، دین کا خلاصہ اور اسلام کی چلتی پھرتی تعبیر تھے۔ کسی نے ساری زندگی خدمتِ اقدس میں گزار دی، کسی نے نسبتاً کم۔ اپنی اپنی صلاحیت اور مزاج کے اعتبار سے کوئی زیادہ متاثر ہوا، کوئی تھوڑا، لیکن فیضِ رسالت سے محروم کوئی نہیں رہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقامِ نبوی سے قریب تر تھے۔ فرمایا کرتے تھے: ''وَافَقْتُ رَبِّي فِي ثَلَاثٍ'' ''میں نے تین مسائل میں خدا سے موافقت کی۔''[2] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پوری امت میں سب سے بڑھ کر درجہ دیا گیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قانونی ماں، محرمِ رازِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، صاحبِ جبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المومنین تھیں، علم و اِفتاء میں انھیں ایک امتیازی مقام حاصل تھا، لوگ دقیق فقہی مسائل ان سے جا کر پوچھا کرتے اور آپ پردے کی اوٹ میں بیٹھ کر ان کا شافی اور محققانہ جواب دیا کرتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور آپ کی مخفی زندگی کو، جس طرح انھوں نے واضح فرمایا ہے، وہ انھیں کا حصہ ہے۔ تعلیم نسواں آپ کی رہینِ منت ہے۔

کچھ صحابہ علم کا خزانہ تھے۔ انھوں نے علمِ دین کے حصول اور تبلیغِ دین میں دن رات ایک کیا۔ مختلف شہروں میں سلسلہ ہائے درس جاری کیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو چار دانگِ عالم میں پھیلانے کا سبب بنے۔ کیا یہ سب کافر و منافق تھے؟ اگر یہ منافق تھے تو پھر مسلمان کون ہے؟

صحابہ پر طعن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن ہے:

یہ صحابہ تئیس برس تک جلوت اور خلوت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں یہ تمیز نہ کر سکے کہ مومن کون ہے اور منافق کون؟!

آپ کے پاس ذرا سی دیر کے لیے گاہک آتا ہے تو آپ اپنی فراست سے فوراً پہچان لیتے

[1] اس کی سند سخت ضعیف ہے، بلکہ بعض علماء نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٥٨) البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہمارے لیے نمونہ قرار دیا ہے، دیکھیں: سورة البقره (١٣، ١٣٧)

[2] مسند أحمد (١٣١/١)

ہیں کہ اس کے ساتھ کیسی گفتگو اور کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔ کوئی شخص دس روز آپ کے پاس رہے تو آپ اس کے متعلق ایک یقینی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ خود اتنے عقل مند اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ خیالات کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (العیاذ باللہ) اتنے انجان تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مردم شناسی کا ملکہ بھی نہ تھا۔ تیئس سال پڑھایا اور شاگردوں کو نہ جانچ سکے!

یہ صحابہ پر اعتراض نہیں رہتا، خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی اس کی زد میں آجاتی ہے، بلکہ صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ خدا پر اعتراض ہے، جس کی نگاہِ انتخاب ہی غلط ہوگئی۔ اس نے ایسا پیغمبر مبعوث کیا جسے اتنی دیر تک اپنے اور بیگانے یا اچھے اور برے آدمی کی شناخت ہی نہ ہوسکی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیوی الیکشن لڑ کر پیغمبری کا عہدہ حاصل نہیں کیا تھا کہ جس میں اکثر اوقات نااہل امیدوار بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ خدا کا انتخاب تھے، جس میں غلطی کا امکان نہیں ہوسکتا۔ مسجدِ ضرار کا قصہ آپ کو معلوم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے پسِ منظر سے آگاہی فرما دی گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ عبداللہ بن سبا کو تاڑ گئے، جو بباطن یہودی اور بظاہر ان کا حامی تھا، لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تادمِ وصال اپنے جاںنثاروں کے متعلق شبہ بھی نہ ہوسکا!

صحابہ کا ایمان:

یہ لوگ ترنگ میں آکر ہمیں اس مسئلے میں بحث کرنے کو کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان ثابت کرو۔ یعنی ہم بحث کریں، کن کے بارے میں؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں؟ اُف توبہ! یہ دن دیکھنا بھی نصیب ہونا تھا۔

کسی کی جان گئی، آپ کی ادا ٹھہری

اتنی عظیم گستاخی! ہم کون ہوتے ہیں، یہ بحث کرنے والے اور آپ کون ہیں پوچھنے والے؟
بخدا سائل اور مسئول، دونوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں۔
یہ بات خوش آیند ہے کہ ''شیعہ سنی اتحاد'' کے لیے اکثر جدوجہد ہوتی رہتی ہے۔ یہ بہت ہی قابلِ تعریف بات ہے، لیکن صلح کے لیے کوئی ''بنیاد'' ہونی چاہیے۔

ہمارا مطالبہ:

ہمارا ہمیشہ سے صرف ایک ہی مطالبہ رہا ہے، وہ یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو برا نہ کہیے، اور جو مرضی کرتے رہیے۔ پیٹنا چاہتے ہیں تو پیٹیے! ہمیں کیا تکلیف ہے؟ لیکن کم از کم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو برا نہ کہیے۔ انھوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ وہ ہمارے بزرگ اسلاف ہیں، ان پر تبرا کسنا ترک کر دیجیے۔ جن اہلِ بیت کی حمایت میں انھوں نے یہ وتیرہ اختیار کر رکھا ہے، وہ خود عام صحابہ کے ساتھ شیر و شکر تھے، وہ اس عناد میں ہرگز مبتلا نہ تھے، جس میں یہ گرفتار ہیں۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (7 جون 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صلح و جنگ

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④ ﴾

[الصف: ۱۔۴]

”اللہ کی تسبیح کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے، اور وہ بڑا زبردست، خوب حکمت والا ہے۔ اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں؟ اللہ کے ہاں بڑی ناراضی ہے کہ تم وہ بات کہو جو تم کرتے نہیں۔ بے شک اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں صفیں باندھے لڑتے ہیں، گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں۔“

مفسدین کی شرارتوں کا جواب دینا ضروری ہے:

برادرانِ کرام! آج ہم جس مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں، ہر زندہ قوم ایسے مقاصد کے لیے اپنے اجتماعات منعقد کیا کرتی ہے۔ اس کائنات کی آبادی کا دار و مدار صلح و آشتی پر ہے۔ انبیاء علیہم السلام یہی پیغام لے کر دنیا میں مبعوث ہوئے۔ امتِ مسلمہ کا مشن بھی یہی ہے کہ وہ تمام کام صلح و آشتی سے انجام دے۔ لیکن غلط کار لوگوں کی روش نے صلح پسندوں کی راہ ہمیشہ ان پر تنگ کر دی۔ جو قومیں معاملات کو اس انداز سے نہیں سوچتیں، وہ ناکام رہتی ہیں۔

سرورِ عالم ﷺ نے تیرہ سال تک صلح و آشتی سے دعوتِ دین لوگوں تک پہنچائی، لیکن اہلِ مکہ کی شرارتوں نے آپ ﷺ کی راہ میں ہر طرح کے روڑے اٹکائے۔ آپ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا۔ لیکن اہلِ مکہ نے یہود سے ساز باز کر کے اتنی دور بھی آپ ﷺ کی زندگی کا سکون مکدر کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور مدینے میں بھی اطمینان سے دعوت و اصلاح کا فریضہ

انجام نہ دینے دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو لڑائی کی اجازت دی۔ آپ ﷺ نے اپنا پروگرام بدل دیا اور جنگ کو بھی اسلام کی دعوت پہنچانے کا ایک ذریعہ بنایا۔ آپ ﷺ نے دس سال کے عرصے میں کئی جنگیں لڑیں۔

جنگ کی ضرورت:

ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ کے غزوات کی تعداد 82 ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بات الم نشرح ہوجاتی ہے کہ جس نے صرف صلح و آشتی کو اپنایا، دشمنوں نے اُسے چین نہ لینے دیا۔ مسیحیوں کو دیکھیے کہ اُن کی تعلیم کتنی مرنجاں مرنج ہے، لیکن کیا دنیا نے اُنھیں اس اصول پر کاربند رہنے دیا؟ صلح کتنی ہی عزیز چیز کیوں نہ ہو، قومی زندگی میں بعض ایسے مواقع بھی آجاتے ہیں کہ جنگ کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((جُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي))[1] ''میرا رزق میرے نیزے کا مرہونِ منت ہے۔''

یہ بات تمام دنیا جانتی ہے کہ پیغمبرِ خدا ﷺ نے کن حالات میں جنگیں لڑیں۔ آپ ﷺ کے پاس ساز و سامان کی مقدار کیا تھی اور دشمنوں کے پاس کیا۔ جنگِ بدر کو دیکھیے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان فوج اور ساز و سامان کے نقطۂ نگاہ سے کون سی نسبت قائم کی جا سکتی ہے۔ جنگوں کے محرک کفار ہی ہوئے۔ جنگِ حنین کے موقعے پر نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ تھے:

إِنَّ الْبُغَاةَ قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا فَثَبِّتِ الْأَقْدَامَ إِنْ لَاقَيْنَا

''بارِ الٰہ! سرکش ہم پر چڑھ دوڑے ہیں، اگر ہماری مڈبھیڑ ہو تو ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔''

مومن کی تیاری اور اعتماد:

ایک مومن کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق سامان پوری طرح فراہم کر لے اور اَسباب کے ساتھ آگے بڑھے، آسمانی طاقتیں اس کے ہمرکاب ہوں گی۔ اُحد اور حنین میں جن میں سے ایک کے نتائج آخر میں اور دوسرے کے شروع میں خوشگوار نہ تھے، مومنین نے وہاں بھی ثبات و استقامت کو نہ چھوڑا۔ کسی لڑائی میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کے آخر میں صفِ ماتم بچھ گئی ہو۔ جنگِ اُحد میں ستر فدا کاروں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ پھر بھی ماتم کی کوئی اپیل نہیں کی گئی، بلکہ انھی قدموں پر مستقبل کا پروگرام سوچنا شروع کر دیا گیا۔

---

[1] مسند أحمد، رقم الحديث (٥١١٤) اس کی سند میں عبدالرحمان بن ثوبان متکلم فیہ ہے۔

عرب کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ مسیحی، مشرک، یہود؛ سبھی مسلمانوں کے خلاف تھے اور اسلام کی دعوت کو پنپتا ہوا دیکھ نہ سکتے تھے۔ اہلِ حق کا ہمیشہ یہی حال ہوا ہے۔ اگر آپ بھی اصول پرستی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو جنگ کو اپنے دائرۂ کار میں داخل کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ جو قومیں زیادہ دولت مند ہوتی ہیں، وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے انسانوں کو خرید کر اپنا فوجی نظام مستحکم کر لیتی ہیں۔ انگریز کا نظام آپ کے سامنے ہے، لیکن جو قومیں زیادہ مالدار نہ ہوں اور اُن کے ملک کے حدود وسیع و عریض ہوں، اُن کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ بحیثیت مجموعی عسکری پوزیشن اختیار کریں۔

اسلام کا مزاج:

اسلام غالب بن کر رہنے کے لیے آیا ہے، مغلوب بن کر رہنے کے لیے نہیں۔ اسلام کا مزاج ہے کہ مسلمان ایک صحیح امارت کے تحت ہوں اور پوری قلمرو میں ایک قیادت کے تحت سارا نظام چلے۔ ایمان اور اسلام کے حدود پوری طرح رائج ہوں۔ جان، مال، عزت، آبرو ہر چیز کی ضمانت ہو۔ ذلت صرف کفر کے لیے مقدر ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی اس بات کی شاہد ہے۔ آپ ﷺ کے انتقال کے بعد اموی نظامِ حکومت کو دیکھیے۔ اس کی بعض چیزوں سے آپ کو اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن جہاں تک سرحدوں کی حفاظت، اسلام و عرب کی آبرو کا تعلق ہے، وہ پوری دنیا کے سامنے سرخرو ہیں۔ تبلیغ کے فرائض انھوں نے کما حقہ انجام دیے۔ فتوحات کے سلسلے میں اُن کی سلطنت روم تک پہنچی۔

اسلام اپنی روح کے لحاظ سے صلح پسند ہے، لیکن وہ دشمن کے سامنے جھکنے کے لیے نہیں آیا۔ ہندوستان پر 92ھ میں محمد بن قاسم نے پہلا حملہ کیا۔ یہ اموی حکومت کے عروج کا زمانہ تھا۔ محمد بن قاسم کو حملے کا حکم کیوں ہوا؟ جن عرب تاجروں کے اہل و عیال سیلون سے واپس جارہے تھے، اُن کے ساتھ ہندوؤں کا سلوک ایسا تھا جو شرافت کے سراسر خلاف تھا۔

ملک دشمن عناصر کی کارروائیاں:

1947ء کے حوادث آج تک تازہ ہیں۔ وہ مظالم بھلائے نہیں جاسکتے جو ہندو حکومت نے اُس وقت نہتے مسلمانوں پر ڈھائے۔ ہماری آبرو کا کیا حشر ہوا۔ نقل مکانی اور دوسرے مصائب جو مسلمانوں پر ڈھائے گئے، ان کا تقاضا تھا کہ اُسی وقت اس کا نوٹس لیا جاتا۔ لیکن پاکستان نے اسے گوارا کیا اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

اٹھارہ سال میں دشمن نے کیا کچھ کیا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ بالآخر پاکستان پر حملہ آور ہو کر رہا اور اپنے اُن ناپاک عزائم کو پورا کرنے کی کوشش کی، جو 1947ء ہی میں اُس نے تیار کر لیے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ پاکستان کی مختصر سی حکومت ختم ہو جائے گی۔ یہ حملہ حقیقت میں ہندوستان کی ہمت سے بعید تھا۔ یہاں کچھ دوسرے ہاتھ ہیں جو درپردہ پاکستان کے خلاف کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی حکومت نے جہاں ہمارے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں، وہاں اس نے اپنے ملک کو بھی جہنم میں جھونک دیا ہے۔

اس آزمایش کے موقع پر ہمارے عوام نے جس وفاداری کا ثبوت دیا ہے، وہ محض خدا کا فضل ہے۔ ہماری افواج نے جو کردار پیش کیا ہے، وہ مسلمان فوج کے شایانِ شان ہے اور بلاشبہہ آج ہمارے سر اپنے انہی بھائیوں کی وجہ سے اونچے ہیں۔ اہلِ یورپ کی قیادت دیانت کو کھو چکی ہے۔ ان کے سامنے نہ خدا ہے نہ اصول، اور نہ کوئی بین الاقوامی قانون۔

ہماری مشکلات کا حل:

تعجب کا مقام ہے کہ روس اور امریکہ جو مختلف نظریات کے حامل ہیں، آج ہمیں جمع ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ ہندوستانی حکومت نے اہلِ کشمیر کے ساتھ جو مواعید کیے تھے، ان کو کس طرح پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ ان کی اس عیاری کو بددیانتی نہ کہا جائے تو اور کون سا نام دیا جائے؟ ہم جن حالات سے دوچار ہیں، ان کا صرف ایک ہی حل ہے کہ ہماری پوری قوم عسکری حیثیت اختیار کر لے۔

حکومت کو چاہیے وہ بھارتی درندوں کے مظالم کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی لائحہ عمل تجویز کرے، جو اُنھوں نے سیالکوٹ، لاہور اور مقبوضہ کشمیر کے دیہات پر ڈھائے ہیں۔ یہ بات اَشد ضروری ہے کہ قوم کو دفاع کے لیے پوری طرح لیس کیا جائے۔ خصوصاً سرحدی علاقوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنا دفاع خود کر سکیں۔

اتفاق و اتحاد کی نعمت:

ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ اس نے پوری قوم کو متحد اور یک جان کر دیا ہے۔ یہ اتفاق محض فضلِ خداوندی ہے۔ کسی انسان کے بس میں نہیں۔ خود نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ﴾ [الأنفال: ٦٣]

''اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے۔''

ہم نے اس نعمت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مساجد میں مسلمانوں کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں کی گئیں۔ چندے کی اگر اپیل ہوئی تو بڑوں کو چھوڑ بچوں تک نے دفاعی فنڈ میں حصہ لیا۔ اس آزمایش سے قبل ملک مختلف جماعتوں میں بٹا ہوا تھا، لیکن دفاع کے سلسلے میں اب کوئی اپوزیشن نہیں۔ پوری قوم ملک کی وفادار تھی، ہے اور رہے گی۔ اس کا سب سے بڑا داعیہ اسلام ہے۔

اس موقعے پر دولتِ سعودیہ، شام، مشرقِ وسطیٰ اور دوسرے ممالک نے جو ہماری ہم نوائی کی ہے، وہ صرف اسلام کی بدولت ہے۔ پاکستان اسلامی ملک ہے اور یہ محض خدا کا احسان ہے۔ ہمارا فرضِ اوّلین ہے کہ یہ احساس بیدار رکھیں۔ اس فرض کی بجا آوری میں حکومت اور عوام دونوں یکساں ذمے دار ہیں۔ ہمیں جلد از جلد اس ملک کو پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگنا چاہیے۔

اسلامی حدود و تعلیمات کی پابندی:

یہ بات افسوس سے کہنی پڑتی ہے کہ اس موقعے پر بھی بعض پروگرام ایسے مرتب کیے جا رہے ہیں جو اسلام اور اس کی روح کے سراسر منافی ہیں اور اُن سے کسی قسم کا میل نہیں کھاتے۔ مسلم قوم جو ''لا إلٰه إلا الله محمد رسول الله'' کا ورد کرتی ہوئی میدانِ جنگ میں کودی ہے، اُسے غلط اور ناجائز محرکات سے آشنا نہ کیا جائے۔ جہاد جیسے مقدس فریضے کے ساتھ ثقافتی شو کے پیوند ہرگز نہیں لگنے چاہئیں۔ حکومت کو وہی انداز اور شان قائم رکھنی چاہیے جو مسلمان حکومت کے لائق ہوتی ہے۔ اگر ہم نے اسلامی حدود کی پابندی اور اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنے عمل کو درست کیا تو ان شاء اللہ قلت و کثرت کا سوال ہم پر اثر انداز نہیں ہو گا۔ یہ عقیدہ حکومت، عوام، امیر اور غریب سبھی کا ہونا چاہیے۔ یہ وطن ہمارا ہے۔ اسلام کے لیے ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت فرضِ عین ہے۔ أَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ أَجْمَعِينَ.[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (3 دسمبر 1965ء)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

میلاد کی شرعی حیثیت

﴿ وَاِذۡ قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ قَالُوۡا ہٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۝ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ وَہُوَ یُدۡعٰۤی اِلَی الۡاِسۡلَامِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۝ یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۝ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ۝ ﴾ [الصف: ٦۔ ٩]

''اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہو گا، پھر جب وہ (رسول) ان کے پاس کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ بولے: یہ تو کھلا جادو ہے۔ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے، حالاں کہ اسے اسلام کی طرف بلایا جاتا ہے؟ اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور (دینِ اسلام) اپنے مونہوں سے بجھا دیں، جبکہ اللہ اپنا نور پورا کرنے والا ہے اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں۔ وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے، اگرچہ مشرک ناپسند ہی کریں۔''

نبی مکرم ﷺ کا انتظار:

ان آیات میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو آنے والے رسول کی بشارت دی اور ان کا اسمِ گرامی

بھی بتا دیا۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل اس وقت سے لے کر برابر آپ ﷺ کے انتظار میں تھے، چنانچہ انھوں نے یحییٰ علیہ السلام سے بھی دریافت کیا: آیا تو وہ نبی ہے؟ تو انھوں نے انکار کر دیا۔[1] دوسری طرف قبائلِ عرب اپنی باہمی آویزش کی بنا پر شدید منتظر تھے کہ آخری رسول ﷺ کی رفاقت میں ہم اپنے حریفوں پر غالب آ کر سیاسی اور ملکی اقتدار حاصل کر لیں۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نومولود بچوں کا نام اس امید پر محمد رکھتے کہ شاید یہی وہ موعود پیغمبر ہو جائے، چنانچہ آپ ﷺ کی بشارت اور ولادت کے درمیانی زمانے میں سات اشخاص محمد نامی ہو چکے ہیں۔[2] احمد اور محمد دونوں ناموں سے کتبِ سابقہ میں آپ ﷺ کا تذکرہ ملتا ہے۔[3]

بشارتِ عیسیٰ کی تصدیق:

جب سیدِ دو عالم ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور دعوائے نبوت و رسالت کیا تو ایک موقعے پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

((أَنَا مُحَمَّدٌ، وَأَنَا أَحْمَدُ، وَأَنَا الْعَاقِبُ، وَأَنَا دُعَاءُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ، وَبَشَارَةُ عِيسٰى))[4]

''میں ہی محمد ہوں، میں ہی احمد ہوں اور میں ہی سب سے آخر میں آنے والا نبی ہوں۔ میں ہی اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مظہر ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔''

اس شہرہ و انتظار کے باوجود تاریخِ ولادت میں اختلاف پتا دیتا ہے کہ اس قسم کے موالید اور ایام اسلام کے مزاج سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے۔

تاریخِ ولادت میں اختلاف:

آپ ﷺ کی تاریخِ ولادت میں کئی اقوال ملتے ہیں۔ ایک جگہ ربیع الاول کی دو تاریخ مذکور

---

[1] دیکھیں: انجیل یوحنا (باب: 1، فقرہ: 21)

[2] دیکھیں: عمدة القاري (٩٦/١٦) اس میں سات سے زائد نام بھی مذکور ہیں۔

[3] جیسا کہ سورۃ الصّف [٦] اور سورت اعراف [١٥٧] میں اس کی صراحت ہے۔ نیز دیکھیں: انجیل یوحنا (باب 16، فقرہ: 17,16)

[4] مسند أحمد، رقم الحديث (١٦٧٣٤، ١٧١٥٠)

ہے۔ آٹھ کی بھی صراحت ہے۔ دس، بارہ، تیرہ اور ستائیس کا بھی ذکر آیا ہے۔[1] ان سب تاریخوں میں آٹھ ربیع الاول زیادہ راجح ہے۔

روایات متعلقہ ولادت کا غلط ہونا:

آج کل ہمارے واعظین رسولِ کریم ﷺ کی افضلیت ونجابت کے ثبوت کی خاطر جہاں اور بہت سی بے سروپا کہانیاں بیان کرتے ہیں، یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ حضور ﷺ کی والدہ محترمہ حضرت آمنہ نے اپنے بطنِ اطہر سے ولادت کے موقعے پر غیر معتاد مناظر دیکھے، اور ایسی بہت سی غیر معمولی باتیں واقعۂ ولادت کے ساتھ چسپاں کرتے ہیں۔ ایسی باتوں کی سند پر بحث کرنا فنِ حدیث کا وظیفہ ہے۔ عقلی طور پر اگر سوچا جائے تو مطلع صاف ہوجاتا ہے اور کوئی شک باقی نہیں رہتا، کیونکہ اگر واقعی ایسے غیر معمولی مناظر رونما ہوئے تھے، جیسا کہ یہ وعظ پیشہ حضرات بیان کرتے ہیں، تو تاریخِ ولادت میں اتنا اختلاف کیوں رونما ہوتا؟

آپ ﷺ کی سیرت و تاریخ لکھنے والوں نے جہاں آپ ﷺ کی پوری زندگی قلم بند کر دی، اگر ولادت کے موقعے پر کوئی غیر معمولی حادثہ ظہور پذیر ہوتا تو جہاں دوسرے واقعات، مثلاً: ہجرت، غزوات، فتوحات کی تاریخیں بلا اختلاف منضبط ہیں، یہ تاریخ بھی بلا کسی اختلاف کے مذکور ہوتی!!

آنحضرت ﷺ کن معنوں میں نور ہیں؟

جس معنی میں قرآن کو اللہ تعالیٰ نے نور کہا ہے:

﴿ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ ﴾ [التغابن:۸]

''اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا۔''

اس معنی میں ہم پیغمبر علیہ السلام کے نور کے قائل ہیں۔ اگر قرآنِ کریم کے نور سے زمین و آسمان روشن نہیں ہوتے اور نہ قرآن کا نور شمس و قمر کے نور سے مشابہ ہے کہ اس قرآن کی موجودگی میں سورج اور چاند کی کوئی ضرورت نہ رہے تو اسی طرح رسول کریم ﷺ کا نور غیر جسمانی اور معنوی ہے، جس پر کبھی ظلمات غلبہ نہیں کرسکتیں۔

[1] دیکھیں: السيرة النبوية لابن كثير (١/١٩٩)

نورِ نبوت کا تعلق زمین و آسمان سے نہیں، جسم اور بدن سے نہیں، اس کا تعلق قلب سے ہے، دماغ اور عقل سے ہے، اخلاقِ فاضلہ اور صفاتِ حسنہ سے ہے۔ ایسا نور جو دنیا اور عقبیٰ دونوں جگہ روشنی کرے، ایسا نور جو کفر وشرک، بدعت و جہالت، تقلید و رسوم پرستی کے اندھیروں سے نکال کر شریعتِ بیضاء، ملتِ غراء، صراطِ مستقیم اور توحید وسنت کی شاہراہوں تک پہنچا دے۔

یہ سورج کا نور، یہ چاند کی روشنی تو بڑھتی اور گھٹتی ہے، پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہے، موجود بھی ہوتو اس سے دنیا کا صرف ایک ہی حصہ روشن ہوتا ہے اور دوسرا ظلمت کدہ ہی رہتا ہے، لیکن آنحضرت ﷺ کی روشنی سے ایک عالم روشن ہے اور وہ بھی اس طرح کہ وہاں رات بھی دن کی طرح تابندہ ہے، اس لیے آپ ﷺ کے نور کو سورج اور چاند کے نور سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

مخالفینِ سنت سے ایک سوال:

جب روز مرہ کے معاملات میں کہیں احادیثِ نبویہ میں اختلاف نظر آئے تو ہمارے اہلِ قرآن بجائے اس کے کہ اس میں کوئی درمیانی صورت نکال کر احادیث میں تطبیق وتوفیق کی راہ اختیار کریں، سرے سے حدیث ہی کا انکار کر دیتے ہیں کہ حدیث کوئی شے نہیں، کیونکہ اس میں اختلاف ہے۔ اب اگر یہی اصول تاریخِ ولادت کی مختلف روایات پر چسپاں کیا جائے تو کیا ہمارے دوست فرمائیں گے کہ واقعۂ ولادت ہی غلط ہے؟ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ!

اگر کوئی صاحبِ بصیرت مجسٹریٹ کسی واقعے کی مختلف شہادتوں کو سن کر اصل واقعے کے انکار کا فیصلہ نہیں دے سکتا، اگر کسی شہر کی آبادی میں مردم شماری کی رپورٹیں مختلف ہوں تو نفسِ آبادی کے انکار کی کوئی گنجایش نہیں نکلتی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مسئلے میں مختلف روایات دیکھ کر ہم نفسِ حدیث کا حقیقتاً ہی انکار کر بیٹھیں؟

بہرحال روایاتِ ولادت کا اختلاف مخالف دوستوں اور ہمارے نعت خواں اصحاب کے لیے غور طلب حقیقت ہے۔

میلاد کا شرعی مقام:

شریعت کو کسی بڑے سے بڑے انسان کی موت وحیات سے اس طرح کی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ عبادت اور ثواب سمجھ کر اس کی سالگرہ منائی جائے اور عید میلاد منعقد کی جائے، یا نوحہ و ماتم کر کے

اظہارِ غم کیا جائے۔ آخر اتنے انبیاء واصفیاء عالمِ شہود میں آئے اور بے شمار نہایت بے دردی سے شہید کر دیے گئے۔ اب اگر ہم ایک ایک کی عید میلاد منائیں یا ایک ایک کا ماتم کریں تو دن میں کئی بار تو میلاد کی محفلیں سجانا پڑیں اور کئی بار غم واندوہ کا اہتمام کرنا پڑے۔

عہدِ نبوی اور عصرِ صحابہ:

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت کا تئیس سال کا زمانہ اور خلافت کا تیس سال کا عرصہ ایک نگاہ سے دیکھ جائیں، کہیں بھی آپ کو ایسی کوئی تقریب نظر نہیں آئے گی، نہ خود شارع علیہ السلام نے اپنی سالگرہ منائی اور نہ اپنے اکابر واجداد کی کوئی عید میلاد منعقد کی اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی نے ایسا کوئی کام کیا، سوائے دو عیدوں کے وہاں کوئی تیسری عید نظر نہیں آتی۔ عید میلاد کا اہتمام تو کجا ان میں سے کسی کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ بھی کوئی ثواب کا کام ہے، حالانکہ ہم محبتِ نبوی ﷺ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گردِ راہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

آغاز:

عید میلاد کو سب سے پہلے سلطان ابوسعید علی بن سبکتگین نے چھٹی صدی ہجری میں شروع کیا۔ بعد میں جب مصر پر سنیوں کا غلبہ ہوا تو یہ رسم ختم ہوئی۔ پھر سلطان مظفر نے چھٹی صدی ہجری کے آخر میں اس کو شروع کیا۔ سلطان مذکور بہت سادہ لوح اور جذباتی آدمی تھا۔ میلاد کی تقریب منانے کے لیے ماہِ صفر میں تیاری شروع کر دیتا۔ ہر قسم کے قوال، گانے بجانے والے اور غزل خواں واعظ اکٹھے ہو جاتے اور بے شمار قسم کے کھانے پکائے جاتے، پھر رفتہ رفتہ یہی فتنہ طول پکڑتا ہوا عید بن گیا۔ بعد ازاں جب زناکاری اور بدمعاشی جیسے نتائجِ بد سامنے آئے تو سلطان کو یہ تقریب بند کر دینی پڑی۔

ہندوستان میں ورود:

ہندوستان میں جہاں اور بہت سی بدعتیں فتوحاتِ اسلامیہ کے بعد آئیں، محفلِ میلاد بھی اپنے تمام لوازم کے ساتھ سارے ملک میں چھا گئی۔ جاہل ملاؤں اور خودغرض سیدوں نے اس کی نزاکتِ شان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بدعت کو خوب ہوا دی۔ قرآنی آیات کی تحریف اور ترمیم کر کے احادیث

کے عمومات کو غلط موقعے پر محمول کرتے ہوئے اس کے جواز کی کوشش کی گئی۔ محبتِ رسول ﷺ کا نام لے کر جذبات کو اس قدر اچھالا گیا کہ یہ رسم ایک میلہ اور تماشا بن کر رہ گئی۔

محبت کا معیار:

محبت کا معیار نعرہ بازی نہیں اور نہ عشق کا تقاضا ریا کاری اور دکھلاوا ہے۔ محبت زمانی اور مکانی نہیں ہوتی۔ الفت دائمی تعلق کا نام ہے، جو عاشق کے دل پر اور اس کی زندگی پر ہمیشہ کے لیے غالب رہے۔ محبتِ رسول ﷺ کا نعرہ لگانا آسان ہے، لیکن محبّ بننا مشکل۔ اگر محبّ بننا ہو تو صحابہ کرام، مہاجرینِ عظام، انصارِ مدینہ، شہدائے احد، مجاہدینِ بدر رضی اللہ عنہم اور خصوصاً مکی زندگی میں اسلام قبول کرنے والے فرشتہ سیرت لوگوں کی شیفتگی اور والہانہ عقیدت اور سراپائے جاں نثاری سے سبق لینا ہوگا۔ محبت موسمی چیز نہیں کہ ربیع الاول میں تو سیلاب بن کر آئے اور باقی سارا سال آپ کو احساس تک نہ ہو کہ آپ کا کوئی رسول بھی ہے!!

محبتِ رسول ﷺ کی آڑ میں لیڈروں کی سیاسی چالیں:

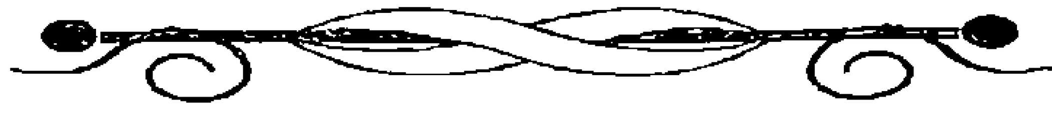
جن لوگوں کو نماز روزے سے کوئی واسطہ نہیں، اور یہی نہیں بلکہ سارے اسلام سے بھی دور کا تعلق نہیں، مگر اس کے باوجود جاہل عوام سے ووٹ کے خواہش مند ہیں، تاکہ سیاسی اقتدار حاصل کریں، ایسے حضرات اپنے اسلام کی نمائش کے لیے کبھی عید میلاد کا ڈھونگ رچا دیتے ہیں، کبھی معراج کا نام لے کر کوئی ہنگامہ اور شور برپا کیا جاتا ہے، حالانکہ ان مراسم کی حیثیت اسلام میں ریا کاری اور تماشے سے زیادہ نہیں۔ اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے دین کو کھیل اور تماشا بنانے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے اقدامات سے ان کا مطلب تو پورا ہو جاتا ہے، مگر اسلام کو ان جلوسوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

کرنے کا انجام:

کاش یہی مال اور روپیا، جو ان فضول اور غیر ضروری کاموں پر خرچ ہو رہا ہے، غرباء و مساکین پر خرچ ہوتا، یا اس روپے سے سیرت کی کتابیں خرید کر مفت تقسیم کی جاتیں، تاکہ عوام کا ذہن درست ہو اور ان میں اسوۂ رسول ﷺ کی اشاعت ہو، یا اشاعتِ کتاب و سنت کے دوسرے کاموں پر اس کو خرچ کیا جاتا تو بلاشبہ یہ ایک عظیم کام ہوتا۔

قوم کی حالت:

رہ گئی وہ قوم جو اپنے مقصدِ حیات کو فراموش کر بیٹھی ہے، جو ساٹھ ہزار مساجد کو ویران چھوڑ کر یہاں اس لیے آئی ہے تاکہ میلاد کا جلوس نکال کر سیاسی اقتدار حاصل کرے تو ایسی قوم کا خدا ہی حافظ ہے، اور پھر جس قوم کے لیڈر رسول اللہ ﷺ کا نام لے کر اپنی لیڈری چمکائیں اور جو زبان پر رسول اللہ ﷺ کا نام بار بار لائیں، مگر جب ووٹ کا وقت آئے تو قوم اور اس کے لیڈروں کی ہمدردیاں حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ ہوں، بلکہ یزید کے ساتھ ہوں تو ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دعا ہی کی جا سکتی ہے!![1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (6 جنوری 1950ء) تلخیص: مولانا رحمانی قصوری۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رسول اللہ ﷺ کے تین منصب:

تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیمِ کتاب وحکمت

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾

[الجمعة: ٢]

''وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں ایک رسول بھیجا انہی میں سے، وہ اس کی آیات ان پر تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بلاشبہ اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔''

سنہ ہجری:

خدا تعالیٰ کے سبھی دن اچھے اور بابرکت ہیں۔ کچھ ساعتیں خاص طور پر اپنے دامن میں غم یا خوشی کی یاد لیے ہوتی ہیں۔ ربیع الاول سے نہایت مقدس یاد وابستہ ہے، اس ماہ میں ہمارے حضرت محمد ﷺ دنیا میں تشریف لائے تھے، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب فارسی سنہ کی جگہ اسلامی سنہ جاری کرنے کی بابت سوچا تو حضور ﷺ کی ولادت، نبوت یا وفات کے بجائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے پر ہجرتِ نبوی سے اس کا آغاز کیا گیا۔[1] جو مشکلات اور گوناگوں مصائب کی یادگار ہے۔

ہجرت کا درس:

لفظِ ''ہجرت'' سے وہ پورا خاکہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے جب مہاجرین نے بے سروسامانی کے عالم میں خویش واقارب اور دیگر دنیوی لذائذ کو اسلام کی خاطر چھوڑ کر وطن کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس میں ہمارے لیے بہت بڑا درس موجود ہے۔ حضور ﷺ کی تشریف آوری موجبِ خیر و برکت اور

[1] البداية والنهاية (٣/٢٠٦، ٢٠٧) ط: الفكر.

آپ ﷺ کی وفات باعثِ صد افسوس، لیکن سبق آموزی اور عبرت پذیری کے لحاظ سے ترجیح واقعۂ ہجرت ہی کو حاصل ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اصابتِ رائے قابلِ داد ہے۔ آپ بہت بڑے صاحبِ فراست اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک انسان تھے۔ مقاصدِ اسلام پر آپ کی نگاہ دور رس تھی۔ نبی کریم ﷺ نے صحیح فرمایا تھا:

«لَوْ كَانَ نَبِيٌّ بَعْدِي لَكَانَ عُمَرَ»[1]

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر (رضی اللہ عنہ) ہوتے۔''

اُمّی اور عالم:

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾: خدا تعالیٰ نے ایسے مقام پر حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا، جہاں کا سارا ماحول ہی اُمی اور ناخواندہ تھا۔ آپ ﷺ خود بھی امیت سے موصوف تھے: ﴿اَلنَّبِىَّ الْاُمِّىَّ﴾ [الأعراف: ١٥٧]

حضور اکرم ﷺ کی اُمیت کا مطلب مطلقاً بے علم ہونا نہیں، بلکہ رسمی علم سے بے تعلقی ہے، یعنی پیغمبرِ خدا ﷺ یونانیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے مروجہ علوم سے بے نیاز تھے۔ وہ علم جس پر ان قوموں کو ناز تھا:

﴿فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ﴾ [المؤمن: ٨٣]

''تو وہ اس (جھوٹے) علم پر اِتراتے رہے جو اُن کے پاس تھا۔''

یہ قابلِ ذکر چیز نہ تھی، وہ اس لائق ہی نہ تھا کہ حضور ﷺ کے لیے ضروری سمجھا جاتا، ورنہ آپ تو رسول تھے اور رسول بے علم نہیں ہوتے۔

قرآن:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾: پڑھنے والا عالم ہوتا ہے، آپ ﷺ کیا پڑھتے تھے؟ حضور ﷺ کا منبعِ علم، آیاتِ الٰہیہ تھیں جو علم کا نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔ اس میں فلسفیانہ تشکیکات اور انسان کے علم ناقص و ناتمام کی بھول بھلیاں نہیں۔

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨٦)

اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب راستی، پختگی اور یقینِ محکم کی حامل ہے۔ یہ 114 سورتوں پر مشتمل ہے، جن میں ہر ضروری مضمون پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں توحید اور عمائدِ اسلام کے علاوہ زہد وتقویٰ کی باتیں ہیں۔ راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔ جہاد کا ذکر ہے۔ فتح کی صورت میں مالِ غنیمت کی تقسیم کا تذکرہ ہے اور پھر مغلوب ہونے والے گرفتار شدگان کا مسئلہ ہے۔ ان کی فوری رہائی اپنے لیے دوبارہ خطرہ مول لینے کے مرادف ہوتی ہے اور زندان میں ڈال دینا انسانیت کی توہین ہے۔ یہ جیلیں مجرموں کی اصلاح کے لیے نہیں، یہ برائی اور بدمعاشی کا مدرسہ ہیں، یہاں شاذ ہی کسی کو توبہ نصیب ہوتی ہوگی۔

حُسن ... جزوِ نبوت نہیں:

نبی کریم ﷺ بڑی خوبیوں کے مالک اور ہر پہلو سے باکمال تھے۔ آپ ﷺ نے سچ مچ بادشاہی میں فقیری کی ہے۔ دولت کے انبار پر بیٹھ کر بھی آپ ﷺ فقیر رہے۔ آپ ﷺ بھوکے کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے۔ باہر سے مال آتا تو کسی غریب کی حاجت پوری کر کے انتہائی طور پر خوش ہوتے۔ وفورِ مسرت سے آپ ﷺ کا چہرہ چمک کر گلنار ہو جاتا: ”كَأَنَّ وَجْهَهُ مُذْهَبٌ“[1]

یہ خداوند تعالیٰ کی خصوصی تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا۔ ہمارے علماء بھی قرآن پڑھتے ہیں، لیکن یہ رتبۂ بلند کوئی نہ پا سکا۔ ملال تو ان کا ہے جو قرآن کی آیتوں سے مشرکانہ عقائد کی اِشاعت کرتے ہیں۔ علم رکھتے ہوئے شرکیہ وعظ ”ابلیسیت“ ہے۔ شاید انھوں نے توحید کی آیتوں پر کبھی غور نہیں کیا اور ان کی نگاہ حضور ﷺ کی زلفوں ہی میں اٹک کر رہ گئی ہے۔

یہ کیسی محبت ہے کہ آپ ﷺ کے مشن کی توڑ کر مخالفت کی جائے اور ظاہری حسن پر بے محابا مرا جائے۔ حضور ﷺ کی زلفیں سیاہ نہ بھی ہوتیں اور چاند کو شرما دینے والا حُسن نہ بھی ہوتا تو بھی آپ ﷺ نبی ہی تھے۔ حج کے موقعے پر آپ ﷺ نے سر کے سب بال اتروا دیے تو کیا آپ ﷺ کی نبوت میں فرق آ گیا تھا؟ حضرت شعیب علیہ السلام نابینا تھے۔ بیماری نے حضرت ایوب علیہ السلام کا سارا رنگ بدل دیا تھا اور حضرت ذوالنون علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں رہنے سے گل کر رہ گئے، کیا یہ سب اس کے باوجود نبی نہیں تھے؟

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٥)

مامون الرشید کے دربار میں عبدالعزیز کنانی رحمہ اللہ کا مناظرہ بشر مریسی سے ہوا۔ بشر کہنے لگا: "حَسْبُہٗ قُبْحُ وَجْھِہٖ" "یعنی عبدالعزیز کے جھوٹا ہونے کی یہی دلیل کافی ہے کہ یہ بدصورت ہے۔" عبدالعزیز رحمہ اللہ نے محل کی دیواروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مامون سے کہا: "یہ پلستر کیوں اکھڑا ہوا ہے؟ یہ اینٹ کیوں ٹیڑھی لگی ہے؟" مامون نے کہا: یہ غلطی ہمارے معمار کی ہے، لیکن تمھارا ان غیر متعلق سوالات سے کیا مطلب؟ عبدالعزیز نے جواب دیا: میرا چہرہ بھی خدا کا بنایا ہوا ہے، اس میں میرا کیا قصور؟[1]

حسن تو کئی دفعہ اچھے بھلے آدمی کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن نے قید خانے کی سیر کرائی اور علم نے چھڑایا۔ حسن اکثر بداخلاقی کی طرف بھی مائل کر دیتا ہے۔ صاحبِ جمال عموماً اپنی عزت اور صحت کھو بیٹھتے ہیں۔ نبی پاک ﷺ بے شک دنیا کے خوب صورت ترین انسان تھے، لیکن آپ ﷺ کی خوب صورتی نبوت کا جزو نہیں تھی۔

قرآن مجید میں آپ ﷺ کا تعارف کہیں بھی اس قسم کے الفاظ سے نہیں کرایا گیا کہ آپ ﷺ کی زلفیں ایسی تھیں، چہرے کی رنگت اور ساخت ایسی تھی، قد و قامت اور چال ڈھال اس طرح سے تھی۔ قرآنِ مجید نے آپ ﷺ کے اخلاق، آپ ﷺ کی تعلیم اور تزکیہ کا بیان فرمایا ہے، جو نبوت کا لازمہ ہیں۔

اخلاق:

فرمایا ﴿ وَيُزَكِّيْهِمْ ﴾: جب تک کوئی خود پاکیزہ نفس نہ ہو، دوسرے کو اچھے رنگ میں نہیں رنگ سکتا۔ حضور ﷺ کی طہارت و پاکیزگی ایک مسلمہ چیز ہے۔ نبی کریم ﷺ کو ہم ہر مجلس میں محتاط اور سنبھلا ہوا پاتے ہیں۔ آپ ﷺ کی خلوت و جلوت دونوں بے داغ ہیں۔

آپ ﷺ کا تقویٰ وقتی اور مصلحت کے تحت نہیں ہوتا تھا۔ یہ وہ خوبی ہے جسے دیکھ کر غیروں کو بھی سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ "ولیم میور" جیسا دشمنِ اسلام، حضور ﷺ کی زبردست اخلاقی قوت کے آگے قلم توڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اسی تقدس اور ظاہر و باطن کی صفائی کی وجہ سے حضور ﷺ کی صحبت کا اثر حیرت انگیز تھا۔ اسی پاک صحبت نے ابن ابی قحافہ کو "ابوبکر صدیق" اور ابن الخطاب کو "فاروقِ اعظم" بنا دیا۔

[1] الحيدة والاعتذار للكناني (ص: ٢٧۔٣١)

تعلیم:

﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾: نبی اُمی کی تیسری صفت بیان فرمائی کہ آپ ﷺ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس سے امیت کا مطلب اور بھی واضح ہو گیا، حضور ﷺ کا علم تمام علوم سے بلند و بالا تھا۔

یہ تو ہوئیں حضور ﷺ کی وہ صفات جنھیں اللہ تعالیٰ نے قابلِ ذکر اور ہمارے لیے لائقِ تقلید سمجھا، لیکن ہماری رونق پسند طبیعت راگ رنگ کی محفلوں کی طرف زیادہ مائل ہے۔

دو نقائص:

ربیع الاول بارہ مہینوں میں سے ایک مہینا ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کی پیدائش کا مہینا ہے اور محرم میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی تھی، ان کے نقشِ قدم پر چل کر زندگی گزار دی جائے تو عقیدت ٹھیک ہے اور اگر فرماں برداری نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہو تو خواہ کیسا ہی عظیم الشان میلاد یا ماتم کا جلوس نکالا جائے، ڈھونگ ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ کی نبوت اور حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے سراسر دشمنی ہے۔

''نبوت'' تا قیامت جاری رہے گی، اس کے تقاضوں کو پورا کیجیے! حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے شہادت کا درجہ پا کر خدا کو راضی کیا، لیکن یہ پیٹنے والے بتایئے کیا کر رہے ہیں؟

حضور ﷺ نورِ مجسم تھے:

میلاد کی ان محفلوں میں نبی کریم ﷺ کے منصب، تعلیم، اخلاق اور تزکیہ کے بجائے زیادہ تر آپ کے نور ہونے ہی پر گوہر افشانی فرمائی جاتی ہے۔ آپ ﷺ واقعی نورِ مجسم تھے، لیکن وہ بلب نہیں جو بٹن دبا کر روشن کیا اور بجھایا جا سکتا ہے۔ حضور ﷺ کا نور سورج اور چاند سے بھی زیادہ فوقیت رکھتا ہے کہ یہ روزانہ ڈوب جاتے ہیں اور حضور ﷺ کا نور لازوال ہے۔ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ.[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (9 اگست 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صرف علم نہیں، عمل بھی!

﴿وَّاٰخَرِیۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ ؕ وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۝۳ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ۝۴ مَثَلُ الَّذِیۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىةَ ثُمَّ لَمۡ یَحۡمِلُوۡهَا کَمَثَلِ الۡحِمَارِ یَحۡمِلُ اَسۡفَارًا ؕ﴾ [الجمعة: ٣ـ٥]

''اور (اسے) ان میں سے دوسرے لوگوں کے لیے بھی (بھیجا) جو ابھی تک ان کے ساتھ نہیں ملے، اور وہ (اللہ) زبردست خوب حکمت والا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے یہ (فضل) دیتا ہے اور اللہ عظیم فضل والا ہے۔ ان لوگوں کی مثال، جنھیں حاملِ تورات بنایا گیا، پھر انھوں نے اسے نہیں اُٹھایا، اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اُٹھاتا ہے۔''

صحابہ کی عدالت پر قرآن کی گواہی:

گذشتہ جمعے میں نبی ﷺ کی عظیم المرتبت شخصیت اور ماحول پر آپ ﷺ کے تعلیمی اثرات کے بارے میں کچھ عرض کیا گیا تھا۔ لفظ ﴿یُزَکِّیۡهِمۡ﴾ پر دوبارہ غور کیجیے! اس سے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان عیاں ہوتی ہے۔ اہلِ شیعہ جو اسلام کو پنج تن پاک، مقداد بن اسود اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم وغیرہما میں محدود کر کے بقیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کھل کر یا گول مول انداز میں ارتداد کا فتویٰ لگا دیتے ہیں [1] بڑی بھول میں ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہہ دیا جائے کہ (نعوذ باللہ) حضور ﷺ تبلیغ میں ناکام ہو گئے تھے، بلکہ خدا سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے ایسا پیغمبر چنا جو تزکیے کے لائق نہ تھا اور اس نے جن کو اپنے ساتھ ملا کر کتاب و سنت کا امین بنایا، وہ بیگانے اور بددیانت نکلے۔

بات سوچ کر منہ سے نکالنی چاہیے۔ بسا اوقات معمولی عصبیت کی بنا پر کہی ہوئی بات بہت دور جا پہنچتی ہے۔ خوارج اور روافض کی مبالغہ آرائیوں سے ہٹ کر ائمۂ سنت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے

[1] روضة الكافي للكليني (ص: ٤٣١)

متعلق "كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ"[1] "وہ سب ہی عادل ہیں۔" اور ساتھ ہی ان کے غیر معصوم ہونے کا جو معتدل فیصلہ کیا ہے، صحیح سوجھ بوجھ کا نتیجہ ہے اور قرآن اس کا شاہد ہے: ﴿ وَيُزَكِّيهِمْ ﴾.

مسئلۂ ختمِ نبوت:

﴿ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾: حضور ﷺ کی نبوت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک یا مکے اور مدینے کی وادیوں تک محدود نہیں۔ آپ ﷺ کی تعلیم کو کسی ملک، وطن، قوم یا زمانے کے ساتھ مختص نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک زمین اور آسمان برقرار ہیں، آپ ہر فردِ بشر کے لیے نبی ہیں:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ ﴾ [سبأ: ٢٨]

"اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بھیجا ہے۔"

اسی سے مسئلہ ختمِ نبوت بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ جب آپ ﷺ کی نبوت اور تعلیم قیامت تک سب کے لیے ہے تو دوسرے نبی کا یہاں کیا کام؟

﴿ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴾ [الجمعة: ٤]

عمل کے بغیر علم:

﴿ مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ۚ ﴾:
صرف علم کافی نہیں ہوتا، جب تک اس کے ثمرات اور فوائد مترتب نہ ہوں، اور وہ ہے: "اس کے مطابق عمل کرنا۔" مقصد حاصل نہ ہو تو محنت بے سود ہے۔ عمل کے بغیر علم کوئی چیز نہیں۔ بجلی کی رَو نہ ہو تو وائرنگ بے کار ہے۔ عمدہ چارپائی بُن کر تالے میں رکھ دی جائے تو کیا فائدہ؟ عالی شان مسجد بنا کر مقفل کر دی جائے تو ثواب کے بجائے گناہ ہی ہوگا۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو خالی تعلیم ہی نہیں دی، بلکہ ان کے سامنے عملی سپرٹ کا مظاہرہ بھی فرمایا ہے۔ صحابہ صرف باتیں کرنا ہی نہیں سیکھتے تھے، بلکہ وہ ایک باعمل جماعت بن گئی تھی، جس کا دل اور زبان ایک تھی اور جس کا قول و عمل یکساں تھا۔

[1] الإصابة في تمييز الصحابة (١/١٦٢)

جو لیڈر قوم کو صرف نظریہ دے کر بس ہو جاتے ہیں، کبھی کسی اچھے انقلاب کے بانی نہیں ہوتے۔ مقامِ رسالت کے متعلق، ایک پڑھے لکھے آدمی کے لیے اس بات میں بڑے سوالوں کا جواب موجود ہے۔ عبادات ہوں یا معاملات، غرض کہ ہر مسئلے کا تشفی بخش جواب ہمیں حضور ﷺ کی عملی زندگی میں مل جاتا ہے۔

حوادثِ زمانہ بھی ہماری زندگی کا ایک حصہ ہیں:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ﴾ [البقرة: ١٥٥]

''اور ہم تمھیں کسی قدر خوف اور بھوک سے مالوں، جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے ضرور آزمائیں گے۔''

نبیوں، ولیوں اور ہم جیسے سیاہ کاروں کو گردشِ ایام سے پالا پڑتا ہے، کبھی خوشی آتی ہے اور کبھی غمی۔ اگر آپ چاہیں تو ان میں اپنے باعمل پیغمبر ﷺ کا اسوۂ حسنہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

غم اور خوشی میں حضور ﷺ کا اُسوہ:

غزوۂ اُحد میں درہ پر بٹھائے ہوئے پچاس تیر اندازوں کی غفلت سے کتنی زبردست ناکامی ہوئی! شہید ہونے والوں میں حضور ﷺ کے پیارے اور بہادر چچا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے جن کا مثلہ کر کے چہرہ مسخ کر دیا اور کلیجہ نکال کر چبا گئی اور پھر اسے تھوک دیا۔[1] آپ ﷺ نے کوئی واویلا نہیں کیا۔ تعزیتی جلوس نکالا اور نہ ماتمی لباس پہنا۔ باوجودیکہ چچا کی یاد دل سے محو نہیں ہوئی تھی۔ ہندہ جب حلقہ بگوش اسلام ہونے کو پیش ہوئی تو آپ ﷺ کوئی انتقامی کارروائی عمل میں نہ لائے۔

فتح مکہ معمولی خوشی نہ تھی۔ یہ عرصہ ہائے دراز کی صبر آزما کوششوں کا ثمرہ تھا۔ تیئس سالہ مسافر اپنے نصب العین میں کامیاب ہو کر گھر لوٹ رہا تھا، لیکن وہ مقدس انسان کہ بڑی سے بڑی مصیبت پڑنے پر کبھی جس سے غیر فطری حرکات سرزد نہیں ہوئی تھیں، آج خوشی میں بھی آپے سے باہر نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی نعرے نہیں لگے تھے، کوئی جلوس نہیں بنایا گیا تھا اور نہ قوالی کی محفلیں ہی جمی تھیں۔

---

[1] البداية والنهاية (٤٦/٤) کلیجہ چبانے والی روایت سنداً صحیح نہیں ہے۔

ان سے بدلہ بھی نہیں لیا۔ ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ﴾ [یوسف: ۹۲] ''آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔'' کہہ کر ان کی خطائیں معاف کر دیں، بلکہ اپنے ہی مکانات جو ناحق تصرفِ غیر میں جا چکے تھے، ان کا فیصلہ بھی نہیں مانگا۔ اشارتاً حضور ﷺ کی مرضی پوچھی بھی گئی: ''أَيْنَ تَنْزِلُ غَداً؟'' ''کل کہاں قیام فرمائیں گے؟'' آپ ﷺ نے ((هَلْ تَرَكَ لَنَا عَقِيْلٌ مِنْ مَّنْزِلٍ؟)) ''کیا عقیل بن ابی طالب نے ہمارے لیے کوئی مکان رہنے بھی دیا ہے؟'' کہہ کر انھیں مطمئن کر دیا۔ [1]

گناہ میں تعاون:

مجھے اہلِ سنت پر حیرت ہوتی ہے جو ماتم کے قائل نہیں، لیکن محرم میں عزا دار شیعہ کو شربت گھول گھول کر پلاتے ہیں کہ لو پیو اور جی بھر کر پیٹو۔ اس بار شیعہ نے کمال کر دیا۔ اپنے کو پیٹتے پیٹتے ان بے چاروں کو بھی پیٹ ڈالا۔ جس کام کو آپ جائز نہیں سمجھتے اس میں تعاون کس لیے؟!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت ہے تو اس طرح (محبت) کیجیے جیسے ان کے استاد محمد ﷺ نے سکھائی ہے۔ غمی اور خوشی کے اظہار کے لیے باعمل نبی کریم ﷺ اور باعمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت کو دیکھنا چاہیے۔ [2]



[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۰۱۰)

[2] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (16 اگست 1963ء) مرتب: حافظ محمد قاسم خواجہ صاحب۔

ماہِ محرم کی شرعی حیثیت اور ذوالحجہ سے مناسبت

ذوالحج اور محرم الحرام اپنے مابین ایک لطیف مماثلت و مشاکلت رکھتے ہیں۔ جب ان مہینوں میں رونما ہونے والے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ مہینے دو عظیم المرتبت پیغمبروں کی فتحِ مبین اور کامیابی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ مہینے غم و ناکامی کے نہیں، بلکہ خوشی و فائز المرامی کے ہیں۔

اسوۂ ابراہیمی:

ماہِ ذوالحج حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ آپ نے کس طرح اپنے والد کو دل نشیں انداز میں تبلیغ فرمائی۔ بتوں کی پرستش اور شیطان کی عبادت سے روکا، لیکن باپ نے نصیحت قبول کرنے کے بجائے سنگسار کرنے کی دھمکی دی۔ پھر آپ نے دعوت کو عام کیا اور پوری قوم کو مخاطب بنا کر یہی تبلیغ انھیں بھی کی، اللہ کے دین کے لیے وطن کو خیر آباد کہا۔ حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت لوط علیہم السلام کو مختلف مراکز پر مامور کیا کہ وہ دین کی اشاعت اور توحید کی تبلیغ کو عام کرسکیں۔ بادشاہِ وقت نمرود سے مکالمہ کیا، جو مبہوت و لاجواب ہوگیا۔ بڑھاپے کے عالم میں امنگوں، آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد عطا ہونے والے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے باپ بیٹے دونوں کی فرماں برداری کا اعلان فرمایا، نیز مناسکِ حج بھی اسی ماہ سے متعلق ہیں۔

اسوۂ موسوی:

محرم الحرام کا مہینا اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس ماہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ فرعون سے مکالمہ، مختلف آزمائشوں کو برداشت کرنا، آپ کا بنی اسرائیل کو مصر سے نکالنا اور معجزانہ طور پر دس محرم کو سمندر پار کرنا اور فرعون کا غرق ہونا، یہ تمام واقعات اسی سے متعلق ہیں۔

روزے:

رسول اللہ ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ کو معلوم ہوا کہ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یادگار کے طور پر دس محرم کا روزہ رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا: « نَحْنُ أَحَقُّ بِمُوسَىٰ مِنْكُمْ »[1] نیز آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آیندہ سال بشرطِ زندگی میں 9/محرم کا روزہ رکھوں گا۔ چنانچہ آپ ﷺ کے زمانۂ مبارک تک 9،10/ ذوالحج (عرفہ وعید الاضحیٰ) اور 9،10/محرم کی حیثیت دو اولوالعزم پیغمبروں کی یادگار اور خوشی کے دن کے طور پر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قرآنِ مجید میں یہ ارشاد ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾
[المائدۃ: ۳]

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔''

دینِ کامل:

نبی کریم ﷺ پر دین کی تکمیل تو ہو چکی، اب کسی کو بھی حک و اضافہ، ترمیم و تنسیخ کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس لیے جو نیا کام دین میں داخل ہوگا، وہ بدعت کی فہرست میں شمار ہوگا۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ حادثات پیش آتے ہیں، عہدِ ماضی میں بھی ہوئے اور آیندہ بھی ہوں گے، ان میں صحیح غلط سبھی قسم کے شامل ہیں۔ اللہ کے بندے شہید بھی ہوئے ہیں اور ہوں گے، لیکن ماضی و حال و مستقبل کسی کی بنا پر ہم دین میں کسی نئے مسئلے کو داخل نہیں کر سکتے، ایسا کرنا غلط ہے۔

عقل مندی کا تقاضا:

ذرا غور فرمائیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کن حالات میں ہوئی، لیکن ان حوادث کو دین کا حصہ قرار نہیں دیا گیا۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٣٠)

کربلا کے واقعات اور پھر اس تنازع کو آگے تک طول دینا مناسب نہیں، بلکہ ان حوادث سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ذرا غور فرمایئے کہ یہاں نہ تو مدعی ہے اور نہ مدعا علیہ، نہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں اور نہ حضرت ابوبکر، نہ حضرت حسن اور نہ حضرت معاویہ، نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں اور نہ یزید۔ عقل و دانش کا بھی تقاضا یہی ہے کہ ان کے جھگڑے کو وجۂ نزاع نہ بنایا جائے، بلکہ ان واقعات سے کچھ سبق حاصل کیا جائے۔

اسلامی تعلیمات:

اسلام حوادث کے بارے میں صبر کی تلقین کرتا ہے، وہ جزع و فزع، سینہ کوبی، بال نوچنا اور بَین کرنے سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشاد مبارک میں ایسا کرنے والے کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں۔[1] تعزیہ نکالنا ناجائز ہے۔ اس میں شریک ہو کر اس کی رونق کا باعث بننا گناہ ہے۔ ایسے افراد کی حوصلہ افزائی بھی گناہ سے کم نہیں، سبیل لگانا بھی درست نہیں۔ تعزیے پر چڑھاوے چڑھانا حرام ہے، اس لیے کہ غیر اللہ کے نام صدقہ دینا حرام ہے۔

اللہ کے بندے کو گالیاں دینا غلط ہے۔ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے سامنے ایک آدمی نے یزید کو گالی دی تو انھوں نے فرمایا کہ یزید سے واقعی بڑی غلطی ہوئی ہے، لیکن بہتان طرازی درست نہیں ہے۔ ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ﴾ [البقرة: ١٣٤] ''یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ اسی کے لیے ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے ہے جو تم نے کمایا۔''

اہلِ توحید کا فرض:

ہمارے ہاں یہ رسمِ بد چل پڑی ہے کہ محرم میں شادیوں کو بند کر دیا جاتا ہے، جو لوگ اپنے آپ کو اہلِ سنت کہلاتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ اس خیالِ فاسد کو ذہنوں سے کھرچنے کی کوشش کریں، نیز یہ خیال کہ اس ماہ میں کی ہوئی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں، اس کی تردید کی جائے۔

اہلِ توحید کو چاہیے کہ وہ عملاً اس غلط رسم کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کریں اور محرم میں شادیاں رچانے کا عزم کریں۔ اسلام نے ماتم کا ایک سلجھا ہوا انداز مقرر فرمایا ہے، جو تمام مومنین

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣)

کے بارے میں امت نے اختیار کیا ہے، لیکن حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بارے میں ماتم کا جو طرز اختیار کیا جا رہا ہے، وہ غلط ہے اور اسے ختم ہونا چاہیے۔

جس طرح ہم دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادتوں کے بارے میں صبر و ضبط سے کام لیتے ہیں، اسی طرزِ عمل کا مظاہرہ آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔[1]



[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (19 فروری 1971ء)

یادداشت





UMM UL QURA PUBLICATIONS
Sialkot Road, Lodhi Town Gujranwala
0092 321 6466422